لکھنؤ کی شاعری

تصنیف

ادیب اعظم مولانا سید محمد باقر شمس

ناشر

نور ہدایت فاؤنڈیشن

حسینیہ حضرت غفران مآبؒ، مولانا کلب حسین روڈ، چوک،

لکھنؤ-۲۲۶۰۰۳(یو۔پی)۔انڈیا

Noor-e-Hidayat Foundation

Imambara Ghufranmaab, Maulana Kalbe Husain Road,

Chowk, Lucknow-3 INDIA

Website: www.noorehidayatfoundation.org

www.naqeeblucknow.com

E-mail: noorehidayat@gmail.com, noorehidayat@yahoo.com

Ph:0522-2252230Mob :08736009814,09335996808

لکھنؤ کی شاعری

اُس کا اسلوب اُس کے اصناف اور منتخب کلام

محمد باقر شمس

مقدمہ

ڈاکٹر احسن فاروقی

سلسلہ دارالتصنیف رجسٹرڈ کی گیارھویں کتاب

لکھنؤ کی شاعری

اس کا اسلوب، اس کے اصناف اور منتخب کلام

محمد باقر شمس

مقدمہ

ڈاکٹر احسن فاروقی

مطبوعہ

باب الاسلام پریس

ملنے کا پتہ

دارالتصنیف ۳۰-سی رضویہ کالونی کراچی ۱۸

ہمارے مطبوعات

ہمارا ادارہ صرف مولانا محمد باقر شمس کی تصنیفیں شائع کرتا ہے اور اس وقت تک جتنی کتابیں شائع ہوئیں سب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں۔

ناظرین ہماری کتابوں کی فہرست طلب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر کتاب میں دوسری کتابوں کی فہرست ہونا چاہیے مگر یہاں اسٹاک میں کتابیں ہی نہیں ہوتیں تو فہرست سے فائدہ کیا اس وقت ہمارے پاس صرف دو کتابیں موجود ہیں۔

(۱) شعور شاعری

اس میں مشہور شعراء کے کلام کی فنی غلطیاں بتا کے ان کی اصلاح کی گئی ہے۔

قیمت چھ روپے

(۲) لکھنؤ کی تہذیب

اس میں لکھنؤ کی تہذیب کی ایک ایک چیز کو تفصیل سے بیان کیا ہے جو لکھنؤ کی تہذیب کا دلکش مرقع ہے اس پر تبصرہ میں جناب رئیس امروہوی نے لکھا ہے کہ میں نے ابتک ایسی کتاب نہیں دیکھی۔ قیمت بارہ روپے۔

ملنے کا پتہ

دارالتصنیف ۳۰-سی رضویہ سوسائٹی کراچی ۱۸

انتساب

ذوق سلیم کا مظہر شرافت انسانی کا جوہر تہذیب شائستگی کا پیکر

ادب نواز۔ ادیب ساز انشاپرداز

پروفیسر مسعود حسن ادیب

کے نام

ذرہ ناچیز
شمس

مقدمہ

لکھنؤ کا مدرسہ شاعری

ڈاکٹر احسن فاروقی
ڈین آف فیکلٹی آف آرٹ بلوچستان یونیورسٹی

جناب شمس کی زیر نظر کتاب اس وقت کا ایک اہم تقاضا پورا کر رہی ہے لکھنؤ کے مدرسہ شاعری کو حالی اور شبلی نے یورپ کی رومانی تحریک کے مبہم اثر سے کافی حد تک گرایا بلکہ بات یہاں تک پہنچی کہ دہلی کی شاعری کو صحیح شاعری مانا جانے لگا اور لکھنؤ کی شاعری کو غیر شاعری یا بناوٹی کہا جانے لگا یہ میتھو آرنلڈ کی تنقید کا اثر تھا جو انیسویں صدی کے آخر تک اہم رہی مگر پہلی عالمی جنگ کے بعد سے ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری اور تنقید کو عروج ہوا اور اس کا خاص نتیجہ یہ نکلا کہ رومانی شاعری کے ذوق کو غیر پختہ ذوق کہا جانے لگا اور خاصی اہمیت کلاسیکی شاعری کو دی گئی جیسے رومانیوں نے انگلستان میں ورڈسورتھ کی شاعری کو اہمیت دی تھی اور پوپ کی شاعری کی بابت یہ رائے دی تھی کہ یہ شاعری ہی نہیں ہے۔ یہ رائے دی دیسے ہی ہمارے یہاں دہلی کے مدرسہ شاعری کو اصل شاعری مانا گیا اور لکھنؤ کی شاعری کو اصول شاعری سے الگ ہٹا ہوا کہا گیا۔ ٹی ایس۔ ایلیٹ نے پانسا پلٹ دیا اور پوپ کو سب سے زیادہ نمائندہ شاعر مانا اور تمام رومانی شاعروں کو بالکل رد کر دیا۔ معاملہ اب بھی زیر بحث ہے مگر اس کلیہ سے یہ ضرور سامنے آتا ہے کہ کلاسیکی شاعری کو بھی رومانی شاعری کے برابر اہمیت دینا چاہیئے ہمارے یہاں دہلی

اور لکھنؤ کے مدرسے سے بالکل الگ نہیں ہے کیونکہ دہلی کے مدرسہ کی خصوصیات لکھنؤ کے اہم شاعر آتش میں اور لکھنؤ کے مدرسہ کی خصوصیات دہلی کے اہم شاعر ذوق میں نظر آتی ہیں مگر رومانی شاعری کی طرفداری میں یہ حد پہنچی کہ شبلی کا موازنۂ انیس و دبیر وجود میں آیا جس سے میر انیس کے ایسے دہلوی اسکول والے شاعروں کو شاعر اور مرزا دبیر ایسے لکھنؤ کے اسکول والے شاعروں کو غیر شاعر کہنے کی رسم پڑ گئی جناب شمس کی کتاب اسی غلط رسم کے خلاف ایک جید اور عالمانہ قدم ہے۔

رومانی اور کلاسیکی شاعری کا اہم فرق یہ بتایا جاتا ہے کہ اول الذکر داخلی ہوتی ہے اور آخر الذکر خارجی رنگ کو اہمیت دیتی ہے اس معنی میں لکھنؤ کی شاعری کلاسیکی ہے اور اسکے سب سے اہم نمائندہ شیخ ناسخ ہیں۔ کلاسیکی شاعری کی تمام خصوصیات ان کے یہاں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں پھر ان کے اثر سے لکھنؤ میں ایک گروہ شاعروں کا پیدا ہوا اور ہوتا رہا انکی بابت شمس صاحب نے مفصل طور پر لکھا ہے اور ضرورت بھر اہم مثالیں دی ہیں۔ خارجیت کے ساتھ ان شاعروں میں طرز اور ترنم کی وہ خوبیاں بھی ہیں جن کو انفرادی طرز کے خلاف سماجی طرز کا لازمی حصہ قرار دیا جاتا ہے اور جن کی وجہ سے شاعری محض ذاتی چیز نہیں رہ جاتی بلکہ ایک معاشرہ کی جذباتی زندگی کی آئینہ دار ہو جاتی ہے۔ زبان اور بیان کے وہ اسالیب سامنے آتے ہیں جو فرد کی زندگی کے بجائے ایک پورے معاشرہ کی زندگی کے لئے اہم ہیں۔ یہ شاعری بھی جذباتی اور مبہم نہیں رہ جاتی بلکہ واضح بیانی اور عروضی اصولوں کی صاف صاف پابندی نظر آتی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اپنی تنقیدوں میں ٹکنیک کا لفظ خاص طور پر استعمال کرتا ہے اور

لکھنؤ کی شاعری خاص طور پر اہم ٹیکنیکی جدتوں سے معمور ہے اور ان کی کمال کے ساتھ وضاحت شمس صاحب نے زیر نظر کتاب میں کر دی ہے۔

ایک نئی بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ لکھنؤ رومانی طرز کا بھی اسکول ہے جس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بھی اہم ٹکنیکی جدتوں سے معمور ہے لہذا یہ کہنا کہ لکھنؤ کی شاعری رومانی نہیں غلط ہے اس کو انہوں نے دلیلوں اور مثالوں سے ثابت کیا ہے۔

یورپ کے ہر ملک میں جدیدیت کی تحریک کا اہم رجحان یہ ہے کہ وہ رومانی طرز کو چھوڑ کر کلاسیکی طرز کی طرف آتی ہے۔ ہمارے یہاں جدیدیت کی تحریک تو شروع ہو چکی ہے مگر ہمارے شاعروں کو یہ نہیں معلوم ہے کہ اس سلسلہ میں اپنی روایت سے تعلق کس طرح پیدا کریں اور اس لئے جدید شاعری بے بنیاد ہی رہی جا رہی ہے شمس صاحب کی زیر نظر کتاب کی جدید دور میں سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ اس اہم راہ کے نشانات واضح طور پر بتاتی ہے جن پر چل کر جدید شعراء اپنا مقصد مستحکم طریقہ پر حاصل کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ کتاب عام صاحبان ذوق کے لئے بصیرت افروز ہے اور ذوق ادب کے اسی توازن کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں اہم قدم ہے جو حالی اور شبلی نے اپنی کم علمی کی وجہ سے اور جدت کے غلط جوش میں بگاڑ دیا تھا۔ اس طرح یہ کتاب دو اہم باتوں میں تمام تنقیدوں سے زیادہ کار آمد ثابت ہوگی اول یہ کہ اس کے ذریعہ ہماری اردو روایت میں جدید ترین راہوں کا پتہ لگے گا اور شاعروں کو صحیح راہ پر چلنے کی توفیق ہوگی دوسرے یہ کہ تمام قاری کے سامنے سے طرفداری کا دھواں چھٹ کر وہ صاف

تضاد دکھائی دیگی جو جدید ترین شاعری کی اہم بنیاد ہو سکتی ہے اور جو متوازن ذوق ادب کی ضمانت ہے۔

اس میں بہت سی نئی باتیں بھی ہیں جو ابتک کسی کے علم میں نہ تھیں مثلاً اہلِ لکھنؤ کی مادری زبان لکھنؤ کی ادبی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور ٹکسالی زبان کے معنی وغیرہ۔

مولانا کی یہ بڑی خصوصیت کہ ان کے مطالب اور تخیل ترتیب دلنشیں تحریر شگفتہ زبان مستند اور معیاری ہوتی ہے وہ ایک منفرد مفکر اور صاحب طرز انشاپرداز ہیں علمی و ادبی حیثیت سے ان سے استفادہ کرنے والوں میں اپنا شمار کرکے فخر محسوس کرتا ہوں۔

احسن فاروقی

۲؍جنوری ۱۹۷۸ء

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	لکھنؤ کی شاعری پر عام تبصرہ	۱۷	۱۹	ذوالفقار خاں	۴۱
۲	غزل زندہ صنفِ سخن ہے	۱۷	۲۰	فرخ سیر	۴۱
۳	غزل کی مقبولیت کے اسباب	۱۸	۲۱	رفیع الدرجات	۴۲
۴	غزل کا اصلی موضوع	۱۹	۲۲	شاہجہاں ثانی	۴۲
۵	غزل کی تشبیہیں اور استعارے	۲۰	۲۳	محمد شاہ	۴۳
۶	غزل پر اعتراض کا جواب	۲۲	۲۴	سلطنت اودھ کا قیام	۴۳
۷	دہلی اور لکھنؤ کی شاعری پر تبصرہ	۲۳	۲۵	دہلی پر پہلا حملہ	۴۳
۸	غزل اور تصوف	۲۷	۲۶	اہلِ دہلی کا زنانہ پن	۴۴
۹	لکھنؤ کی شاعری میں سادگی	۳۰	۲۷	اہلِ دہلی کی امرد پرستی	۴۴
۱۰	لکھنؤ کی شاعری میں تصنع	۳۳	۲۸	امرد پرستی کی تاریخ	۴۶
۱۱	تصنع کی اہمیت	۳۳	۲۹	صوفیت و امرد پرستی	۴۷
۱۲	محاسنِ شعریہ	۳۴	۳۰	ترکی ذوق	۴۸
۱۳	تمدن کی تعریف	۳۸	۳۱	دہلی کے مشہور امرد پرست	۴۹
۱۴	دہلی کا تمدن	۴۰	۳۲	دہلی کے مشہور امرد	۵۰
۱۵	اردو شاعری کی ابتدا	۴۰	۳۳	ملادو پیازہ کی فرہنگ	۵۵
۱۶	اورنگ زیب	۴۰	۳۴	دہلی پر دوسرا حملہ	۵۷
۱۷	بہادر شاہ اول	۴۰	۳۵	دہلی پر تیسرا حملہ	۵۷
۱۸	جہاندار شاہ	۴۰	۳۶	محمد شاہ کا انتقال	۵۷

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۷	احمد شاہ کی تخت نشینی	۵۷	۵۷	گل زمین ایران	۷۳
۳۸	صفدر جنگ کی وزارت	۵۷	۵۸	اہل ایران کی نفاست پسندی	۷۳
۳۹	غازی الدین خاں	۵۷	۵۹	ایرانی تمدن میں گل کی اہمیت	۷۴
۴۰	عالمگیر ثانی	۵۸	۶۰	گل کے لاحقے	۷۵
۴۱	دہلی پر چوتھا حملہ	۵۸	۶۱		
۴۲	دہلی پر پانچواں حملہ	۵۹	۶۲	گل کے سابقے	۷۶
۴۳	شاہ عالم	۵۹	۶۳	گل کے اورسے	۷۶
۴۴	بکسر کی جنگ	۵۹	۶۴	رنگ اور ایران	۷۶
۴۵	نجف خان	۶۰	۶۵	اہل ایران کی ایجادیں	۷۷
۴۶	دہلی پر چھٹا حملہ	۶۱	۶۶	ایران کے تمدن میں انقلاب	۷۸
۴۷	دہلی پر ساتواں حملہ	۶۱	۶۷	ہندوستان کا قدیم تمدن	۷۸
۴۸	سندھیا	۶۳	۶۸	بابر اور ہمایوں کا مذہب	۷۸
۴۹	دہلی پر آٹھواں حملہ	۶۴	۶۹	لکھنؤ کا تمدن	۷۹
۵۰	دہلی پر نواں حملہ	۶۶	۷۰	برہان الملک	۷۹
۵۱	دہلی کی تباہی کی داستان	۶۶	۷۱	اہل ایران کی لکھنؤ کی آمد	۷۹
۵۲	غدر کے بعد کی دہلی	۶۷	۷۲	لکھنؤ میں شیعیت کی ابتدا	۷۹
۵۳	دہلی کی اخلاقی تباہی	۶۷	۷۳	صفدر جنگ	۸۰
۵۴	لکھنؤ کے تمدن کا پس منظر	۷۲	۷۴	صفدر جنگ کی شجاعت	۸۰
۵۵	ایران کا تمدن	۷۲	۷۵	صفدر جنگ کی شان و شوکت	۸۰
۵۶	ہمارا سفر ایران	۷۳	۷۶	نادر شاہ کے سپاہی صفدر جنگ کی فوج میں	۸۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۷۷	شام اودھ	۸۱	۹۷	سعادت علیخاں کا انتقال	۸۹
۷۸	صفدر جنگ کا انتقال	۸۱	۹۸	غازی الدین حیدر کی مسند نشینی	۸۹
۷۹	صفدر جنگ کی قوت برداشت	۸۱	۹۹	غازی الدین حیدر کی شاہی	۸۹
۸۰	شجاع الدولہ کی مسند نشینی	۸۱	۱۰۰	ٹائپ کے حرفوں کا چھاپہ خانہ	۸۹
۸۱	فیض آباد کی عزاداری		۱۰۱	غازی الدین حیدر کی ایجادیں	۸۹
۸۲	شیعوں کی پیری مریدی	۸۳	۱۰۲	آداب نشست و برخواست	۹۰
۸۳	شجاع الدولہ کا علم	۸۳	۱۰۳	فن سپہ گری کی ترقی	۹۰
۸۴	آصف الدولہ	۸۴	۱۰۴	غازی الدین حیدر کا انتقال	۹۰
۸۵	آصف الدولہ کی عزاداری	۸۴	۱۰۵	نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی	۹۰
۸۶	پہلے شیعہ مجتہد	۸۴	۱۰۶	نصیر الدین کی عورتوں سے دلچسپی	۹۱
۸۷	صوفیت کے خلاف غفرانمآب کی کوشش	۸۵	۱۰۷	نصیر الدین حیدر کا رفاہ عام	۹۱
۸۸	آصف الدولہ کا انتقال	۸۵	۱۰۸	نصیر الدین کا خوشبو سے شوق	۹۱
۸۹	سعادت علی خاں کی مسند نشینی	۸۵	۱۰۹	نصیر الدین حیدر اور علم نجوم	۹۱
۹۰	سعادت علی خاں کی کفایت	۸۶	۱۱۰	رسد خانہ سلطانی	۹۱
۹۱	سعادت علی خاں کی پاکیزگی ذوق	۸۶	۱۱۱	لیتھو کا چھاپہ خانہ	۹۱
۹۲	سعادت علیخاں کی انشا پردازی	۸۷	۱۱۲	چھینکنے ناک کٹنے کا تاوان	۹۱
۹۳	سعادت علیخاں کے زمانے میں ضائع	۸۸	۱۱۳	سپہ گری کی ترقی	۹۲
۹۴	سعادت علی خاں نے چلم ایجاد کیا	۸۸	۱۱۴	عام لوگوں کا ہتھیار بند ہونا	۹۲
۹۵	میر سید علی کی سوز خوانی	۸۸	۱۱۵	پہلی محرم سے نویں ربیع الاول تک تعزیہ داری	۹۲
۹۶	لکھنؤ میں نئے طرز کا شعر	۸۸	۱۱۶	میر ضمیر کی تحت لفظ مرثیہ خوانی	۹۲

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۱۷	لکھنؤ میں لباس کا شوق	۹۲	۱۳۷	اشاریت	۱۰۶
۱۱۸	لکھنؤ میں عطر کا شوق	۹۲	۱۳۸	ابہام	۱۰۶
۱۱۹	لکھنؤ میں ادب و تعظیم کا لحاظ	۹۲	۱۳۹	حیات و کائنات کے مسائل	۱۰۷
۱۲۰	اہل لکھنؤ کے خصوصیات	۹۲	۱۴۰	سادگی	۱۰۷
۱۲۱	ناسخ کی شاعرانہ حیثیت	۹۳	۱۴۱	تمثیل	۱۰۷
۱۲۲	مصحفی نے ناسخ کی تقلید کی	۹۳	۱۴۲	فلسفہ، تصوف، تغزل / ناسخ کے پیرایہ میں غالب	۱۰۸ / ۱۰۹
۱۲۳	غالب نے ناسخ کی تقلید کی	۹۳	۱۴۳	مومن کے اشعار / پرانی ناہموار روش	۱۱۰
۱۲۴	غالب کا خط ناسخ کے نام	۹۴	۱۴۴	اردو شاعری کا ابتدائی دور	۱۱۱
۱۲۵	تمام ادباء کو ناسخ کے کمال کا اعتراف	۹۵	۱۴۵	اردو شاعری کا عہد زریں	۱۱۲
۱۲۶	دہلی و لکھنؤ کا فن شاعری	۹۷	۱۴۶	میر و سودا کے مہمل لطف تذکرہ	۱۱۶
۱۲۷	زبان میں ناسخ کی انقلابی حیثیت	۹۸	۱۴۷	تذکیر و تانیث کا ستھرا پن	۱۱۷
۱۲۸	لکھنؤ کی مادری زبان	۹۸	۱۴۸	روزمرہ کے صرف کا سلیقہ	۱۱۷
۱۲۹	لکھنؤ کی دو ہمسائیوں کی گفتگو	۹۸	۱۴۹	سودا اور ضاحک کی ہجو نقائض	۱۱۸
۱۳۰	لکھنؤ کی ادبی زبان	۱۰۱	۱۵۰	مصحفی و انشا کا دور	۱۱۹
۱۳۱	لکھنؤ کی ٹکسالی زبان	۱۰۱	۱۵۱	مصحفی و انشا کے ردیف و قافیے	۱۱۹
۱۳۲	ٹکسالی زبان کے معنی	۱۰۱	۱۵۲	مصحفی و انشا کے بیہودہ اشعار	۱۱۹
۱۳۳	شاعری میں ناسخ کی انقلابی اصلاحیں	۱۰۲	۱۵۳	کلام ناسخ	۱۲۲
۱۳۴	ناسخ کے کلام کی شاعرانہ خوبیاں	۱۰۲	۱۵۴	لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا اسلوب	۱۲۵
۱۳۵	صنعتوں کا حسن استعمال	۱۰۵	۱۵۵	ذہنی شاعری	۱۲۶
۱۳۶	محذوفات سے ندرت	۱۰۶	۱۵۶	قلبی شاعری	۱۲۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۵۷	لکھنؤ کی اصلی شاعری	۱۲۶	۱۷۷	تعشق	۱۷۹
۱۵۸	ناسخ کی تحریک	۱۲۶	۱۷۸	جلال	۱۸۳
۱۵۹	لکھنؤ کی شاعری کے ادوار	۱۲۷	۱۷۹	کامل	۱۸۸
۱۶۰	لکھنؤ شاعری کا پہلا دور		۱۸۰	منیر	۱۹۳
۱۶۱	ناسخ کا کلام		۱۸۱	لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا رنگ	۱۹۷
۱۶۲	خواجہ وزیر	۱۳۱	۱۸۲	مہدی حسین ماہر	۲۰۳
۱۶۳	محمد رضا برق	۱۳۵	۱۸۳	منشی امیر احمد مینائی	۲۰۹
۱۶۴	میر علی اوسط رشک	۱۳۹	۱۸۴	لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا دور	۲۱۱
۱۶۵	امداد علی بحر	۱۴۳	۱۸۵	مولانا علی حیدر نظم طباطبائی	۲۱۱
۱۶۶	امان علی سحر	۱۴۷	۱۸۶	مرزا محمد ہادی رسوا	۲۱۳
۱۶۷	آتش اور ان کے تلامذہ	۱۴۹	۱۸۷	پیارے صاحب رشید	۲۱۷
۱۶۸	آتش	۱۴۹	۱۸۸	بندہ کاظم جاوید	۲۲۰
۱۶۹	نواب سید محمد خاں رند	۱۵۳	۱۸۹	ریاض خیرآبادی	۲۲۹
۱۷۰	میر وزیر علی صبا	۱۵۷	۱۹۰	نوبت رائے نظر	۲۳۲
۱۷۱	میر دوست علی خلیل	۱۶۲	۱۹۱	جلیل حسن جلیل	۲۳۵
۱۷۲	آغا حجو شرف	۱۶۶	۱۹۲	لکھنؤ کی شاعری کا چوتھا دور	۲۳۸
۱۷۳	دیا شنکر نسیم	۱۶۷	۱۹۳	علی نقی صفی	۲۳۸
۱۷۴	آغا حسن امانت	۱۷۱	۱۹۴	مرزا محمد ہادی عزیز	۲۴۲
۱۷۵	مظفر علی اسیر	۱۷۴	۱۹۵	مرزا ذاکر حسین ثاقب	۲۴۲
۱۷۶	لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا دور	۱۷۸	۱۹۶	حسرت موہانی	۲۵۰

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۹۷	انور حسین آرزو	۲۵۴	۲۱۰	محمد ہادی عزیز	۲۸۲
۱۹۸	آرزو وصفا کی خالص اُردو	۲۵۵	۲۱۱	نظم	۲۸۳
۱۹۹	برج نرائن چکبست	۲۵۷	۲۱۲	طلسم ہوشربا	۲۸۴
۲۰۰	لکھنؤ کی شاعری کا آخری دور	۲۵۹	۲۱۳	مزار دوست	۲۸۹
۲۰۱	مرزا جعفر علی خاں اثر	۲۵۹	۲۱۴	سیر دہرہ دون	۲۹۱
۲۰۲	کلب احمد مانی	۲۶۲	۲۱۵	صبح بنارس	۲۹۳
۲۰۳	لکھنؤ کی غزل کا ایک اور طرز (سلام)	۲۶۵	۲۱۶	لکھنؤ کی ایک برسات	۲۹۵
۲۰۴	رباعی	۲۷۰	۲۱۷	اسلامی ترانا	۲۹۵
۲۰۵	قصیدہ	۲۷۱	۲۱۸	برسات کی شام	۲۹۶
۲۰۶	قصیدہ منیر	۲۷۲	۲۱۹	فوآرہ	۲۹۹
۲۰۷	نظم طباطبائی	۲۷۳	۲۲۰	ہجو	۳۰۱
۲۰۸	مولانا مصحفی	۲۷۵	۲۲۱	البعیر	۳۰۲
۲۰۹	سکا ظم حسین محشر	۲۷۸			

معذرت

یہ کتاب جن حالات میں چھپی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں جگہ جگہ کمی اور نقائص رہ جائیں۔

مولانا علی حیدر نظم طباطبائیؒ اور نوبت رائے نظر کے اشعار بہت کم ہیں۔ ہمارے کئی دوستوں نے مہیا کرنے کا وعدہ کیا مگر وفا نہ ہوا اس کے علاوہ اغلاط کی تصحیح بھی صحیح معنوں میں نہ ہو سکی بہت باتیں کہنے کے قابل رہ گئیں اور یہ سب مجبوری سے ہوا انشاء اللہ آئندہ اڈیشن میں یہ تمام خامیاں دور ہو جائیں گی۔ فقط

والسلام

محمد باقر شمس

دیباچہ

یہ کتاب مدت سے ناتمام پڑی تھی اور میرے خیال میں چھپنے کے قابل نہ تھی کیونکہ ہر باب ناقص تھا۔ ایک دن مکرمی جناب ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب سے ذکر آیا انھوں نے کتاب دیکھنے کے لیئے لے لی دوسرے دن فرمایا کہ لکھنؤ کی شاعری پر بحث مکمل ہے باقی فروعات ہیں جن کے بغیر کتاب ناقص نہیں کہی جاسکتی اس کو چھپ جانا چاہیئے اس میں بہت سی نئی باتیں ہیں جو اب تک نہیں کہی گئیں ایک مقدمہ بھی تحریر فرمایا اور اس کی اشاعت پر اصرار کیا میں نے کتاب پریس میں بھیجدی جن شعراء کا کلام نہ مل سکا اس کی کمی مجھے شدت سے محسوس ہو رہی ہے مثلاً سید مرزا انیس شاگرد ناسخ، میر علی محمد عارف مرزا کاظم حسین محشر فرزند حسین ذاخر مجاور حسین تمنا اولاد حسین شاعر مہدی حسین ناصری حکیم اشفتہ۔ سراج منظر حکیم ناطق انند نرائن ملا ان سب کا کلام نہ مل سکا اور یہ بہت بڑی کمی ہے۔

ایک ناہمواری اس کتاب میں اور نظر آئے گی کہ شعراء میں کسی کے حالات سرے سے ہیں ہی نہیں کسی کا ذکر دو تین سطروں میں ہے اور کسی کا صفحوں میں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارا موضوع لکھنؤ کی شاعری ہے شعرائے لکھنؤ نہیں وہ معروف شعراء جن کا ذکر تذکروں میں تفصیل سے موجود ہے ان کا تعارف مختصر لفظوں میں ہے۔ جن کا حال تذکروں میں مختصر ہے یا بالکل نہیں ہے ان کے حالات جس حد تک معلوم ہوئے سب لکھدیئے۔ ناسخ و آتش کے بارے میں بہت کچھ کہنا ہے جس کی اس میں گنجائش نہیں اس کو مستقل طور سے لکھنے کے لیئے چھوڑ دیا۔

مرثیہ پر گفتگو بہت طولانی ہو گئی ہر عہد کے مرثیہ گویوں کا ذکر اور ان کے کلام سے مثالیں مستقل کتاب چاہتی ہے اس لیئے اس کو آئندہ کے لیئے اٹھا رکھا ہے اسی طرح مثنوی اور دلی پر بحث کا ذکر بھی رہ گیا۔ فقط

والسلام

ذرہ ناچیز

محمد باقر شمس

۲۸ر جنوری سنہ ۱۹۷۸ء

مقدمہ

غزل اور اس کا موضوع

ہر صنفِ سخن کی کچھ لفظی و معنوی خصوصیتیں ہیں لکھنؤ کی شاعری میں بھی ہر صنف کی خصوصیتیں الگ الگ ہیں۔

لکھنؤ کی شاعری کی عام خصوصیت

لیکن ایک عام بات جو تمام اصنافِ سخن میں مشترک ہے وہ زبان کی شستگی روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی کہیں صنائع و بدائع کہیں سادگی کہیں دونوں کا حسین امتزاج طرزِ ادا میں کہیں جدت مگر ہر صورت میں دل میں اتر جانے والی معنوی وضاحت ؎

جو سمجھ ہی میں نہ آئے وہ کہا جاتا نہیں — جاوید

اب تک جن لوگوں نے لکھنؤ کی شاعری پر لکھا ہے ان میں اکثر نے صرف غزل کو سامنے رکھا ہے۔ شاعری تمام اصناف پر حاوی ہے میں سب پر گفتگو کروں گا مگر غزل کو میں نے مقدم رکھا ہے۔

غزل زندہ صنفِ سخن ہے

کیونکہ وہ زندہ ہے اور بہت دنوں تک زندہ رہے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت مختصر اور مختصرات کا مجموعہ ہے اس میں الفاظ کا استعمال اس سلیقہ سے ہوتا ہے کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مضمون ادا ہو جاتا ہے اور ہر شعر ایک مکمل داستان بن جاتا ہے کبھی لمبے لمبے فقرے اس طرح حذف ہوتے ہیں کہ وہ سمجھے جاتے ہیں کبھی تاریخی واقعات سیاسی حالات فلسفیانہ مضامین ہمارے تجربے اور مشاہدے کے تحت الشعور میں دبے ہوئے نقوش، تمثیل و کنایہ کے پردہ پر ابھر آتے ہیں اور زمانہ کی گردش دوستوں کی بے وفائی، دنیا کی ناپائیداری

توکل، قناعت اور حیات و کائنات کے بہت سے مسائل نہایت موثر طریقہ سے ادا ہو جاتے ہیں جو ہمارے حالات کا آئینہ ہمارے نفسیات کی محاکات اور ہمارے تجربوں کا نچوڑ ہوتے ہیں۔

غزل کی مقبولیت کے اسباب

مولانا حالی کے بقول:- "محفلِ عشرت کی گرمی اور بزمِ معرفت کا ہنگامہ بھی اسی پر منحصر ہے۔"

بہت سے شعر حکیمانہ قول اور کہاوت کی طرح زبان کا جزو بن گئے ہیں جو اٹھتے بیٹھتے بے ساختہ زبان پر آجاتے ہیں ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے — مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں — ناسخ
تمام عمر یونہیں ہو گئی بسر اپنی — شبِ فراق گئی روزِ انتظار آیا — 〃
صحرا کو کبھی نہ خالی رشکِ قیس سے پایا — کیا کیا جلا ہے ساکھو بھولا جو ڈھاک میں — 〃
خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی — گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے — آتش
سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا — 〃
طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال — ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا — 〃
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا — 〃
کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے — سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے — 〃
تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی — قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے — 〃
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے — 〃
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں — تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل — رند
نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے — گھٹ کے مر جاؤ یہ مرضی مرے صیاد کی ہے — مونس
قسمت کی نارسائی سے ٹوٹی کہاں کمند — وہ چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گئے — شاد لکھنوی

کبھی ایک ہی مصرع یہ کام دے جاتا ہے ؎

اجل سر پہ کھڑی ہے خواب غفلت میں زمانہ ہے	ناسخ	کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے	نسیم
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے۔	،،	اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر	وزیر
اپنے سوا کسی کے کوئی روبرو نہیں	،،	لیکے نہ ہلتے ہیں جبتک لگ گو بات	اختر
شیر قالین اور ہے شیر نیستاں اور ہے	،،	معلوم ہو گا حشر میں پیمانہ کس کا تھا	،،
ہے اگر وہم تو علاج نہیں	،،	اور حرم کا دیا جلا دینے جاتے تھے	رند
کہیئے کیسا مزاج عالی ہے	،،	بات تھی کھولی التجا کر کے۔	،،
خدا جانے اب کیا ہوا ہے چاہتا ہے	،،	مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی۔	عشق
نہ جانے خدا کیا کیا چاہتا ہے	،،	پھر وہی کنج قفس ہے وہی صیاد کا گھر	مضطر
یہ بزم خیر ہے لاخیر کا مقام نہیں	آتش	جب بنے رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا	قلق
بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے	،،	خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے	امیر
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے	،،	ملک الموت نے گھر دیکھ لیا	جاوید
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا		تلوار کاٹتی ہے سپاہی کا نام ہے	ماہر
جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔	بادشاہ نصیر الدین حیدر	رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی	جلال
جس سے ہوتی ہے امید اسی سے گلہ ہوتا ہے	برق	دو ہرن زخمی کئے صیاد نے اک تیر سے	رشید
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں	صبا	بعد اپنے حسن و عشق کا قصہ تمام ہے	ماہر

غزل کا اصلی موضوع

غزل کی دلکشی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس کا اصل موضوع صنف نازک سے مرد کا جنسی میلان ہے اس کی صورت حسن، چال ڈھال، زیور بناؤ سنگار پر مرد کی فریفتگی اس سے ملنے کی آرزو اس سے وصل کی تمنا اس کی لذتیں۔ ہجر کی اذیتیں۔ یہ عورت سے کسی اور طرح کی محبت سے انکار کرتی ہیں۔

مرد عورت پر اسی وجہ سے فریفتہ ہے کہ وہ اس سے جنسی خواہش پوری کرنے کا مشتاق ہے حسن محض عشق کا سبب نہیں ایک حسینہ کسی کی بیٹی اور بہن بھی ہے مگر اس کا حسن و جمال اس کے باپ اور بھائی کے لئے غزل کا موضوع نہیں اس کا سبب یہی ہے کہ ان کے درمیان جنسی خواہش کا دخل نہیں مگر وہی حسینہ اپنے محبوب کے لئے قیامت ہے اور غزل میں اس کی ہر چیز اور ہر ادا کے بلائے جان ہونے کی عجیب عجیب تشبیہیں اور استعارے ہیں۔ دنیا کی جتنی چیزیں انسان کو کسی نہ کسی طرح متاثر کر سکتی ہیں وہ عورت کے کسی وصف ذاتی یا اضافی کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔

غزل کی تشبیہیں اور استعارے

زلفیں، کمند، افشاں کہکشاں، پیشانی چاند، ابرو کمان، نگاہ تیر، مژگاں نشتر، آنکھیں جادو، رخسار پھول، ہونٹ پنکھڑی، دہن غنچہ، دانت موتی، ٹھوڑی سیب، چہرہ چاند، پستان انار، انگلیاں شمع کافوری، پنڈلیاں بلوری، جسم چاندی کا، قد سرو کا، چال چکور کی۔

لباس میں :۔ دوپٹہ، محرم، نقاب، انگیا، کرتی، چولی ان سب کا رنگ جیتی انگڑائی میں ان کا مسکنا اور عاشق کی طبیعت کا کھسکنا۔

سامان آرائش میں :۔ کنگھی افشاں۔ سرمہ مسی۔ غازہ۔ مہندی۔ آرسی۔ آئینہ سب اس کے دل کو تہ و بالا کرنے کے سامان ہیں۔

زیور میں :۔ بجلیاں۔ بالیاں۔ بندے۔ طوق۔ گلوبند۔ بازوبند۔ تعویذ۔ چوڑیاں۔ پازیب خلخال اور اس کی جھنکار اس کے دل کو تڑپا دیتی ہے۔

اداؤں میں تبسم بجلی گراتا ہے انگڑائی دل کی رگیں توڑ دیتی ہے

شرم وحیا قہر ڈھاتی ہے اس کے علاوہ ؎

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اور ہر شیوہ جان لیوا

وہ پردہ نشین ہے باحیا ہے باعزت ہے چلمن کی آڑ سے کہیں نگاہ پڑ گئی بس دل ہاتھ سے جاتا رہا راز عشق چھپانا اس کو رسوائی سے بچانا اس کا نام زبان پہ نہ آنا محبت کا تقاضا ہے۔ بہت بے چینی میں اشاروں کنایوں اور رمز کر ضمیروں میں کچھ دل کی حالت زبان پر آجاتی ہے اس پر دل ودین نثار، اس کے دید کی تمنا، اس سے وصل کی آرزو اس کے ہجر میں آہ وزاری، اس کے انتظار میں بیقراری اس کے نہ آنے پہ یہ خیال کہ وہ وعدہ فراموش ہے، ظالم ہے، سنگدل ہے، آہ وزاری کا اس پر اثر نہیں ہوتا یہاں اختر شماری ہے وہاں مانگ میں افشاں بھری جا رہی ہے تڑپانے میں اس کو مزہ اور دل جلانے میں لطف آتا ہے، اس کی گلی کا چکر ہے، اس کے ہجر میں وحشت ہے صحرا نوردی ہے گریبان چاک ہے اس کے فراق میں مر مر کے جینا اور راتوں کو اٹھ اٹھ کے رونا ہے بہتا ہوا دریا بھی کبھی تھم جاتا ہے مگر دل ہے کہ کسی وقت نہیں تھمتا باغ بے اس کے ویرانہ اور بہار خزاں ہے محبت زندگی اور اس میں مبتلا رہنا حاصل زندگی ہے، واعظ وناصح کا سمجھانا گراں ہے چارہ گر کی تدبیریں ناگوار ہیں ان پر پھبتی کستا ہے اور ان کا مذاق اڑاتا ہے ہر شخص رقیب ہے مگر سب بوالہوس خود سچا عاشق ہے اس کو نامہ شوق لکھتا ہے پیام محبت بھیجتا ہے آدمی، کبوتر، باد صبا اس کے قاصد ہیں بے خودی طاری کرنے کیلئے شراب ساقی ہے۔

ادھر معشوق شانہ کشی و زلف آرائی میں مشغول نہیں بلکہ حیا مانع ہے، شرم دامن پکڑے ہے گھر والوں کا خیال ہے خاندان کی عزت کا پاس ہے راز عشق کھل جانے میں رسوائی کا ڈر ہے چپکے چپکے آنسو بہانا اور دل مسوس کے رہ جانا اس کی زندگی ہے وہ بھی اس احتیاط سے کہ گھر والے حالت میں کوئی تغیر محسوس نہ کریں۔

یہ مضامین غزل کی جان اور ایشیائی تمدن کے تقدس کا نشان ہیں ان بندشوں سے آزاد ملکوں میں تمدن کی یہ شرافت کہاں۔ گل وبلبل شیریں فرہاد لیلیٰ مجنوں کی محبت کس شاعری کو نصیب ہے۔

ان سب کی ایک زبان ہے ایک لہجہ ہے جو تمام اصناف سخن سے مختلف ہے خاص طور پر حسن وعشق کے نازک جذبات عاشق کی نیاز مندی عاجزی معشوق کی بے نیازی غرور حسن ناز وادا کے لئے لہجہ بہت نرم اور لوچ دار ہوتا ہے جب شاعر ان مضامین کو مناسب زبان اور لہجہ میں ادا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو شعر حسن وعشق کی بولتی ہوئی تصویر بن جاتا ہے ؎

یوں کوئی زلف بناتا ہے سنورنے والے
جو نہ ہوتا ہو پریشاں وہ پریشاں ہو جائے

ہائے وہ زلف کو بکھرائے کسی کا کہنا
جس کو ہونا ہو پریشاں وہ پریشاں ہو جائے

غزل پر اعتراض

بعض لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ غزل گو کے اعصاب پر عورت سوار ہے گل وبلبل، چاند سورج تارے شراب وکباب ساقی ومیخانہ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں وہ نیا مضمون پیدا اور حیات وکائنات کے مسائل بیان کرنے سے قاصر ہے۔

یہ اعتراض اب سے پچاس برس پہلے نہیں کیے گئے۔ مغربی شاعری سے نیم آشنا اور مشرقی شاعری سے ناآشنا یہ باتیں کہتے ہیں۔

عورت ہمیشہ سے مرد کی محبت کا محور رہی ہے دنیا میں اس سے زیادہ دلکش مرد کے لئے کوئی چیز نہیں حیات و کائنات میں، اس کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں جب تک دنیا اور یہ نظام فطرت قائم ہے اس وقت تک عورت مرد کی محبت کا مرکز رہے گی۔ اس کو جانے دیجیے کہ نظام فطرت میں اس کو کتنا دخل ہے۔ اس کی تفصیل غزل کا موضوع نہیں غزل کا تعلق اس سے ہے کہ انسان مال دولت عزت آبرو ہوش حواس سب اس کے پیچھے کھو بیٹھتا ہے فطرت اسی کی طرف مائل ہے اس سے بے نیازی اسی کے لئے ممکن ہے جس کی فطرت میں بگاڑ ہو (عنین یا خنثیٰ) انبیاء بھی اس سے دامن نہ بچا سکے۔ یہ بلا ہمیشہ انسان پر مسلط رہی اس کی ہر ادا مرد کے لئے حیات و کائنات کا اہم مسئلہ اور آفاقی کلچر ہے ؎

فتنہ در سر بتاں مست خرام
ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں (میر)

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کہ جا کرے کوئی (غالب)

جادو بھرا تھا سرمہ دنبالہ دار میں
ملتے ہی آنکھ دل نہ رہا اختیار میں

راضی ہوں میں وہ جو ستم ناروا کرے
بس میں کسی کے دل نہ کسی کا خدا کرے

ہر قوم کی زبان، شاعری اس کے تمدن کی عکاس ہوتی ہے خاص طور پر غزل جو سوائے اردو فارسی کے اور کسی زبان میں نہیں اس کی ایک مخصوص فضا ہے ایک خاص آہنگ ہے اس کی تشبیہوں استعاروں کی ایک الگ دنیا ہے اس کی ایک مخصوص زبان ہے اور اس میں ایک خاص لوچ۔ لچک اور ہلکا پھلکا پن ہے معترض اس کے لطف سے محروم ہیں اس کی ٹیکنک سے ناواقف ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل و دماغ پر جو عریاں شاعری چھائی ہوئی ہے اور جس تمدن کی برتری کے وہ قائل ہیں۔

وہاں ہر وقت اور ہر جگہ عشق آساں اور "وے افتاد مشکلہا" کا کوئی خطرہ نہیں۔ بازار، سینما، کلب، پارک، اسکول، کالج یا ہانگ کانگ اپنے گھر پہ والدین کے علم میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں اس سے پردہ اور پردہ نشین نقاب۔ چلمن۔ راز عشق۔ پردہ داری محبت۔ اشتیاق دید۔ شرم و حیا ہجر و فراق کے بہت سے مضمون جو ہماری غزل کی جان ہیں ان کے لئے فرضی دور از قیاس اور غیر فطری ہیں ان کے یہاں عورت کی حیثیت غالب کے جام سفال سے زیادہ نہیں ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

اکبر الٰہ آبادی نے اس معاشرے کی کتنی اچھی اور سچی عکاسی کی ہے ؎

وصل کے بعد تھینک یو کہہ کے
ان سے رخصت ہوا میں اے اکبر

ایشیا کا معشوق اتنا سہل نہیں اس کا عاشق کے اعصاب پر سوار رہنا یہاں کے تمدن کے موافق ہے اگر کسی کو عورت سے نفرت اور اردو شاعری سے رغبت ہے تو اور اصناف موجود ہیں۔ ایک صنف سخن جس کی ساری دلکشی اسی میں ہے کہ اس کا موضوع عورت ہے اس سے اس کو خارج کرنے اور فرضی غیر فطری پاک محبت داخل کرنے کی خواہش سے زیادہ بد ذوقی کیا ہو سکتی ہے۔

یہ شکایت بھی صحیح نہیں کہ گل و بلبل کے علاوہ کچھ نہیں۔

گل و بلبل۔ چاند۔ سورج اور تاروں سے زیادہ حسین شراب سے زیادہ پُر کیف تیر نشتر سے زیادہ چبھنے والی کوئی چیز نہیں جب تک دنیا قائم ہے ان سے زیادہ بہتر چیزیں نہیں مل سکتیں یہ مضامین نہیں نام میں اور معشوق کے وصف ذاتی یا اضافی کے استعارے ہیں ان کا

استعمال اسوقت تک ہوتا نہیں ہو سکتا جب تک ان سے بہتر اور موزوں تر چیزیں وجود میں نہ آجائیں اگر یہ چیزیں پرانی ہیں تو محبوب کے چشم و ابرو غیرہ کی جگہ اور بھی حسین تر اشیا بھی تو خلقت آدم سے اسوقت تک نہیں ہوئی

اس صورت میں محبوب کے چہرہ کے لئے چاند سورج پھول تبسم اور انگڑائی کے لئے بجلی نگاہ کے لئے تیر و نشتر سے بہتر استعارہ کیا ہو سکتا ہے ان کی دلکشی کبھی ختم نہیں ہو سکتی انھیں فرسودہ کہنے والا ذوق سلیم سے محروم ہے۔

جس طرح ہر نئی چیز پرانی چیزوں سے ایجاد ہوتی ہے اسی طرح دنیائے شاعری کے ان موجودات سے شاعر نیا مضمون پیدا کرتا ہے۔

معشوق کی انگڑائی بڑی دلکش ہوتی ہے۔ وہ اس حالت میں زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے فرد وہ مضمون ہے عزیز لکھنوی کا شعر ہے ؎

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

عزیز انگڑائی سے حسن کے بڑھ جانے کی یہ تعبیر کر کے لگ گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اڑا جاتا ہے نئی بات ہے اور اپنے مرکز نے تو قیامت ڈھادی۔ جسم میں جو حسن کے مرکز ہیں انگڑائی میں حسن ان مرکزوں کی طرف مائل پرواز تھا یعنی ان میں حسن بڑھ رہا تھا اس سے پہلے کس نے یہ بات کہی؟ اسی انگڑائی کو مانی جائسی نے ایک اور طرح کہا ہے ؎

حسن قامت کی جو حد تھی رعنائی نے — اس کو دو ہاتھ بڑھایا تری انگڑائی نے

ہم پرانے عاشق ہیں پرانا مضمون ہے عشق نے اسے نیا کر دیا ہے ؎

شعلۂ حسن سے تھا دود دل اپنا اول — آگ دنیا میں نہ آئی تھی کہ سوزاں ہم تھے

اسی کو جاوید نے ایک نئی طرح کہا ہے ؎

آج کے دن کی خبر دل کی دھڑک نے دی تھی — بچپنے میں کبھی سنتے تھے جو افسانۂ عشق

عزیز مرحوم کہتے ہیں ؎

سوز میں عشق رہی بعد فنا بھی دل میں — حصہ عمر مرے عشق کو کافی نہ ہوا

دل نہ ہوتا جب بھی تیرا عشق ہوتا روح کو — اس گرہ نے اور اس رشتہ کو محکم کر دیا

کیا یہ نئی باتیں نہیں ان میں جو چیز پرانی ہے وہ مضمون نہیں نام ہیں استعارے ہیں اور وہ کبھی نئے نہیں ہو سکتے۔

ہر بڑا شاعر نئے مضمون پیدا کرتا ہے پپیہے کی پر درد آواز کی ہزاروں تو جیہیں کی گئیں ہیں مولانا صفی لکھنوی نے بالکل نئی بات کہی ہے ؎

تو بھی مایوس تمنا مرے انداز میں ہے — جب تو یہ درد پپیہے تری آواز میں ہے

عاشق مرنے کے بعد بھی سوز عشق میں مبتلا رہتا ہے بلکہ اس کی خاک کا ذرہ ذرہ اسی طرح گرفتار اذیت میں رہتا ہے جس طرح زندگی میں تھا والد مرحوم نے جس اہتمام سے اس مضمون کو باندھا ہے اردو میں اس کی نظیر نہیں ملتی ؎

دل تھام لیا اپنا صحرا میں بگولوں نے — اف کہہ کے جو گرد اٹھی بیٹھی ہوئی تربت کی

غزل کا یہ موضوع، یہ سب تشبیہیں اور استعارے ایران میں پیدا ہوئے اردو میں جب شاعری شروع ہوئی تو اسی کی تقلید کی گئی اس میں اجتہاد یہ ہوا کہ فارسی میں مذکر اور مونث کی ضمیریں ایک ہی ہیں مگر اردو عورت آئی مردانی کی متحمل نہیں لیکن غزل میں معشوق کو رسوائی سے بچانے کے لئے مذکر ضمیروں سے ابہام پیدا کیا گیا جرأت کا شعر ہے ؎

قصیدہ اور غزل میں تھا ترا نام گر آہ — ترے پیارے زباں پر نام میرا پھر نہ تو لانا

اس فرق کے علاوہ غزل اب تک وہی ہے جو فارسی میں ہے۔

غزل کی یہی خوبیاں اور دلفریبیاں دنیا میں ہر جگہ سے زیادہ شاعری کو ابد و فا میں زندہ کئے ہوئے ہیں اور جب دنیا کے تمام ملکوں میں شاعری ختم ہو جائیگی جب بھی وہاں شعر بہت دنوں تک زندہ رہیگا جہاں غزل کہی جاتی ہے اس وجہ سے میں نے بھی غزل کو سب سے مقدم لکھا ہے اور اب جہاں شاعری کی لفظ آئے گی وہاں مراد غزل ہو گی۔

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری پر تبصرہ

لکھنؤ کی شاعری پر جن لوگوں نے بحث کی ہے انھوں نے پہلے دہلی کی شاعری کو پیش کیا ہے کیونکہ لکھنؤ کی شاعری اس سے الگ کوئی چیز نہیں اس سے خود بخود دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا موازنہ ہو جاتا ہے اور اس کے بغیر لکھنؤ کی شاعری کو سمجھنا ممکن بھی نہیں۔

اس میں عام طور پر لوگوں سے غلطیاں ہوئی ہیں پہلے ان پر گفتگو ضروری ہے۔

مولانا امداد امام اثر نے لکھا ہے کہ

دہلی کی شاعری میں داخلیت اور لکھنؤ کی شاعری میں خارجیت ہے

مولانا عبدالسلام ندوی اور دوسرے نقادوں کی رائے ہے کہ

دہلی کی شاعری میں یاس و حسرت اور لکھنؤ کی شاعری میں عیش و عشرت ہے۔ دہلی کی شاعری میں صوفیت اور لکھنؤ کی شاعری میں سوقیت ہے۔ دہلی کی شاعری میں سادگی لکھنؤ کی شاعری میں تصنع ہے۔

فراق گورکھپوری کی رائے ہے کہ

دہلی کی شاعری میں امارد سے جنسی تجربے ہیں اور لکھنؤ کی شاعری میں عورت ہے۔

نیاز فتحپوری کہتے ہیں۔

دہلی کا شاعر خراب الفت ہونے کے بعد ایک دنیا اپنی علیحدہ قائم کر لیتا ہے جہاں وہ کائنات سے بے نیاز ہو کے شعر نہیں کہتا بلکہ اپنے جذبات کی ایک حزیں راگنی میں گنگنایا کرتا ہے

اور لکھنؤ کا شاعر طالع ناساز کی تمام یاس افرینیاں دیکھنے کے بعد بھی کوچہ محبوب کو نہیں چھوڑتا۔

محفل یار میں غیروں سے انکا التفات دیکھ دیکھ کے جل رہا ہے مر رہا ہے لیکن ایک سرکش گدا کی طرح وہاں سے نہیں ٹلتا یہاں تک کہ وہیں دم دیتا ہے۔ ذبح ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی نہیں بلکہ موت کا بڑا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا محبوب بھی بازلف پریشان اس کے جنازے کے ساتھ ہے لکھنؤ میں تاثرات محبت کی یہ فضا پیدا ہو جاتا جس میں دوسروں کو متاثر کرنے کے لئے نزع۔ جان کنی۔ واویلا بین۔ شیون۔ جنازے کے مناظر ——— دردناک تو ہے لیکن خودداری اور وقار کی بلندی نہیں رکھتا

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا رُخ وہ ہے جس کا تعلق صرف محفل طرازیوں سے ہے اور جہاں عامۃ الورود جذبات الفت سے بحث کی جاتی ہے اس رنگ میں لکھنؤ کا شاعر ہر چند اہلِ نظر کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش نہیں کر سکتا لیکن ایک بوالہوس کی ہوس پرستیاں بھی ہمیشہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہوتیں ———

لکھنؤی شاعری کا یہ رُخ ضرور قابل لحاظ ہے اور ایک رند شاہد باز کی زندگی کے بہت سے نکتے اس میں تلاش سے مل جاتے ہیں ———

کی روانی زبان کی پاکیزگی الفاظ کی شائستگی لکھنؤ کی شاعری میں اپنی جگہ خاص چیز ہے اگر کوئی اسے تکمیل کے ساتھ ادا کر سکے

محاورات کی شگفتگی جو اہلِ لکھنؤ کا حصہ تھی"۔ انتقادیات حصہ دوم ص ۵۰ تا ۵۴

مولانا امداد امام اثر کی رائے صحیح نہیں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کی شاعری میں داخلیت بھی ہے اور خارجیت بھی میر و ناسخ کی ہم طرح غزلیں دیکھئے ؎

میر

وہ ظالم بھی تو سمجھے کہہ دیا ہم نے یہ نالاں کو
کہ گورستان میں گاڑیں جدا ہم اہلِ ہجراں کو

فلک نے گر کیا رخصت مجھے سیرِ بیاباں کو
نکالا سر سے میرے جائے مو خارِ مغیلاں کو

جلے ہیں کب سے مژگاں آنسوؤں کی گرم جوشی سے
اس آبِ چشم کی جوشش نے آتش دی گلستاں کو

بنے ناواقفِ شادی اگر ہم بزمِ عشرت میں
دہانِ زخمِ دل سمجھے جو دیکھا روئے خنداں کو

نہیں ریگِ رواں مجنوں کے دل کی بیقراری ہے
کیا ہے مضطرب ہر ذرہ رنگ بیاباں کو

ہوائے ابر میں کچھ بھی نہیں جو تو نہ ہو ساقی
دمِ افسردہ کر دے منجمد رشحاتِ باراں کو

ناسخ

درازی یاد دلواتی ہے اس زلفِ پریشاں کو
عزیز اس واسطے لکھتا ہوں میں شبہائے ہجراں کو

ہزاروں صدمۂ جاں کاہ ہیں پر میں نہیں مرتا
کہوں اب آبِ حیواں ظلمتِ شبہائے ہجراں کو

حنا خالق نے پیدا کی جو تیرے پاؤں کی خاطر
بنایا میرے تلووں کیلئے خارِ مغیلاں کو

نہ دیکھا سایہ جب گلشن میں اس سروِ چراغاں کو
کیا سروِ چراغاں نے سرِ سروِ گلستاں کو

ہم اے جراح برسوں رو چکے ہیں دو دن تو ہنسنے دے
نہ سی بہرِ خدا ظالم دہانِ زخمِ خنداں کو

جنوں نے جیب دی روزِ ازل ترغیبِ عریانی
گریباں صبح کو بخشا دیا دامن بیاباں کو

نہ کیونکر چشمِ مستِ یار خوش آئے مرے دل کو
کہ ناسخ دوست رکھتا ہے ہر اک میخوار یاراں کو

یاس و حسرت عیش و عشرت بھی دونوں جگہ کی شاعری میں موجود ہے۔

لکھنؤ کی شاعری میں سوقیت کا خیال بھی غلط ہے بلکہ اس کا الٹا ہے دہلی کی شاعری میں سوقیت ہے لکھنؤ کی شاعری مہذب اور سنجیدہ ہے اور یہی اس کا امتیاز ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ دہلی کی شاعری میں ابھار دینے جنسی تجربے اور صوفیت ہے اور لکھنؤ کی شاعری میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔

امرد پرستی نہ ہونے پر تو کسی کو اعتراض نہیں بلکہ بعض لوگوں نے اس کی تعریف کی ہے ان میں پنڈت دتاتریہ کیفی بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ غزل لکھنؤ جا کے فطرت کے موافق بن گئی یعنی امرد کی جگہ عورت اس کا موضوع بن گئی۔ ہاں تصوف کی شکایت ہے۔

غزل اور تصوف میرے خیال میں غزل کو تصوف سے کوئی ربط نہیں۔ ایسی ذات جو فہم و ادراک سے بلند اندازہ و قیاس سے باہر حواسِ سے محسوس کرنے سے قاصر نہ کوئی چیز نہ کسی چیز کی طرح اس کے عشق میں بیقراری اس کے ہجر میں گریہ و زاری اس سے وصل کے لئے اضطراب کتنی غیر شاعرانہ بات ہے۔ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ اختر نے اس کو بہت عمدہ طریقہ سے کہا ہے ؎

آتی نہیں یہ بات ہمارے قیاس میں
پردہ نشیں سمائے دلِ ناشناس میں!

نیاز فتحپوری نے سچ کہا ہے کہ عشق اس دنیا میں اسی گوشت و پوست کے پتلے سے ہو سکتا ہے اس کے علاوہ اگر کوئی روحانی عشق ہے تو وہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں نہ غزل سے اس کا کوئی تعلق ہے"۔

خود تصوف کے مضامین ایسے خشک اور بے کیف ہیں جو غزل

نہ کیوں وہ خوبیٔ قسمت پہ اپنی ناز کرے
نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے

ان اشعار میں جمال دلفروز نگاہ ناز شرم۔ ادائے ناز۔ آنکھوں آنکھوں میں دل کی بات کہہ دینا ایسی باتیں ہیں جن سے لطف پیدا ہوا ہے۔ یہ جنس لطیف کی دلکش خصوصیتیں ہیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مجازاً خدا کے لیے بھی یہ سب کہا جا سکتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایسے تمام اشعار میں صنعت ایہام یا توجیہہ ہوتی ہے اور اس میں جو دلکشی پیدا ہوتی ہے وہ تصوف کے عنصر سے نہیں بلکہ ایہام و توجیہہ کے اس پردے سے جس کے پیچھے سے ہمیں صنف نازک کی جھلک نظر آتی ہے۔

اسی طرح توکل صبر و قناعت رضا بالقضا توبہ و انابت سے بے ثباتی دنیا۔ ترک دنیا وغیرہ کے مضامین میں جب ہی لطف پیدا ہوتا ہے جب وہ غزل کی زبان میں کہے جائیں جیسے میر کا یہ شعر ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

ایسے اشعار اساتذہ لکھنؤ کے یہاں بھی ہیں ؎

نہ کوئی اُن کے سوا اور جہاں میں دیکھا
وہی وہی نظر آئے جہاں جہاں دیکھا
کہیں نہاں نظر آئے کہیں عیاں دیکھا
نئے لباس میں دیکھا تجھے جہاں دیکھا

تصوف کے اشعار کی ایک قسم وہ ہے جسے اہل لکھنؤ عارفانہ کہتے ہیں اس میں مصنوع سے صانع کی معرفت کا مضمون ہوتا ہے یہ اہل لکھنؤ کا خاص موضوع ہے اور اس میں نہایت عمدہ شعر کہے گئے ہیں ؎

ہم تجھ میں محو قدرت پروردگار ہیں
اک مشت خاک کو مہ انور بنا دیا
رشک

کا موضوع نہیں بن سکتے۔

ہر شاعر کا کلام اس کے ذوق اور معتقدات کا آئینہ ہوتا ہے صوفی شعراء نے غزل میں اپنے مزعومات اور معتقدات اشاروں اور اصطلاحوں میں بیان کئے ہیں شاعری میں اصطلاحات کی گنجائش نہیں اس کا تعلق عام زبان سے نہیں ہوتا صوفیا اپنی بات کہہ کے دل ہی دل میں مزے لیتے ہوں گے ان کی نقالی اوروں نے بھی کی ہے جیسے ؎

غالب

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں
ہیں ہو خود دریا و لے کوتہ نظر کے سامنے
ظرف موج و قطرہ میرے رخ اک پردا ہو گیا
پردہ کو تعینات کے در دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

غیب و شہود غزل میں بے معنی لفظیں ہیں ان اشعار کو وہی سمجھ سکتا ہے جو وحدت وجود حجاب و تعینات وغیرہ مصطلحات صوفیہ سے واقف ہو یہ نہ غزل کی زبان ہے نہ غزل کے مضامین ہیں۔

غزل میں مصطلحات و مفروضات شعرا کے علاوہ کسی معنی بند لفظ کی گنجائش نہیں۔

تصوف کے اشعار کی ایک قسم وہ بھی ہے جس میں کیف ہے ؎

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

لکھنؤ کی شاعری میں سادگی

لکھنؤ کی شاعری میں سادگی نہ ہونے کا خیال
بھی درست نہیں ہر بات تصنع اور تکلف ہی سے نہیں کہی جاتی کبھی سامنے کی
بات برجستہ اور سادگی سے ادا ہو جاتی ہے ناسخ جو تکلف میں مشہور ہیں ان کی سادگی دیکھیے ؎

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی | عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی
بہار آتے ہی ہر سمت پھول پھولے ہیں | ہوئی شگفتہ طبیعت نہ ہم ملولوں کی
صحرا کو بھی نہ پایا رشک و حسد سے خالی | کیا کیا جلا ہے ساکھو ببولا جو ڈھاک بن میں
آتی جاتی ہے جا بجا بدلی | ساقیا جلد آ ہوا بدلی
زندگی زندہ دلی کا نام ہے | مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں
فراق یار میں فصلِ بہار آئی ہے | الٰہی آتش گل سے تمام باغ جلے
گھر مرا فرقت میں سونا ہو گیا | کنج مرقد کا نمونہ ہو گیا

لکھنؤ کی شاعری میں تصنع

لکھنؤ کی شاعری میں تصنع کی شکایت بھی کی جاتی ہے
جس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صنائع و بدائع کا استعمال بہت ہے یہ بات صحیح ہے
مگر قابلِ مذمت نہیں اس سے زبان کو بہت فائدہ ہوا ایہام گوئی تو پہلے ہی سے
تھی اب صنائع و بدائع سے بے لطف سادگی دور ہو گئی اس کی مثال ماہر القادری
کا یہ نعتیہ شعر ہے ؎

وہ جو نہ ہوتے کچھ بھی نہ ہوتا دنیا ان سے عقبیٰ ان سے
دونوں جگ ہیں ان کی بدولت صلی اللہ علیہ وسلم

وہ جو نہ ہوتے کچھ بھی نہ ہوتا بات صرف اتنی ہی ہے اسی کو ان الفاظ میں
دہرایا ہے دنیا ان سے عقبیٰ ان سے اسی کو دوسرے مصرع میں یوں کہا
ہے دونوں جگ ہیں ان کی بدولت شعر حسن معنی اور حسن بیان دونوں
سے عاری ہے۔ میں نے اس پھیکے شعر میں یوں لطف پیدا کر دیا ہے ؎

مزرعِ دنیا گلشن عقبیٰ دونوں شاداب ان کے قدم سے
تابش قدرت بارش رحمت صلی اللہ علیہ وسلم!

ہمارے عزیزوں میں حکیم سید علی صاحب آشفتہ بڑے باکمال شاعر
تھے انھوں نے ایک رباعی کہی جس کے آخری دو مصرعے یہ تھے۔

اے مالک کائنات جلوے برسیں | اس بزم کو بزم نور کرنا ہے مجھے

والد مرحوم کو جب یہ رباعی سنائی تو فرمایا تیسرا مصرع یوں بنا دو ؎

اے ابر کرم فلک سے جلوے برسیں

اب مصرع آسمان پر پہنچ گیا یہی صنعتوں کا مقصد اور اہلِ لکھنؤ کا خاص
ذوق ہے وہ اسے محاسن شعر یہ کہتے ہیں مگر آج کل جان بوجھ کے لوگ
اس سے بچتے ہیں اگر کوئی صنعت آجاتی ہے تو کہتے ہیں اس میں کیا
دھرا ہے ایک صنعت پر شعر کی بنیاد ہے یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بھی نہ ہوتی تو کون سی
خوبی پیدا ہو جاتی اساتذہ دہلی و لکھنؤ نے ہر زمانہ میں صنعتوں سے شعر میں
خوبی پیدا کی ہے مومن کا مشہور شعر ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

غالب کہتے ہیں ؎

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا | تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

ان اشعار میں سارا لطف صنعت سے ہے
اکبر الہ آبادی کا کلام اس قدر مقبول ہے ان کے ہر شعر کی بنیاد کسی صنعت پر ہے
صنعتوں کے مخالفین ان کے بھونڈے استعمال سے بے مزہ ہو کے صنعتوں ہی کی
مخالفت کرتے ہیں بے ڈھنگا استعمال سب کی طبیعت پر بار ہوتا ہے
اسی طرح بے لطف سادگی بھی ناگوار ہوتی ہے اس وجہ سے صنعتوں یا

یا سادگی کا سرے سے مخالف ہو جانا صحیح نہیں پرہیز کے قابل وہ بات ہے جس سے لطف سخن جاتا رہے خواہ بے مزہ سادگی ہو یا صناعی

نیاز صاحب نے دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا جو موازنہ کیا ہے اس سے بھی مجھے اختلاف ہے۔ انھوں نے لکھنؤ کی شاعری کے بارے میں جو کہا ہے وہی سب مومن کی شاعری کے متعلق بھی کہا ہے اگر ابتداء میں جرأت و رنگین اور آخر میں داغ کو بھی شریک کر لیا جائے تو تہذیب و سنجیدگی لطف زبان و حسن بیان میں لکھنؤ کی برتری کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اور یہی حقیقت ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

اب اکثر شعراء اپنے اشعار میں بازاری عورتوں کی ان اداؤں اور حرکتوں بلکہ اب کپڑوں اور ان اعضاء کا ذکر بار بار کرتے ہیں جس سے شعر مبتذل ہی نہیں فحش ہو جاتا ہے اور ملک میں چونکہ بدتہذیبی اور شہوت پرستی کو ترقی ہو رہی ہے اس لئے ہر طرف سے اس پر صدائے تحسین و مرحبا بلند ہوتی جاتی ہے۔

دہلی والے اس کا الزام زیادہ تر شعرائے لکھنؤ کو دیتے ہیں اور چونکہ یہ اعتراض کسی حد تک صحیح بھی ہے اس لئے کہ لکھنؤ کی شاعری نے ایسے بازاری مذاق کے شاعر واقعی زیادہ پیدا کئے لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ آخری دور کا بگڑا ہوا مذاق تھا جس میں لکھنؤ اور دہلی کی کوئی تخصیص نہیں سچ یہ ہے کہ لکھنؤ کے

بعض شعراء میں اس مذاق کا زور و شور جب تھا اب تو ہم سمجھتے ہیں کہ داغ کی معرفت اس فخر کو دہلی نے لکھنؤ سے چھین لیا اور جس حد تک داغ کی شاعری عروج پاتی جاتی ہے اسی حد تک یہ مذاق بھی روز بروز ملک میں زیادہ پھیلتا جا رہا ہے۔

رسالہ معیار ۱۳۲۴ھ جلد ۱

مولانا کی رائے صحیح نہیں عورتوں کی اداؤں لباس اور اعضاء کا ذکر میر و سودا کے یہاں بھی ہے اور غزل کا موضوع ہے اس میں ابتذال اور بازاریت زبان طرز ادا اور لہجہ سے پیدا ہوتی ہے اگر اس کو مہذب اور سنجیدہ طریقہ سے کہا جائے تو یہ غزل کی جان ہیں (تفصیلی بحث آگے آئے گی)

اس میں بازاریت کی ابتداء جرأت و رنگین سے ہوئی اور داغ تک وہ رنگ باقی رہا اسے لکھنؤ کے سر تھوپنا درست نہیں اس غلط فہمی کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے غلط طور پر کچھ شاعروں کو لکھنوی اور کچھ کو دہلوی قرار دے کے ان کے مخصوص طرز کو دہلی اور لکھنؤ کا طرز قرار دیا ہے یعنی جب وہ دہلی کی شاعری کی خصوصیت بیان کرتے ہیں تو میر و سودا درد اور مصحفی کا کلام پیش کرتے ہیں اور آگے بڑھ کے غالب کو بھی ملا لیتے ہیں اور لکھنؤ کی شاعری میں جرأت و رنگین اور انشاء کا کلام پیش کرتے ہیں اس طرح وہ میر و سودا اور درد کو دہلوی اور جرأت و رنگین و انشاء کو لکھنوی فرض کرتے ہیں۔

میر نے نوے برس کی عمر پائی آگرے میں پیدا ہوئے ابتدائی زندگی وہیں گزاری جوانی میں دہلی اور بڑھاپے میں لکھنؤ آئے ان کی عمر برابر کے تین حصوں میں منقسم

آگرے میں پیدا ہونا جوانی تک وہیں رہنا ایسی بات ہے جس سے انھیں آگرے کا تسلیم کرنا چاہیئے مگر ہم ان کو دہلوی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بحیثیت شاعر کے زیر بحث آتے ہیں اور ذوق شعری ان کا دہلی میں پروان چڑھا اسی وجہ سے وہ اپنے کو دہلوی کہتے اور سب انھیں دہلوی سمجھتے ہیں۔ اسی اصول پر ہم جراءت رنگین۔ انشاء اور مصحفی کو بھی دہلوی سمجھتے ہیں۔

انشاء نے لکھنؤ میں جو ہنگامے کئے وہ سب اس سے پہلے دہلی میں کر چکے تھے لکھنؤ آئے اور وہاں کی فضا سے متاثر ہونے کی وجہ سے اگر جراءت و رنگین و انشاء کو لکھنوی کہا جاتا ہے تو یہی وجہ میر و سودا کو بھی لکھنوی سمجھنے کے لئے کافی ہونا چاہیئے۔

جراءت اور میر میں تو کوئی فرق ہی نہیں دونوں ایک ہی زمانہ میں لکھنؤ آئے اور ایک ہی سال دونوں کا انتقال ہوا اگر جراءت کی شاعری لکھنوی ہے تو میر کی شاعری دہلوی کیوں؟

اور ستم ظریفی دیکھئے میر تیس برس سودا بارہ برس مصحفی بیالیس برس لکھنؤ میں رہے اور لکھنوی نہیں کہے جاتے اور رنگین نو برس لکھنؤ میں رہنے سے لکھنوی ہو گئے۔

اس سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ جب دہلویت کا ذکر آتا ہے تو میر و سودا درد و غالب کا کلام پیش کیا جاتا ہے یہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا خاص اسلوب اور انفرادیت ہے اگر یہ دہلویت ہے تو دہلی کے ہر شاعر کا کلام ویسا ہی ہونا چاہیئے کیا وجہ ہے کہ میر۔ درد۔ سودا۔ شاہ نصیر۔ ذوق غالب مومن اور داغ سب کا رنگ الگ ہے دہلویت وہی ہو سکتی ہے جو سب میں

مشترک ہو یہ اشتراک اگر کچھ ہے تو بعض الفاظ و محاورات تذکیر و تانیث فارسی ترکیبوں کی افراط اور بھونڈے پن میں۔

سب سے پُر لطف بات یہ ہے کہ دہلویت کے اظہار میں میر و درد کا بہترین کلام اور لکھنویت کے اظہار میں جس کا کلام پیش کیا جاتا ہے وہ اس کا بدترین کلام ہوتا ہے۔

اگر انشاء کا طریقہ غیر راسخہ اور جراءت کی چوما چاٹی لکھنؤ کی فضا کا اثر ہے تو میر و سودا کے یہاں بھی وہی ہونا چاہیئے اور ناسخ و آتش کو تو او کھیل کھیلنا چاہیئے تھا۔ شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ گرد و پیش کے حالات ہی کا اثر نہیں ہوتا اس کی ذاتی افتاد طبیعت کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔

جراءت و رنگین اور انشاء کی بیہودگیاں لکھنؤ کی تہذیب کے بالکل خلاف ہیں اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ان کا رنگ کسی نے اختیار نہیں کیا بلکہ اس کو مردود قرار دیا۔

سب سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ آتش کا اسلوب دہلوی کہا جاتا ہے یہ خیال نہیں رہتا کہ آتش کا کلام دہلوی طرز کا تسلیم کر لینے کے بعد دہلی کا وہ مخصوص رنگ کہاں رہ گیا جو لکھنؤ میں نہیں پایا جاتا۔

اصل یہ ہے کہ ولی سے مصحفی تک دہلی کی شاعری کا دور تھا سارے ہندوستان میں اسی کی تقلید کی جاتی تھی۔ ناسخ سے لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی تو ہر جگہ اس کی تقلید کی گئی جو آج تک باقی ہے انھیں دونوں کا فرق لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا فرق ہے جو دونوں جگہ کی تہذیب و تمدن میں نظر آئے گا۔

تمدن کی تعریف تمدن شہری زندگی کو کہتے ہیں جس میں لباس خوراک رہنے سہنے کے طریقے رسم و رواج علوم و فنون سب داخل ہیں اور ان سب باتوں میں دیہاتیوں کی بہ نسبت شہریوں میں زیادہ سلیقہ اور نفاست ہوتی ہے۔ تمدن پر سیاسی حالات کا بڑا اثر ہوتا ہے امن و امان خوشحالی اور

خارغ البالی کا تمدن اور ہوتا ہے قتل و غارت اور افلاس و پریشانی کا اور۔ اس لئے پہلے دونوں جگہ کے سیاسی حالات کا بیان ضروری ہے مگر وہی حالات جن سے تہذیب و تمدن کو سمجھنے میں مدد ملے اور ہم یہی کوشش کریں گے۔

دہلی کا تمدن

اُردو شاعری کی ابتدار اورنگ زیب کے آخری عہد میں اُردو شاعری کی ابتدار ہوئی اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کے بیٹوں میں تلوار چلی۔ بڑا بیٹا **بہادر شاہ اوّل** محمد معظم کابل کا صوبہ دار تجربہ کار اور ہوشیار آدمی تھا اس نے سنہ ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء میں حکومت پر قبضہ کرکے بہادر شاہ لقب اختیار کیا۔ بگڑے ہوئے حالات کو سنبھالا مگر پانچ برس کے اندر مر گیا اور اس کے بیٹے ٹبنرو آزما ہوئے۔

جہاندار شاہ دوسرا بیٹا معزالدین جہاندار شاہ ذوالفقار خاں کی مدد سے سنہ ۱۱۲۴ھ / ۱۷۱۲ء میں تخت پر بیٹھا یہ ایک طوائف لال کنور (شریں لقا آرامِ جاں) پر فریفتہ تھا وہ بہت پست فطرت تھی ہندوستان کی ملکہ بننے کے بعد بھی اس کی بازاریت نہیں گئی رتھ میں بادشاہ کو بٹھا کے چیزیں خریدنے بازار لے جاتی تھی اس کی دو سہیلیاں ایک سبزی بیچتی تھی دوسری کی شراب کی بھٹی تھی وہ ان دونوں سے ملنے بادشاہ کو لے کے جاتی تھی ان کو بڑی بڑی جاگیریں اپنے بھائیوں کو اعلیٰ مناصب اور خطاب دلوائے تھے۔ ان کے دروازے پر ہاتھی جھومتے تھے سواری کے آگے نوبت نقارا بجتا تھا امیروں کی محل سرائیں ضبط کرکے انھیں دیدی گئیں تھیں۔ حقیقت میں بادشاہ خود سفلہ مزاج تھا جس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ شہر میں ایک ڈھلوان چٹان تھی جس پر بازاری لڑکے پھسل پٹی کھیلا کرتے تھے ادھر سے ان کا بھی گزر رہا۔ نہیں معلوم لال کنور نے فرمائش کی یا خود جی چاہ گیا اکبر اعظم کا یہ جانشین سواری سے اتر آیا اور چٹان کو سر کر دیا

اس وقت اس پیر نابالغ کی عمر چہل سال سے بھی بارہ برس زیادہ تھی یہیں سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ اس کی تخلیہ کی صحبتوں میں کیا کچھ ہوتا ہوگا۔

ذوالفقار خاں | ذوالفقار خاں دبنگ آدمی تھا دوسروں کو دست اندازی کی ہمت نہ ہوتی تھی وہ بادشاہ اور لال کنور کے بہت سے احکام کی تعمیل نہیں کرتا تھا اور حکومت کو سنبھالے ہوئے تھا اس پر بھی چاروں طرف سکھوں مرہٹوں اور جاٹوں کی لوٹ مار سے بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔

فرخ سیر | بہادر شاہ کا لڑکا عظیم الشان بنگال کا گورنر جہاں دار شاہ کا بڑا بھائی جسے قتل کرکے ذوالفقار خاں نے جہاں دار شاہ کو تخت پر بٹھایا تھا اس کے بیٹے فرخ سیر نے اندر ہی اندر تیاریاں کیں اور بارہہ کے سردار عبداللہ خاں صوبہ دار الٰہ آباد سے مدد چاہی پہلے تو اس نے انکار کیا مگر جب یہ ماں بیٹے اس کا دامن تھام کے روئے اور سیادت کا واسطہ دیا تو سید کا دل پگھل گیا اور حمایت پر آمادہ ہوگیا ۱۱۲۵ھ / ۱۷۱۳ء میں بھائی کی جہاندار شاہ مع لال کنور کے گرفتار اور چند روز کی قید کے بعد قتل ہوا۔
فرخ سیر بادشاہ اور عبداللہ خاں وزیر اعظم ہوا دربار ڈوم ڈھاڑیوں سے تو صاف ہوگیا مگر پرانے امرا جوڑ توڑ میں لگ گئے ملک کا انتظام نہ ہوسکا چاروں طرف لوٹ مار اور بدامنی اسی طرح رہی جودھ پور کا راجہ باغی ہوگیا فرخ سیر نے مختلف مقامات پر مہمیں بھیجیں سکھوں کی گوشمالی اور راجہ جودھ پور سے مصالحت ہوئی اس کی لڑکی سے فرخ سیر نے شادی کرلی جاٹوں کو بھی سزا ملی لیکن خزانہ خالی تھا۔ فوج کو تنخواہ نہیں ملتی تھی پایہ تخت میں ہنگامہ برپا تھا۔

عبداللہ خاں | امراء عبداللہ خاں کا زور توڑنا چاہتے تھے فرخ سیر

شاہی کمار (گیتی آرا بیگم) پر دیوانہ اور معاملات سلطنت سے بیگانہ تھا۔ اس پر اپنے محسن سیدوں کے قتل کا درپے ہوگیا تین دفعہ قاتلانہ حملہ کرایا ہر دفعہ وہ بچ گئے اور سازش کھل گئی جب سیدوں کے لئے کوئی چارہ نہ رہا تو اسے قید کردیا جس میں اس نے خودکشی کرلی۔ حالات سے باخبر شاعر نے تاریخ کہی

مساوات دوانش انچہ باید کردند ؎ عظمت اللہ بے خبر

رفیع الدرجات | ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء میں سید برادران نے رفیع الدرجات (ابن رفیع الشان ابن شاہ عالم) کو تخت پر بٹھایا۔ یہ مدقوق تھا جب مرنے کے قریب ہوا تو اس کی خواہش پر اس کے چھوٹے بھائی

شاہجہان ثانی | رفیع الدولہ کو شاہجہان ثانی کا خطاب دے کے تخت نشین کیا اس کو عیاشی کے سوا کسی چیز سے کام نہ تھا چند ماہ میں وہ بھی مرگیا۔

تخت و تاج کے لئے یہ خلفشار دہلی کے واسطے نیا نہ تھا جب ایک بادشاہ مرا تو یہی کچھ ہوا ان ہنگاموں سے بھی دہلی پر کوئی اثر نہیں پڑا اور وہاں کی آبادی مضطرب نہیں ہوئی ہاں سفلہ مزاج شاہوں کے تخت پر بیٹھ جانے سے ڈوم ڈھاری بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ کر حکومت کا ساز بھی بجانے لگے۔ علماء اور اہلِ کمال بے قدر ہوگئے مگر تھی لاکھ لٹے کا پھر بھی سوا لاکھ ٹکے کا۔ اس مٹی ہوئی حالت پر بھی دہلی سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی اس وجہ سے اہلِ دہلی کے پاؤں وہاں سے نہیں اکھڑے۔

محمد شاہ | سید برادران نے ۱۱۳۱ھ میں شاہزادہ عالی گوہر کو قید سے نکال کے تخت پر بٹھایا اور محمد شاہ لقب اختیار کیا۔ یہ عیاشی اور ناچ رنگ میں اپنے پیش روؤں سے کم نہ تھے مگر اقبال ساتھ لائے تھے اتفاق سے سید محمد امین سعادت خاں برہان الملک ایسا آدمی انھیں مل گیا

جس نے سید برادران کو قتل کر کے ان کو آزاد کر دیا اور وہ اطمینان سے رنگ رلیاں منانے لگے۔ ساز و آہنگ کا دریا بہنے اور حسن و جمال در و دیوار سے برسنے لگا امراء اپنے اپنے صوبے چھوڑ کے داد عیش دینے کے لئے آ گئے صاحب مرقع دہلی جو آصف جاہ کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھانے دہلی آئے تھے ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امیروں کے گھر سے لے کے بازاروں کا کونا کونا

ع دامان باغبان و کف گلفروش تھا!

اس زمانہ میں (۱۱۳۳ھ) ولی کا دیوان آیا جو پہلے کی بہ نسبت بہت صاف زبان میں تھا اس نے قبول عام حاصل کیا۔

سلطنت اودھ کا قیام | سید محمد امین سعادت خاں برہان الملک ۱۱۳۴ھ میں اودھ کے صوبیدار ہوئے جہاں انھوں نے اتنی مضبوط حکومت قائم کی جو مغل شاہنشاہی سے بھی قوت و طاقت میں بڑھ گئی۔

دہلی پر پہلا حملہ | مرہٹے سکھ جاٹ ہر طرف لوٹ مچائے تھے ۱۱۴۹ھ میں بالاجی بشوا ناتھ راؤ پیشوا کا لڑکا اسّی ہزار فوج سے دہلی پر حملہ آور ہوا کالکا کے میلے کو لوٹ کر شہر میں داخل ہوا اور اپنی تمام خواہشیں بادشاہ سے منظور کرا کے واپس ہوا برہان الملک کو اس کی خبر ہوئی وہ ایک جرار لشکر لیے کے آندھی کی طرح آیا دو منزلہ کو سہ منزلہ اور سہ منزلہ کو چو منزلہ کرتا ساٹھ کوس کی مسافت ایک دن میں طے کر کے مرہٹوں کے سر پہ پہنچ گیا ان کے حواس جاتے رہے برہان الملک کا ارادہ تھا کہ ان کو قید کر کے مع مال و متاع بادشاہ کی خدمت میں حاضر کریں امرائے دربار نے حسد سے بادشاہ کو بھڑکایا کہ شاہی حکم کے بغیر مرہٹوں پر حملہ کرنا (جبکہ بادشاہ ان سے معاہدہ کر چکے تھے) وقار شاہی کے خلاف ہے۔ فوراً واپسی کا حکم بھیجا گیا برہان الملک

نے اس حکم کو مخفی رکھا اور مرہٹوں کی اس شرط پر جان بخشی کی کہ وہ کبھی اودھ کا رخ نہ کریں گے۔

اس کا اثر بڑا گہرا اور دور رس ہوا جب سارا ہندوستان لوٹ مار کی آگ میں جل رہا تھا اودھ میں مکمل امن تھا۔ دہلی کا اس وقتی ہلچل کے بعد پھر وہی رنگ ہو گیا ادارنگ، سدارنگ، سب رنگ، سارنگ وغیرہ ناچنے گانے والوں کو خطاب دیئے گئے جس سے محمد شاہ رنگیلے مشہور ہوئے سارنگ دیو نے سارنگی ایجاد کی۔

اہلِ دہلی کا زنانہ پن | یہ رنگینی اس حد پر پہنچ گئی کہ مردوں میں زنانہ پن پیدا ہو گیا۔ آنکھوں میں کاجل۔ دانتوں میں مسی، ہاتھ پاؤں میں مہندی کان میں بالے اور کپڑوں میں گوٹا پٹھا ٹانکا جانے لگا۔

انشا نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ سادات بارہہ دہلی والوں کو نامرد و زنانہ کہتے ہیں۔ لباس میں پٹھا گوٹا ٹانکنا اور ان کی صحبت میں رہنا عار سمجھتے ہیں۔ جانسٹھ و بڈھانہ کھتولی وغیرہ میں اپنی جاگیروں پر رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

بعض امراء کی توجہ سے رسد بھی قائم ہوئی اور زیج محمد شاہی مرتب ہوئی۔ فضلی نے روضۃ الشہدا کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام دہ مجلس رکھا۔

دہلی کی امرد پرستی | اس زمانے میں دہلی میں امرد پرستی کو بہت ترقی ہوئی۔ یہ ترکوں کا خاص ذوق تھا اس کی تاریخ مولانا شبلی کی زبانی سنئے۔

امرد پرستی کی تاریخ | "ابو ہلال عسکری نے کتاب الاوائل میں لکھا ہے کہ عرب مطلقاً امرد پرستی سے ناواقف تھے لیکن جب پہلی صدی میں فتوحات کا سیلاب خراسان

تک آیا اور اہلِ فوج مدت تک وطن اور اہلِ وعیال سے دور رہے اس کے ساتھ لڑائیوں میں سادہ رو نوجوان گرفتار ہو کے آئے اور غلام بن کر خلوت وجلوت میں ساتھ رہنے لگے تو امرد پرستی اور شاہد بازی کا عام مذاق پیدا ہوا۔ ـــــ معتصم باللہ نے عرب کو فوج سے نکال کے ترک بھر دیئے تھے ـــــ ہر جگہ فوجی صیغوں میں ترک ہی نظر آتے تھے۔ یہ نوجوان سپاہی حسین اور خوشرو ہوتے تھے اس لیۓ ان کی چال ڈھال رفتار گفتار بات چیت ایک ایک ادا طنازی اور شوخی کے لباس میں جلوہ گر ہوتی تھی چنانچہ اکثر اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی سپاہی بچے مکتب عشق کے معلم تھے ـــــ ایاز کا نام تم نے محمود کے معشوق ہونے کی حیثیت سے سنا ہوگا ـــــ ترکوں کی معشوقی نے یہاں تک وسعت حاصل کی کہ ترک کے معنی معشوق کے ہو گئے ؎

جملہ ترکان جہاں ہندوے تو

یہ مذاق اس قدر عام ہوا کہ سلاطین و رؤسا تک علانیہ امرد پرستی کرتے تھے اور دربار میں ان کے معشوق نظر فروزی کا کام دیتے تھے شعراء سے ان معشوقوں کی تعریف و توصیف میں سر دربار اشعار لکھوائے جاتے تھے اور شعراء ممدوح کی عشق پرستی کا علانیہ ذکر کرتے تھے ـــــ جب یہ نوخط میدان میں آئے تو گھر گھر آگ

لگ گئی بڑے مقدس درویش اور ارباب حال مکتبوں میں بچوں کو گھورنے جاتے تھے ـــــ استاد شاگرد پیر و مرید ایسے نازک اور قابل ادب تعلقات بھی عشق پرستی سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ اس حالت نے ملک اور قوم کی اخلاقی حالت پر جو اثر کیا اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مٹھی بھر تاتاریوں نے خراسان سے لے کر بغداد تک خاک اڑا دی۔" (شعر العجم ح ۵ ص ۱۹۰ تا ۱۹۵)

اس قتل و غارت کا نتیجہ مولانا نے یہ بیان کیا ہے:۔

"تاتاریوں کے ہنگامے نے جو اسی زمانے میں شروع ہوا تمام اسلامی دنیا کو زیر و زبر کر دیا۔ اینٹ سے اینٹ بج گئی مشرق و مغرب تک سناٹا ہو گیا۔ تصوف کی بنیاد دنیا و مافیہا کی بے قدری اور بے حقیقتی پر ہے یہ سب کو آنکھوں سے نظر آ گئی ـــــ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس کثرت سے صوفی شعراء اس زمانے میں پیدا ہوئے کسی زمانے میں نہیں پیدا ہوئے"

(شعر العجم ح ۵ ص [illegible])

صوفیت کی ترقی کا نتیجہ امرد پرستی کی فضا میں جو ہوا اس کی کیفیت مولانا شبلی نے یہ بیان کی ہے۔

"اس زمانے میں امرد پرستی کا عام مرض پھیلا ہوا تھا صوفیہ اور اہلِ نظر اس کو عشق حقیقی کی منزل اولین قرار دیتے تھے اور ارباب ذوق کے لیۓ تفریح خاطر کا اس کے سوا کوئی سامان نہ تھا۔ شیخ (سعدی) چونکہ اس سانپ کو کھلا چکا تھا۔ اس کی مضرتوں سے خوب واقف تھا۔ اس لیۓ اس نے سختی سے اس کی برائیاں کی ہیں۔"

سراز مغز دو از درم کن تہی چو خاطر بفرزند مردم نہی
مکن بد بفرزند مردم نگاہ کہ فرزند خویشت برآید تباہ

صوفیہ کا پردہ اس طرح کھولتے ہیں ؎

گروہے نشینند با خوش پسر کہ ما پاکبازیم و اہل نظر

صوفیوں کے اس دعوے کو کہ جمال سے ہم کو صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہوتا ہے اس طرح رد کرتے ہیں ؎

چرا طفل یک روزہ ہوشش نبرد کہ در صنع دیدن چہ بالغ چہ خورد
محقق ہماں بیند اندر ابل کہ در خوبرویان چین و چگل

یعنی صنعت ایزدی کا مطالعہ مقصود ہے تو ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ میں نظر آتی ہے۔ خوشجمال اور پری جمال کی کیا تخصیص ہے۔ ایک باریک بیں کو اونٹ کے ناھوزوں ڈیل ڈول میں بھی وہی صنعت کاریاں اور نکتہ آفرینیاں نظر آتی ہیں جو چین و چگل کے معشوقوں میں ہیں ——— ریاکار عالموں کی قلعی سب نے کھولی ہے لیکن صوفیہ کا گروہ جو ہمہ تن ریاکار ہے ان کی نسبت کبھی کو ریاکاری کا گمان بھی نہیں ہوتا اور ہو بھی تو عوام کے ڈر سے ظاہر نہیں کرسکتا۔ شیخ (سعدی) اس راز سے خوب واقف تھا۔ اس لئے اس نے نہایت لطیف پیرایوں میں اس مضمون کو ادا کیا ہے ؎

بروں نمی روہ از خانقہ یکے ہشیار کہ پیش شحنہ بگوید کہ صوفیاں مستند
محتسب در قفائے رنداست غافل از صوفیان شاہد باز

اس طرح تصوف کے ساتھ امرد پرستی پھیلتی رہی یہاں تک کہ چھوٹی

حکومت قائم ہوئی انھوں نے شعراء کو مدح اہل بیت میں قصیدے اور مصائب میں مرثیے کہنے کی ہدایت کی علماء نے حدیث و تفسیر میں کتابیں لکھیں علوم اہل بیت کی اشاعت ہوئی۔ پیری مریدی کا خاتمہ ہوا۔ خانقاہیں ویران صوفیہ منتشر اور امرد پرستی ختم ہوئی۔ مگر مغبچہ۔ ترسابچہ۔ ترک بچہ۔ سبزہ خط وغیرہ مضامین یادگار چھوڑ گئی۔

ترکی ذوق ترکستان میں یہ ذوق ترقی کرتا رہا۔ ہندوستان میں انھیں ترکوں کے ساتھ آیا علاءالدین خلجی اور ملک کافور قطب الدین مبارک شاہ اور نومسلم لڑکے خسرو گجراتی کا عشق تاریخ میں موجود ہے۔ بابر نے تزک میں اپنے استاد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ امرد پرست تھا۔ سمرقند کے بارے میں لکھتا ہے کہ سر بازار امارد کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے لوگ گھومتے تھے کوئی بغیر امرد کے نظر نہیں آتا تھا۔

اپنی پہلی بیوی سے ناچاقی کا سبب یہ لکھا ہے کہ میں اس زمانہ میں ایک لڑکے بابری پر دیوانہ تھا۔ جہانگیر نے تزک میں بھی ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اورنگ زیب کے زمانے میں سرمد اور ابھے رام کا عشق مشہور ہوا۔ جعفر زٹلی نے اورنگ زیب کے ایک لڑکے کو بھی اس کا شکار بتایا ہے اور بہادر شاہ کے زمانہ میں اس کی عمومیت پر ایک گاف مردانامہ لکھا ہے۔ (میں نے گاف لکھا ہے انھوں نے صاف لکھا ہے) یہ گاف مردانامہ ان کے کلیات میں موجود ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

پان کھا کر گاف مروا کھیلئے باغ جا کر گاف مروا کھیلئے
بادشاہی ہے بہادر شاہ کی بن بنا کر گاف مروا کھیلئے
وقت آں آمد کہ در ہر بھیڑ کھاٹ گھس گھسا کر گاف مروا کھیلئے
عطر مل کے جو ترٹوں کے بیچ میں مل ملا کر گاف مروا کھایئے

عطر ملتا بتاتا ہے کہ طبقہ امراء میں یہ ذوق پھیل گیا تھا۔

دہلی کے مشہور امرد پرست محمد شاہ کے زمانے میں یہ حالت ہوگئی تھی کہ جس طرح دوسرے شہروں میں امراء رنڈی بازی میں شہرت رکھتے تھے اسی طرح دہلی کے امراء امرد پرستی میں مشہور تھے خان اعظم کے متعلق صاحب مرقع دہلی لکھتے ہیں:

"بمقتضائے رنگینی مزاج اور بہار راگ ہندوستان کے مطربوں میں ممدوح ہیں۔ ان کی طبیعت امرد پسند ہے سادہ رویوں کی محبت میں گرفتار ہیں اپنی جاگیروں کی ساری آمدنی ان پر صرف کرتے ہیں۔ جہاں کسی امرد رنگین کی خبر پاتے ہیں اس کی حسب خواہ رعایت کرکے رفاقت کی کمند میں پھانس لاتے ہیں۔ اس گروہ کی ایک جماعت ان کی حسن سعی سے مناسب مناصب پر فائز ہو کر ان کی انیس بساط ہے اور ایک جماعت مراعات خانگی پر اکتفا کرکے محفل نشاط کو رنگین بنائے ہوئے ہے سواری کے ساتھ بڑی شان و شکوہ سے گھوڑوں پر سوار ہو کے چلتے ہیں۔ غرض جہاں کوئی سبزہ رنگ نظر آتا ہے خان اعظم سے منسوب ہے اور ہر نوخط اس عظیم الشان سے وابستہ ہے۔" ص ۲۷

ایک دوسرے رئیس مرزا منو کے متعلق لکھتے ہیں۔

"مرزا منو جو امیر زادہائے زمانہ میں ہیں اس فن کی جادوکاری میں یگانہ ہیں۔ امیر زادے اس فن کی گھاتیں ان سے سیکھتے ہیں اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں وہ اس محفل کے صدر ہیں ان کی بزم غلمان صورت سے منتظم ہیں ان کا

گھر شداد کی بہشت اور پریزادوں کا آشیانہ ہے جو نوخط رنگین اس محفل سے ربط نہیں رکھتا وہ فرد باطل ہے اور جو رنگین اس مجمع میں شریک نہیں بے اعتبار ہے ان کی محفل شاہدوں کا دار العیار ہے۔ ص ۲۷

میرن صاحب کا حال سنئے:-

"میرن صاحب وزیر الممالک کے یہاں معزز و محترم ہیں تلاش مردم حسین میں طرفہ مہارت رکھتے ہیں۔ ہر روز ایک نیا لڑکا پھانس لاتے ہیں۔ ص ۳۴

دہلی میں امارد کے اڈے رنڈیوں کے اڈوں کی طرح دہلی میں لڑکوں کے اڈے تھے قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں:-

شام کے وقت حسین و خوبرو اور ملیح لڑکے ان (تاباں) کے مکان پر جمع ہوتے تھے ان کو زیورات سے آراستہ و پیراستہ کیا جاتا تھا اس کے بعد امرائے قزلباش کے طلب کرنے پر محافوں میں بٹھا کے اعلام کرانے کے لئے مہمان جاتے تھے وغیرہ!

دہلی کے مشہور امرد دوسرے شہروں کی رنڈیوں کی طرح دہلی کے امارد مشہور تھے۔ صاحب مرقع دہلی کا بیان ہے:-

اللہ بندے سبزہ آغاز متناسب الاعضا لوگوں کا منظور نظر اور مقصود خاطر ہے۔ رحبے امرد سیہ فام ہے:-

ہنگامہ پیرا سیاں ہنگا کسی کے یہاں نہیں جاتا۔ اس کا شیفتہ خود اس کے گھر جاتا ہے سلطانہ سبزہ رنگ دس بارہ سال کا سن ایک عالم کو مفتون اور ایک

خلقت کو مجنون بنائے ہوئے ہے۔ سر میں روپے کے
ماتھے کی چمک نظروں کو خیرہ کرتی ہے۔ بڑی مشکل
سے ہاتھ آتا ہے (مرقع دہلی ص۸۱)

حد یہ ہے کہ علماء و فقہاء اور صوفیا بھی اس میں مبتلا تھے۔ مرزا مظہر جانجاناں کے متعلق صاحب تذکرۂ علماء ہند لکھتے ہیں۔

"دانشمند متبحر جامع فضائل صوری و معنوی بود اکتساب علوم از علمائے وقت نمودہ و حدیث از حاجی محمد افضل سیالکوٹی اخذ کردہ و شرف ارادت و خلافت از حضرت سید محمد نور بدایونی مرید و خلیفہ شیخ سیف الدین مرید .... مرید و خلیفہ شیخ محمد معصوم عروۃ الوثقیٰ مرید و خلیفہ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی یافتہ ص۲۲۷

یہ فضائل صوری و معنوی سے آراستہ اور تقویٰ و خلافت سے پیراستہ بزرگ امرد پرست تھے۔ تذکرۂ گلزار ابراہیم میں لکھا ہے:۔

"حسن پرستی سے دلبستگی تمام رکھتے تھے اور عشق حقیقی و مجازی سے کام انعام اللہ خاں صاحب یقین اور خلیفہ دردمند ان کے شاگردان رشید سے کہاتے ہیں اور میر عبد الحی تاباں علیٰ ہذا القیاس اسی طرح گنے جاتے ہیں۔ ص۲۱۴

انعام اللہ خاں یقین کے حالات میں بھی اس کا ذکر ہے۔

منظور نظر مرزائے مذکور ص۳۶

محمد فقیہ دردمند کے حالات میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

"منظور کردۂ مرزا مظہر جانجاناں

عبد الحئی تاباں کے ذکر میں بھی ان کے اس تعلق کا ذکر ہے۔

"ان کا عشق مظہر کے دل میں گھر کر گیا تھا"

تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا میں مرزا صاحب کے متعلق لکھا ہے۔

"میر عبد الحئی تاباں کی محبت میں زار و نزار تھا۔

شیفتہ نے مرزا صاحب کے اس ذوق کا واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

"برعنا جوانان نظرش بود۔

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں عبد الحئی تاباں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے:۔

"تاباں تخلص میر عبد الحئی نام۔ شاہجہاں آبادی نہایت عزیز و خوبصورت اور صاحب جمال تھا۔ دلی سے شہر میں بے مثال تھا۔ ہندو مسلمان ہر گلی کوچہ میں ایک نگاہ پر اس کی لاکھ جان سے دین و دل نثار کرتے تھے اور پرے کے پرے عاشق جانباز کے یاد میں اس لب جاں بخش مسیحا دم کے مرتے تھے۔ بے تکلف یوں ہے کہ اس رعنائی اور دلربائی پر خود بدولت بھی دل کھو بیٹھے تھے ___ اس لیلیٰ صفتی پر مانند مجنوں ہمیشہ سرگرم فریاد و آہ رہتے تھے یعنی سلیمان نامی ایک لڑکے کو چاہتے تھے اور اس کی محبت میں باوجود وصل کے آٹھ پہر کراہتے تھے"۔

مرزا سودا کو بھی ان کے عاشقوں کی فہرست میں لکھا ہے۔

"بلکہ مرزا رفیع سودا ابتدا بر یک نظر توجہ اکثر اشعار کو ان کے اصلاح کرتے تھے۔ ص۱۶۹

میر احمد یار بھی اسی طرح کے معشوقوں میں تھے۔ تذکرہ میر حسن میں ان کے متعلق یہ لکھا ہے:۔

"جوانے بود باکمال وجاہت کہ یوسف ثانی تواں گفت و ران زمانہ عالم عالم فریفتۂ رخ نیکو و شیفتۂ زلف از بود در وقت احمد شاہ ہنگامۂ حسن او گرم بود این ہمہ شعرائے متاخرین مانند پروانہ دل خود را بر شعلۂ حسنش می سوختند و او نیز با اینہا صحبت می داشت ـــــ میر ضیا سلمہ نظر الفت داشتند چنانچہ تا حال بہ وقت کہ یاد او می کنند می گریند۔

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں ان کا ذکر انھیں اوصاف کے ساتھ ہے

"احمد یار جوانے نہایت زیبا شاگرد میر تقی میر و محبوب میر ضیا در زمان احمد شاہ جمیع شعرائے تعلق بوے داشتہ اند۔"

میر حسن کے تذکرے میں ایسے بہت سے لوگوں کا ذکر ہے۔

"جعفر علی خاں ذکی :۔ بہ سوائی رام راجہ بود بر و تعشق داشت"

محمد افضل افضل "بر کدام ہند و بچہ گوپال نامی بود کہ عاشق شد"

نور اللہ :۔ "بر یک فرنگی بچہ تعشق بہم رسانیدہ"

میر رضا علی رضا :۔ بر شخصے وہب علی عاشق است

محمد عظیم عظیم :۔ بر سادہ عذاراں شیدا"

میر سنیگا :۔ بر شخصے تعشق داشت۔

صلاح الدین پاکباز :۔ "بر سوہنا نامی شخص کہ قوال بچہ بود نظر الفتے می داشت"

تذکرۂ گلزار ابراہیم میں ایسے بہت سے پاکبازوں کا ذکر موجود ہے۔

مہتاب رائے زینت :۔ "بر منوں (جوہری بچہ) نامی عاشق شدہ"

محمد چاند درخشاں :۔ بر زعفران نامی عاشق شدہ"۔

مصحفی نے اپنے تذکرے میں فدوی کے متعلق لکھا ہے:۔

"قدم در راہ امرد پرستی گزاشتہ چند جا خانۂ جنگی ہم کردہ بکودکان حسین تعشق ورزیدہ"

"میر تقی میر نے ذکر میر میں ابدالی کے حملہ سے دہلی کی تباہی پر تاسف کے ساتھ اس پر بھی افسوس کیا ہے کہ بازاروں میں وہ حسین لڑکے اب دکھائی نہیں دیتے اس کے معنی یہ ہیں کہ دہلی میں اس طرح کے لڑکے بازاروں میں عام طور پر گھوما کرتے تھے۔ چوک سعد اللہ خاں اس کا بڑا اڈہ تھا۔ صاحب مرقع دہلی کا بیان ہے کہ:۔

رقص امارد و خوش رو سے قیامت آباد ہے اطراف و اکناف نوخط لڑکوں سے بھرے پڑے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ لڑکے جہاں آباد کے کہ شہر پر کہتے ہیں ناز ہو جاتے ہیں بغل میں اشارہ کیا جہاں

میر کو طفلان تہہ[۱] بازاری میں ۔۔۔ دیکھو شاید وہیں وہ گلفروش

گر ٹھہرے فلک آگے انھوں کے تو عجب ہے ۔۔۔ پھرتے ہیں پڑے دلی کے لونڈے جو پری سے

لڑکے دلی کے ترے ہاتھ میں کب آئے میر ۔۔۔ پیچھے اک ایک کے سو سو کئی لگے ڈالے پھرے

میر غفر غنیمی کی وہ مشہور گفتگو جس میں انھوں نے شعراء پر تنقید کی ہے اس میں انشا کو یہی طعنہ دیا ہے۔

"آگے تنہا زاد (پری زاد) تھے ہم بھی گھو غنے (گھورنے)
جاتے تھے اب شاعر (شاعر) بن گئے ہیں (دریائے لطافت)

۱؎ تہہ بازار۔ بازار میں تجارت کے لیے بیٹھنے والے۔ اسی سے تہہ بازاری ہے یعنی وہ محصول جو تہہ بازاروں سے وصول کیا جائے۔

اخلاقی پستی کی حد یہ ہے کہ اشار کو طعنہ تو دے رہے ہیں لیکن اپنی دلبستگی کا کس بلند آواز سے اظہار ہے۔ اور طرہ یہ کہ اس کے ناقل خود بھی اشعار

ملا دو پیازہ | احمد شاہ کے دور میں ملا عبد المومن دہلوی جو ملا دو پیازہ کے نام سے مشہور ہیں جید عالم تھے اور بہت ظریف الطبع تھے انھوں نے ایک فرہنگ لکھ کے اس وقت کی سیاسی اقتصادی تمدنی اور معاشرتی حالات کی تاریخ مرتب کر دی ہے چند لفظیں ملاحظہ کیجیے:۔

البادشاہ	کاہل زبان	الوزیر ۔	ہنر ہیزآہ بیچارگاں
النواب ۔	مجموعۂ قفل	الامیرزادہ ۔	کون دہندہ بہ بوس
الغلام ۔	مشتاق طعام	الامرد ۔	رہنمائے شہوت
التیز دو ۔	نوکر ماہیانہ تا شخص	البیوقوف ۔	کردری دیانت دار

الامیرزادہ کے جو معنی لکھے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے اس زمانہ میں دہلی کے امیرزادوں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اس کی تائید میر تقی میر کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

مست مل اہل دول کے لڑکوں سے ۔۔۔ میر جی ان سے مل فقیر ہوئے

مولانا شبلی نے سچ کہا ہے کہ "جب کوئی عیب سوسائٹی میں عام ہو جاتا ہے تو وہ عیب نہیں رہتا" اس زمانے میں امرد پرستی اتنی عام ہو گئی تھی کہ اسے عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شعراء بڑی بیباکی سے اس کا اظہار کرتے تھے ؎

زبس ہم کو نہایت شوق ہے امرد پرستی کا ؎ جہاں جاویں وہاں ایک آدھ کو ہم تاک رکھتے ہیں

ہر ایک سبزہ ہے ہندوستاں کا معشوق ۔۔۔ بجا ہے نام جو عالم رکھا ہے کھیروں کا

جو لونڈا اتام سن امرد پرستی کا چڑھے چونکے ۔۔۔ میں اس کو بیچ دے باتوں میں جاتا ہوں جو للاسا لگ

رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تلک بہلا ۔۔۔ چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے ۔۔۔ کام عشاق کا تمام کیا (پیام)

دل لیکے لوٹے دلی کے کب بچا گئے ۔۔۔ اب ان سے کھائی پی ہوئی شئے کیا چھوڑے (میر)

کیا لڑکے دلی کے ہیں عیار اور نٹ کھٹ ۔۔۔ دل لیتے ہیں یوں کہ ہرگز نہیں ہوتی آہٹ

کیا کیا نہ لوگ کھیلتے جاتے ہیں جان پر ۔۔۔ الحفاظ شہر لائے ہیں آفت جہان کے (ر)

کیا میر تو روتا ہے پامالی دل ہی پر ۔۔۔ ان لونڈوں نے تو دلی سب سر پہ اٹھا لی ہے (ر)

شہر کے شوخ سادہ رو لڑکے ۔۔۔ ظلم کرتے ہیں کیا جوانوں پر (ر)

تھے زمانے میں جن کے خرچے روپے ۔۔۔ ٹھا نسا کرتے تھے ان کو آنوں پر (ر)

فراق گورکھپوری نے سچ کہا ہے:۔

"دہلی میں عشق کو صرف تنہائی ملتی ہے اور زیادہ تر امرد پرستانہ جذبات کے تجربے۔" رسالہ نگار ریاض ص ۹۳

بے حیائی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ایک رنڈی اُدھ بیگم پیجامہ نہیں پہنتی تھی نچلے حصہ پر نقش و نگار بنا کے برہنگی کی کراہت کم کرتی تھی اس کو قبول عام حاصل تھا اور ہر محفل میں اس کی جگہ تھی۔ اس فضا میں کوئی بات سنجیدہ اور مہذب کس طرح رہ سکتی تھی۔ اس دور کا کلام اس وقت کے معیار تہذیب و تمدن کا آئینہ ہے۔

ان لوگوں نے اپنے آخری زمانے میں اصلاح زبان کی طرف توجہ کی بہت سی ناگوار لفظیں۔ ستی۔ سیتی۔ سین ترک کر دیں الفاظ کی صحت ضروری قرار دی جیسے تسبی سے تسبیح صبی سے صبح اس پر بھی بقول مصنف شعرالہند۔ "ان کی زبان مبتذل اور مکروہ الفاظ کا مجموعہ ہے"۔

دہلی پر دوسرا حملہ

دہلی میں اس چنگ و آہنگ کے دور (۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء) میں نادر شاہ بلائے آسمانی کی طرح نازل ہوا محمد شاہ نے دو لاکھ فوج سے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ تین دن تک دلّی میں قتلِ عام رہا ستر کروڑ کا سامان اور تخت طاؤس لے کے واپس ہوا شہر اس طرح برباد ہوا کہ مدتوں آباد ہونے کی امید نہ رہی ٹیک چند بہار جس نے اپنی آنکھوں سے دہلی کو لٹتے دیکھا تھا بیان کرتا ہے۔

"درین ایام کہ در نہایت کیفیت و لطافت ہر کوچہ چون لعبت بنفشہ مویان دل آویز و ہر محلہ اش برنگ نفس بلبلاں شور انگیز بود گردیدہ از یورش قلموقی ہائے تقدیر این گونہ چشم زخمے رسیدہ اکثر مانند زلف بتاں عمر طویلے می باید کہ دار العشق بحالت اصلی در آید"

اسی ہنگامے میں اودھ کے صوبیدار برہان الملک نے دہلی میں انتقال کیا اور ان کے داماد مرزا مقیم صفدر جنگ کو اودھ کا صوبہ ملا۔

دہلی پر تیسرا حملہ

اس حملہ سے دہلی ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی ہر طرف بدامنی اور غارتگری کا دور دورہ تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء میں حملہ کیا مرزا مقیم صفدر جنگ شہزادہ احمد کو لے کے مقابلہ کو روانہ ہوئے۔ سرہند کے مقام پر معرکہ کارزار گرم ہوا سترہ دن کی سخت جنگ کے بعد ابدالی کو شکست دی۔ شہزادہ احمد کامیاب واپس ہوا پانی پت کرنال میں محمد شاہ کے مرنے کی خبر ملی صفدر جنگ نے بانس کی کھپچیوں کا تاج بنا کے موتیوں کی جھالر لگائی اور شہزادہ احمد کے سر پر رکھ کر ان کی شاہی کا اعلان کیا احمد شاہ نے ان کو وزارت عظمیٰ پر سرفراز کیا اور دہلی روانہ ہوئے۔

غازی الدین خاں

اب امراء اور صفدر جنگ میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی کچھ دنوں کے بعد بادشاہ کی نظریں بھی ان سے پھر گئیں اور وہ

اپنے صوبہ پر واپس چلے آئے۔ غازی الدین خاں نے میدان صاف کے بادشاہ پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کی انھوں نے پھر صفدر جنگ کو بلوایا مگر وہ بیماری کی وجہ سے نہ جا سکے۔ غازی الدین خاں نے ناکارہ اور بے دست و پا بادشاہ کو قید کر کے آنکھوں میں سلائیاں پھروا دیں۔

عالمگیر ثانی

۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۴ء میں عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھا کے سیاہ و سفید مالک بن گیا اسی سال صفدر جنگ کا انتقال ہوا اور شجاع الدولہ جانشین ہوئے۔

غازی الدین خاں بادشاہ کو لے کے پنجاب گیا اور ابدالی کے صوبیدار موسیٰ خاں کی ناکتخدا بہن سے نکاح کیا اور اس کی ماں سے زبردستی تیس لاکھ روپے وصول کر کے پنجاب کی صوبیداری ادینہ بیگ کو دے کے واپس ہوا۔

دہلی پر چوتھا حملہ

ابدالی کو خبر ہوئی تو وہ ہندوستان آیا اور دہلی کو دو مہینے تک لوٹتا رہا اس طرح کہ :-

"شہر را آتش نمودہ خانہا سوختند ـــــ بقتل و غارت پرداختند دروازہا شکستند اکثرے را سوختند و سر بریدند عالمے را بخون و خاک کشیدند تا سہ شبانہ روز دست ستم بر نہ داشتند از خوردنی و پوشیدنی ہیچ نگذاشتند سقفہا شگافتند دیوارہا شکستند جگر ہا سوختند وحشت بسیار تاں بردرو بام اکابران بے سیرتی تمام شیخان شہر را بحال خراب بزرگان محتاج دم آب گوشہ نشینان بے جا شدند اعیان ہمہ گدا شدند وضیع و شریف عریان گدایان بے خانماں اکثر بہ بلا گرفتار سوائے کوچہ و بازار ۔ ۔ ۔ ۔ ہفت ہشت روز این ہنگامہ گرم بود من کہ فقیر بودم فقیر تر شدم عالم از بے اسبابی و تہیدستی ابتر شد (ذکر میر)

ابدالی نے محمد شاہ کی بیٹی سے شادی کی غازی الدین خاں کو وزارت سے معزول کرکے روہیلہ سردار نجیب اللہ خاں کو وزیر اعظم بنا کے واپس ہوا اس کے جاتے ہی غازی الدین خاں نے مرہٹوں کی مدد سے دہلی پر چڑھائی کی نجیب الدولہ بھاگ کے اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ شاہزادہ عالی گوہر بنگال کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے مرہٹوں کی خوشامد سے اپنی شاہی برقرار رکھی اب پھر غازی الدین نے مرہٹوں کو لے کے پنجاب کو لوٹا اور وہاں مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا اس طرح ہندوستان کے اکثر صوبے مرہٹوں کے قبضے میں آگئے۔

دہلی پر پانچواں حملہ ۱۱۷۴ھ | روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں نے ساری امداد احمد شاہ کو لکھی اور اسے ہندوستان کی حکومت سنبھالنے کی دعوت دی اس نے حملہ کیا غازی الدین خاں سمجھا کہ عالمگیر ثانی نے مرہٹوں کے خلاف ابدالی کو بلایا ہے اس نے بادشاہ کو قتل کرکے لاش جنگل میں پھنکوا دی خود روپوش ہوگیا۔ اور ابدالی سے پانی پت کے میدان میں وہ تاریخی مقابلہ ہوا جس میں مرہٹوں کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا بے شمار مرہٹے مارے گئے۔

ابدالی دہلی کا تخت خالی چھوڑ کے واپس ہوا اب دہلی سکھوں، مرہٹوں، روہیلوں۔ جاٹوں اور پنڈاریوں کی لوٹ مار کا مرکز بن گئی یہ لوگ سمجھتے تھے کہ دلی والوں کے گھر دولت سے بھرے ہیں ان پر اتنی سختیاں کیں کہ آسمان کانپ گیا۔ مرہٹوں نے دیوان عام کی سونے کی چھت اکھاڑ لی۔

شاہ عالم | بادشاہ کے قتل کی خبر سن کے اس کے بیٹے عالی گوہر نے ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء میں اپنی شاہی کا اعلان اور شاہ عالم لقب اختیار کیا ہے۔ اس وقت وہ بہار کے ایک موضع کھٹولی میں خیمہ زن تھا۔

بکسر کی جنگ | انگریزوں کا اقتدار بنگال میں قائم ہوچکا تھا بہار میں

پٹنہ تک ان کا قبضہ تھا۔ میر قاسم کو وہ بنگال سے نکال چکے تھے وہ شجاع الدولہ کے پاس مدد مانگنے آئے تھے۔

شاہ عالم نے پٹنہ سے انگریزوں کو نکال کے اس پر قبضہ کرلیا مگر انگریزی فوجوں نے آکے ان کو شکست دے دی۔ شجاع الدولہ میر قاسم کو لے کے شاہ عالم کے پاس پہنچے اور بکسر کے مقام پر ۱۱۷۸ھ ۱۷۶۴ء میں معرکہ ہوا جس میں شکست کھائی۔ شاہ عالم انگریزوں کے کیمپ میں چلے گئے اور ان سے معاہدہ کرکے بنگال و بہار اڑیسہ کی دیوانی اور بنارس و غازی پور تک۔ ایک تہائی حکومت کی سند ان کو دے دی اور خود الہ آباد میں آکے مقیم ہوگئے۔

شجاع الدولہ مرہٹوں کو لے کے پھر انگریزوں کے مقابلہ پر آئے جس میں صلح ہوئی انگریزوں نے ان کا ملک چھوڑ دیا اور انھوں نے فیض آباد میں قیام کرکے اپنے کو ایسا مضبوط کیا کہ جو امن و امان اور خوشحالی یہاں تھی وہ ہندوستان میں کہیں نہ تھی۔

دہلی سے پنجاب تک مرہٹے پھیلے اور لوٹ مار مچائے تھے۔ ہر طرف سے لوگ فیض آباد کی طرف بھاگے چلے آرہے تھے اور شجاع الدولہ انھیں آباد کرنے میں فخر اور مسرت محسوس کر رہے تھے۔

نجف خاں | ۱۷۷۱ء میں نجف خاں ایک ایرانی امیر بادشاہ کا وزیر اعظم ہوا۔ اس نے حالات کی درستی کی بہت کوشش کی بادشاہ کو دہلی لایا اہل دہلی جو اس وقت تک بے بادشاہ کے ہر قوم کی لوٹ مار کا نشانہ بنے ہوئے تھے ان کی جان میں جان آگئی۔

نجف خاں نے جاٹوں سکھوں اور روہیلوں کو زیر کیا اور مرہٹوں

اور انگریزوں سے تعلقات بڑھائے شہر میں امن قائم ہوا لیکن سنہ ۱۱۹۶ھ میں وہ مرگیا۔

پیشوا اور سندھیا اب پیشوا وزیر اعظم اور سندھیا نائب وزیر بنا بادشاہ کے خرچ کے لیے پینسٹھ ہزار ماہوار مقرر کر دیا وہ مرہٹوں کے وظیفہ خوار بن گئے۔

دہلی پر چھٹا حملہ روہیلوں کو مرہٹوں کا یہ اقتدار کب گوارا ہو سکتا تھا غلام قادر خاں نے دہلی پر حملہ کیا شاہی فوج مرہٹوں سے ناراض تھی وہ روہیلوں کے ساتھ ہو گئی اور قلعہ پہ قبضہ ہو گیا غلام قادر نے چاہا کہ متھرا پر فوج کشی کر کے مرہٹوں کی طاقت کا خاتمہ کر دے سیتل داس خزانچی نے خزانہ خالی بتایا غلام قادر نے شاہ عالم پر سختی کی کہ روپیہ قبولیں مگر وہاں روپیہ کہاں تھا پہلے اس نے قید کیا پھر لاتوں گھونسوں سے مارا جب کسی طرح نہ قبولے تو سینے پر چڑھ کے آنکھیں نکال لیں بیگموں کو طمانچے مار مار کے لہولہان کر دیا۔ شہزادوں اور امیروں کو الٹا کر کے ٹنگوا دیا اور دو پشتوں کی گڑی ہوئی دولت قبولوا کے تہہ خانے اور چھتیں کھدوا کے نکال لی۔

دہلی پر ساتواں حملہ شاہ عالم نے انگریزوں مرہٹوں اور آصف الدولہ کو امداد کے لیے لکھا آصف الدولہ نے ایک فوج اور کچھ رقم بھیجی ادھر سے سندھیا فوج لے کے آیا غلام قادر خاں بھاگ گیا مگر گرفتار ہوا پہلے اس کو گدھے پر سوار کر کے ایک ایک کوڑی بھیک منگوائی اس کے بعد زبان کٹوائی پھر آنکھیں نکالیں پھر ناک کان کٹوائے آخر میں ہاتھ پاؤں کٹوا کے لوتھڑا بادشاہ کے پاس بھیجا مگر وہ راستے ہی میں مر گیا لاش دہلی پہنچی جو گھورے پر پھنکوا دی گئی۔

ان ہنگاموں میں دہلی بار بار لٹتی رہی اور اہل دہلی پہ دہاں کی زمین تنگ ہو گئی پوتڑوں کے رئیس روٹیوں کو محتاج ہو گئے انتشار کا بیان ہے کہ دہلی میں کم تر لوگوں کو نان شبینہ میسر ہوتی ہے۔ مثل مشہور تھی۔

شاہ عالم ثانی نہ چولھے پہ توا نہ گھڑے میں پانی

ادھر لکھنؤ میں چین برس رہا تھا اہل کمال سر اور آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ ہر طرح کے صاحبان فن وہاں چلے آئے اور دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب (میر) اس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا

اس دور میں میر۔ سودا۔ سوز۔ درد اور اثر ایسے اساتذہ پیدا ہوئے ان کا کلام اس وقت کے حالات کی تصویر ان کی پریشانی خوف و ہراس اور مردہ دلی کی تفسیر ہے ؎

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے — ان کو اس روزگار میں دیکھا — میر
شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا — "
سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا — درد
وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا — یعنی کبھو تو آپ میں بھی دل دماغ تھا — "
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے — "
جہاں کو فتنے سے خالی کبھی نہیں پایا — ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا — "

عاشقانہ مضامین بھی نہایت گھٹیا درجے کے مفلس عاشق و معشوق کی تصویریں ؎

یاد آتا ہے ترے یار کی ایسی تیسی — آج آتا ہے ترے یار کی ایسی تیسی — سوز
جو کرتا ہوں فریاد میں اس کے آگے — تو کہتا ہے تاباں تو جاتا نہیں ہے — تاباں
ابھی پست ہو جا گا لاتوں کے مارے — ترا شور کچھ مجھ کو بھاتا نہیں ہے — "

ابتذال کی حد ملاحظہ کیجیے ؎

سر سبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا — آخر خزاں نے کچھ نہ اکھاڑا بہار کا — سوز
دعا دی تو کہنے لگا دور ہو! — سنی میں نے دعا تیری دعا کی — "

کہا میں نے کہ کچھ خاطر میں ہو گا   تمہارے ساتھ جو میں نے وفا کی   سوز
تو کہتا ہے کہ بس بس جو پیچ کر بند   وفا لایا ہے دت تیری وفا کی ″

سندھیا | سندھیا نے بادشاہ کو دوبارہ تخت پر بٹھایا کاروبار سلطنت اپنے ہاتھ میں لئے نو لاکھ سالانہ شاہی مصارف کے لئے معین کر دیے اور فی الجملہ دہلی میں امن قائم ہو گیا۔

بادشاہ نابینا انتظام سلطنت کے قابل کبھی نہ تھے ہاں شاعر تھے اُردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے لکھنؤ کے بعض امرا سیاسی وجوہ سے دہلی چلے گئے تھے اور شعر و سخن کی محفل جمائے ہوئے تھے ان میں شجاع الدولہ کے بیٹے امین الدولہ ناصر جنگ عرف مرزا مینڈھو کے مشاعروں کی بڑی دھوم تھی۔ بڑا اہتمام ہوتا تھا ختم مشاعرہ پر دعوت عام ہوتی تھی ان مشاعروں میں بڑی رسا کشی ہوتی تھی ایک طرف انشاء اللہ خاں انشا برکت اللہ مشتاق تھے دوسری طرف حکیم قدرت اللہ قاسم حکیم ثناء اللہ فراق مرزا عظیم اکثر تلواریں کھنچ جاتی تھیں اور نواب بیچ میں پڑ کر صلح کراتے تھے۔ بادشاہ سلامت بھی اپنی غزل بھیجتے تھے ان کے درباری شاعر انشا جرأت رنگین تھے جن کی شاعری خوب چمکی ان کے یہاں حزن و یاس نامرادی اور ناکامی نہیں کیونکہ دہلی کے حالات بدل چکے تھے چھچھورے اور بازاری قسم کے مضامین نظم کئے جاتے تھے۔

ادا جان لیتی ہے جانی تمہاری   غضب ڈھا رہی ہے جوانی تمہاری
یار آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا   چمپئی رنگ اس کا اور جوبن گدرایا ہوا ″
اس شوخ سے کیا کیجئے ملاقات کہیں اور   دل کو تو معلوم ہے رہو رات کہیں اور ″
دیکھیے بوسہ مجھے چتون میں بتاتا ہے شوخ   ایسا پایا ہے بھلا تو نے مزہ اور کہیں ″

یاد آتا ہے وہ میرا لگے جانا اور آہ   ہنستے ہنستے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آ جائے گا
یاد جب آتا ہے رکھنا تو اڑ جاتی ہے نیند   اپنی ہٹ تو رکھ چکے لو اب تو ہٹ کر سوئیے ″
تک چلا میں جو شب وصل تو ہٹ کر بولے   جھانکتا روزن در سے نہ ہو بیٹھے ہے کوئی ″
دو تین دن تو ہو چکے اب پھر چلو وہیں   فیروز شہ کی لاٹ کے اس جو سنتے تھے کھنڈر پہ آج

امرد پرستی کے مضامین جو ہر دور میں رہے ہیں وہ ان بیہودہ گوئیوں کے علاوہ ہیں ۱۲۰۳ھ تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد یہ شعرا بھی لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

دہلی پر آٹھواں حملہ | چودہ برس تک شاہ عالم اسی عالم میں رہے ۱۲۱۸ھ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک فوج لے کے آیا اور مرہٹوں کو نکال کے ایک لاکھ روپیہ ماہوار بادشاہ کا وظیفہ مقرر کر دیا اب "سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم" رہ گئی۔ شہر میں مکمل امن قائم ہوا چہل پہل پیدا ہوئی۔ مگر شعرا سب لکھنؤ چلے آئے دہلی میں کوئی قابل ذکر شاعر نہیں رہ گیا۔

لکھنؤ میں سعادت علی خاں حکمراں تھے میر تقی میر۔ مصحفی۔ انشا جرأت رنگین زندہ تھے آتش فیض آباد میں تھے اور کمسن تھے۔

دہلی میں ذوق تیرہ برس کے، غالب پانچ برس کے اور مومن تین سال کے تھے۔

لکھنؤ میں ناسخ کا ڈنکا بج رہا تھا مولانا عبدالقادر رامپوری اس زمانے میں لکھنؤ آئے تھے وہ اپنے سفر نامہ میں لکھتے ہیں۔

"شیخ امام بخش ناسخ کو ان دنوں اس میں دن دونی شہرت حاصل تھی ص ۱۶۰"

انھوں نے زبان و شاعری میں ایسی ایسی اصلاحیں کیں جس سے اس میں سنجیدگی اور حسن پیدا ہو گیا اور سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی۔

مصحفی ایسے کہنہ مشق استاد نے ان کی تقلید کی۔ غالب کا بیان ہے کہ میری شاعری کی ابتدا تھی جب ناسخ کا دیوان دہلی پہنچا جس طرح دہلی کے دیوان کی دھوم مچ گئی تھی اسی طرح لوگ ناسخ کے کلام پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے اور مومن نے ان کا اتباع کیا (جلوۂ خضر) ناسخ کے اتباع سے ذوق۔ غالب اور مومن کے کلام میں شائستگی پیدا ہوئی مگر کچھ بھونڈا پن باقی رہا جس کا خود غالب نے اعتراف کیا کہ "میرے کلام میں جو محاورے غیر فصیح ہیں وہ دہلی کی زبان کا اثر ہیں" شاعری میں بھی ایسی باتیں باقی رہ گئیں جنھیں ذوقِ سلیم برداشت نہیں کر سکتا مومن کا یہ شعر زبان اور مفہوم دونوں کے بے ڈھنگے پن کی اچھی مثال ہے ؎

سن کے میری مرگ بولے مر گیا اچھا ہوا
کیا برا لگتا تھا جس دم سامنے آ جاتا تھا

معشوق کو رقیب نے سیم بر کہا تو اس نے پستان کھول کے دکھا دیے اس پر عاشق صادق نے اس کی قباحت سمجھائی۔

غیر کو سینہ کھول کے سیم بر کہلا دیا
تم نے کیا کچھ کسی کو اپنی بات پر کھلا دیا

عاشق کی بے غیرتی اور پست فطرتی کی حد دیکھیے ؎

ہے شب وصل غیر بھی کاٹی
اب مجھے آزمائے گا کب تک

ہوں میں وہ سبزہ کہ زہر آب اگاتا ہے مجھے — غالب

بد مذاقی کا شاہکار ہے ؎

پروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

لطف زبان اور حسن معنی کا نادر نمونہ ہے

گر نفس جادہ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

اس میں تقوی راضی کا قافیہ اور بد ذوقی کی ایسی مثال ہے جس کا جواب اردو شاعری میں نہیں ہے۔

دہلی پر لوٹ کا حملہ دہلی میں بہادر شاہ ظفر لکھنؤ میں واجد علی شاہ اختر کا دور تھا اور ناسخ و آتش کے شاگردوں کا ڈنکا بج رہا تھا۔ لکھنؤ میں انتزاع سلطنت ہوا اس کے بعد ہندوستان میں غدر ہوا۔ رہی سہی دہلی پھر لٹی ہزاروں بے گناہ جس طرح مارے گئے اس کا ایک دن کا نظارہ لارڈ رابرٹس بیان کرتا ہے۔

"ہم صبح کو لاہوری دروازے سے چاندنی چوک میں گئے تو ہم کو شہر حقیقت میں مردوں کا شہر نظر آتا تھا کوئی آواز سوائے ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کے سنائی نہ دیتی تھی کوئی زندہ آدمی نظر نہ آیا ہر طرف مردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا جن میں بعض حالت نزع اور جانکنی میں مبتلا تھے ہم چل رہے تھے تو بہت آہستہ آہستہ بات کرتے تھے کہ ہماری آواز سے مردے چونک نہ پڑیں۔ اس بات کے دیکھنے سے کہ ایک طرف مردوں کی لاشوں کو کتے کھا رہے ہیں۔ دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گدھ جو ان کے گوشت کو نوچ کر مزے سے کھا رہے ہیں اور ہماری آمد کی آواز سے کچھ اڑ کر تھوڑے فاصلے پر جا بیٹھتے ہیں ہم کو بڑی عبرت ہوئی اور ہمارا دل رنجور ہوتا جاتا تھا بہت سے مردے ایسے پڑے تھے کہ گویا زندہ ہیں بعض مردوں کے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی طرف اشارہ کر رہے ہیں غرض ان مردوں کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی جیسے ہم کو انکے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا ویسے ہی ہمارے گھوڑے ان کو دیکھ کر

بدکتے اور ہنہناتے تھے مُردوں کی لاشیں پڑی تڑپتی تھیں ان
کے تعفّن سے ہواسیں بیمار کرنے والی بدبو اٹھ رہی تھی۔"

ایک اور انگریز لکھتا ہے۔

" دہلی کے باشندے اگرچہ سب نہیں مگر آدھے باشندے بے تصور
شہر کے گرد و نواح دیہات اور جنگلوں میں پڑے ہوئے بلک
رہے ہیں۔ نقوش ۱۹۵۶ء مرتبہ میاں محمد شفیع صفحہ ۲۱۷ تا ۲۱۸

ہندوستانیوں کا خون اس طرح بہانے کے بعد جب انگریزوں کا کلیجہ
ٹھنڈا ہوا تو شہر کی آرائش کی طرف متوجہ ہوئے محلہ کے محلے اور بازار کے بازار
ڈھانے لگے اس سے بچے کھچے لوگوں کا ٹھکانا بھی نہیں رہا۔ مرزا غالب نے اپنے
خطوط میں دہلی کی اس تباہی کا نقشہ جابجا کھینچا ہے چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

یہاں شہر ڈھے رہا ہے بڑے بڑے بازار خاص بازار
اُردو بازار اور خانم بازار کہ ہر ایک بجائے خود ایک قصبہ
تھا اب پتہ نہیں کہ کہاں تھے صاحبان امکنہ دوکاکین نہیں
بتا سکتے کہ ہمارا مکان کہاں تھا برسات بھر مینہ برسا اب
تیشہ و کلند کی طغیانی سے مکان گر گئے۔"

"مرزا تفتہ تم بڑے بے درد ہو دلی کی تباہی پر تم کو رحم
نہیں آتا بلکہ تم اس کو آباد جانتے ہو یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں۔
صحاف اور نقاش کہاں ہے"

ایک خط میں نواب علاء الدین احمد خاں کو دہلی کی تباہی کی داستان یوں لکھی ہے
صاحب! کل تمہارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ
دلی بڑا شہر ہے ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔

اے میری جان! یہ وہ دلی نہیں جس میں تم پیدا ہوئے وہ دلی نہیں
جس میں تم نے تحصیل علم کیا، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ
کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آیا کرتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں
اکیاون برس سے مقیم ہوں ایک کیمپ ہے، مسلمان اہل حرفہ یا
حکام کے شاگرد پیشہ باقی سراسر ہنود معزول بادشاہ کے ذکور
جو بقیۃ السیف ہیں وہ پانچ پانچ روپے مہینہ پاتے ہیں اناث
میں سے جو پیرزن ہیں کٹنیاں اور جو جوانیں ہیں کسبیاں ہیں امرائے
اسلام میں اموات گنو حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا۔
سو روپے روز کا پنشن دار۔ سو روپیہ مہینہ کا روزینہ دار بن کر
نامرادانہ مر گیا۔ میر نصیر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ۔ نانا اور نانی
کی طرف سے امیرزادہ مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان۔ بخشی محمد علی خاں
کا بیٹا جو خود بھی بخشی ہو چکا تھا بیمار پڑا نہ دوا، نہ غذا، انجام کار
مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی احبا کو پوچھو
ناظر حسین مرزا جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا۔ اس کے پاس
ایک پیسہ نہیں ٹکے کی آمدنی نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے۔
مگر دیکھئے کہ چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے بڈھے صاحب ساری
املاک بیچ کر نوش جان کر کے بیک بینی و دو گوش بھرت پور چلے
گئے، ضیاء الدولہ کی پانسو روپیہ کرایہ کی املاک واگزاشت
ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ و خراب لاہور گیا۔ وہاں پڑا ہوا ہے۔
دیکھئے کیا ہوتا ہے قصہ کوتاہ قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور
بلب گڈھ اور فرخ نگر کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔

شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔

ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے؟ جو حکما کا حال لکھا ہے وہ بیان واقع ہے علماء اور زہاد کے باب میں جو حرف مختصر میں نے لکھا ہے ان کو بھی سچ جانو اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر۔ آسیب کا گمان ہرگز نہ کرو خدا چاہے تو استعمال ایارجات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔ یکشنبہ ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء

عافیت کا طالب غالب

رئیس احمد جعفری نے بہادر شاہ اور ان کا عہد ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، اس میں غدر کے بعد کے حالات یہ لکھے ہیں:۔

دہلی غدر کے بعد | صدہا عورتوں نے بدکاری کا پیشہ اختیار کر لیا اور ان کو برقعہ اوڑھ کر مسافروں کی سراؤں کے گرد قطاروں کی قطاریں مسافروں کے بلانے کے انتظار میں بیٹھی یا کھڑی رہتی ہیں اور اس طرح دو چار پیسے صبح کو کما لاتی ہیں بہت سی عورتوں نے اپنا سر منڈوا ڈالا اگر کوئی شخص کبھی ایک خمیری روٹی یا ایک مٹھی چنے کوڑیاں تقسیم کرتا تو صدہا مسلمان عورتیں جمع ہو جاتیں جن میں سے بعض صورتوں سے نجیب زادیاں معلوم ہوتیں جو خود کبھی صدہا روپیوں کی خیرات کرتی تھیں اب کوڑیاں مانگتی ہیں۔ جن کے آگے دو دو چار چار مامائیں کام کرتی تھیں اب خود ماماگیری کے قابل نہ رہیں۔ بعض بڑی عورتیں جن کی حسانیت پر فرنگیوں کو بھی رشک آتا تھا۔ اپنی خوش نصیبی سے بعض انگریزوں کے گھر بیٹھ گئیں دہلی میں پہلے بہت کم خانگیوں کے گھر تھے اشراف کبھی اپنے محلوں میں آباد نہیں ہونے دیتے یا پھر جب شہر آباد ہوا ہے تو ہر محلہ میں ایسے دو چار گھر ضرور تھے۔

منشی ذکاء اللہ کی زبانی | بہادر شاہ ظفر کی صاحبزادی احمدی بیگم کی داستان سنئے۔ احمدی بیگم کے شوہر مرزا منجھو جو غدر میں کام آئے بڑے دبدبے کے آدمی تھے ان کی سرکار بنی ہوئی تھی۔ بیسیوں آدمی ان کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے دروازے پر نالکی پالکی موجود تھی۔ جب مرزا مارے گئے اور شہر کی حالت بگڑی تو بڑی بیگم نے اپنا اور بہو بیٹیوں کا تمام زیور خانم کے بازار والی حویلی میں گاڑنے ۔۔۔۔ کا ارادہ کیا پیٹیوں میں زیور بھرا ہوا تھا۔ ہزاروں کا مال تھا شہر کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ ردی ہو رہی تھی عین شب برات کے روز یہ سب شہزادیاں کھڑی ہوئیں احمدی بیگم کی ضعیفی میرا بچپن تھا انھوں نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ آخری دنوں میں وہ باہر نکلنے کے قابل نہ رہیں اور بہت تکلیفیں اٹھا کر یہ شہزادی دنیا سے اس طرح رخصت ہوئی کہ کفن تک میسر نہ ہوا ــــ فالج نے بالکل بے کار کر دیا تھا چل پھر نہ سکتی تھیں اور کئی دموں کا گزارہ اس ایک دم کی محنت پر تھا۔

میری (منشی ذکاء اللہ) بارہ تیرہ برس کی عمر ہوگی کہ میری والدہ مرحومہ نے احمدی بیگم کا پتہ دے کر مجھے ایک روپیہ دیا کہ دے آؤ ــــ میں گیا۔ شہزادی کے گھر میں مٹی کے لوٹے برتن تھے اور سردی کے موسم میں بادشاہ کی اولاد کی

اور سکڑی بیٹھی تھی ۔ احمدی بیگم اس روپے کو دیکھ کر جس قدر خوش ہوئیں اور جو دُعائیں ان کے منہ سے نکلیں اس کا اظہار مشکل ہے ۔ اس وقت تو ہنستا ہو گیا اور ہنستا ہوا آیا ۔ مگر آج جب اس جھلنگا چارپائی کا خیال آتا ہے تو تڑپ جاتا ہوں ۔

شہزادیاں کسبیاں بن گئیں | وہ شہزادیاں جو جاہ و جلال کی زندگی بسر کر رہی تھیں طوائف اور کسبیاں بن گئیں ۔

شہزادی کا نکاح باورچی سے | متواتر فاقے رنگ دکھاتے ہیں کہ ربیعہ بیگم بہادر شاہ کی لڑکی کا نکاح حسینی باورچی سے ہوتا ہے ——— منشی ذکاء اللہ اس شادی کا ذکر طنز و تعریض کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔

بہادر شاہ کی بیٹی ربیعہ نے اپنا نکاح حسینی باورچی سے اس لئے پڑھایا کہ روز تردیگی[1] کھانے میں آئے گی ۔ فاطمہ سلطان جس کے باپ کے سر پہ تاج شاہی رکھا جاتا تھا مشنریوں کے زنانہ اسکول میں وظیفہ دار بن کے معلمی کا پیشہ سیکھا ص ۹۸۴ تا ۹۸۶

میں نے دہلی کی تباہی کی داستان ذرا تفصیل سے اس لئے بیان کی ہے کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ دہلی کی صرف رونق اور دولت ہی نہیں لٹی بلکہ اخلاق بھی تباہ ہو گیا ۔ ان حالات میں تہذیب و تمدن اور سیرت و کردار زبان اور خیالات میں بلندی کہاں سے آتی ۔

---

[1] تردیگی غلط ہے تر دیگی ہونا چاہیئے ۔

لکھنؤ کے تمدن کا پس منظر

یہ بتایا جا چکا ہے کہ شاعری تمدن کا آئنہ ہے اور تمدن نام ہے طرز زندگی میں نفاست و شائستگی کا جس کی انسانی فطرت دلدادہ ہے وہ ہر نفیس اور شائستہ بات کو فوراً قبول کر لیتی ہے ۔

ایران کا تمدن | معاشرت کی اسی نفاست سے ایران کی تہذیب ساری دنیا پر فائق ہے کوئی قوم ایسی نہیں جس نے اس سے کچھ نہ سیکھا ہو عربوں نے ایران کو فتح کیا مگر اس کی تہذیب کے آگے سر جھکا دیا ۔

ہندوستان میں جن مسلمانوں نے حکومت کی وہ افغانستان و ترکستان کے مغل اور پٹھان تھے ایرانی کوئی نہ تھا مگر شان و شوکت رعب و داب تہذیب و شائستگی نفاست و پاکیزگی میں ایران کی نقل کرتے تھے یہاں تک کہ درباری آئین اور سرکاری زبان فارسی تھی فارسی ادب ان کا قومی ادب تھا فارسی شاعری ان کی شاعری تھی گلستاں بوستاں شاہنامہ سکندر نامہ یوسف زلیخا ان کی درسی کتابیں تھیں فارسی خط ان کا خط تھا ایرانی کھانے ان کے دسترخوان کی لذت تھے اور مغلوں کے زمانہ میں تو ایرانی ہی طبیب و شاعر منجم و فلاسفر فاتح ملک مدبر سلطنت حکومت کی شان اور ملک کا استحکام تھے جو عالم طبیب شاعر سپاہی خطاط ایران سے آیا ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اعلیٰ عہدہ و منصب پر فائز ہو گیا ۔ ایران ولایت اور ایرانی ولایتی کہا جاتا تھا جس میں عظمت و برتری کا مفہوم مضمر تھا ۔

ہمارا سفر ایران | ۱۹۵۴ء میں عراق کے راستہ سے میں ایران گیا بغداد سے ایک ایرانی ہمارے ہم سفر ہوئے اتفاق سے ہم اور وہ بس میں ایک سیٹ پر

بیٹھے کھڑکی کی طرف وہ تھے۔ جب وہ کسی ضرورت سے جاتے تو پہلے اپنے جوتے اُتار کے ہاتھ میں لیتے پھر میرے زانوں کو نانگھتے اسی طرح آتے وقت وہ زحمت اُٹھاتے میں نے کہا بھی کہ اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے مگر انھوں نے گوارا نہیں کیا۔ جب میں نے ان کا نام پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ آقاے کے علی نقی فلسفی کے بھائی ہیں اور میرے متعلق انھیں ایک پاکستانی مسافر ہونے کا علم تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک عام آدمی کے ساتھ ان کا یہ مہذب برتاؤ انسانیت کا احترام تھا۔

خانقین ہمارا سفر جاری رہا غروب آفتاب کے وقت ہم عراق کی سرحدی چوکی خانقین پہنچے وہاں آمد و رفت کو دخول و خروج سُنا وہاں سے تین چار کوس پر

مورد خسروی ایران کی سرحدی چوکی مورد خسروی میں صدور و خروج سننے میں آیا اور ایرانیوں کی پاکیزگی ذوق کا اندازہ ہوا صدور و ورود بھی عربی لفظیں ہیں اور دخول خروج میں ذم کا پہلو بھی عربوں کے محل استعمال کے موافق ہے مگر انھیں اس کا احساس نہیں ہوا۔

گل زمین ایران اب ایران میں ہمارا سفر شروع ہوا رات ہو چکی تھی اس وجہ سے مورد خسروی سے صبح تک کی مسافت کا علم نہیں صبح کو جس چیز نے سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا وہ نہروں آبشاروں درختوں پھولوں اور سبزے کی فراوانی تھی چوراہوں پر ایک دائرہ میں سبزہ درخت پھول اور حوض نظر آیا۔

اہل ایران کی نفاست پسندی حوض پر ایک تختی پر لکھا تھا "نظافت را مراعات دارید" اور ہم نے کسی کو حوض پر منہ ہاتھ دھوتے یا وضو کرتے نہیں دیکھا پانی الگ لے جا کے منہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ اس سے جہاں ملک نہروں آبشاروں درختوں اور پھولوں سے بہشت نظر آیا وہاں اس کے باشندوں کی طبعی نفاست کا اندازہ بھی ہوا کہ انھوں نے طہارت کو کافی نہیں سمجھا نظافت کو

ضروری سمجھا جس کی فطرت میں نفاست ہوتی ہے اس کے اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے زبان و خیالات میں بھی نفاست ہوتی ہے اور کسی چیز میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جیسے کہیں ہم بھونڈاپن کہیں ابتذال کہیں چھچھوراپن کہیں بے سلیقگی کہیں بازاریت کہتے ہیں ایرانیوں کی ہر بات نفاست میں ڈوبی ہوئی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے ان کے تمدن کو ساری دنیا سے ممتاز کیا ہے اس میں فطرت نے بھی ان کا ساتھ دیا ہے۔

ہر گھر میں قدرتی نہر کی ایک پتلی سی شاخ گزرتی ہے جس سے ہر وقت سرد و شیریں صاف اور تازہ پانی ملتا ہے۔

گھر پھولوں سے بھرے ہیں دیواروں پر بیلیں چڑھی ہیں خانہ باغ پائیں باغ انہیں کی زبان کی لفظیں ہیں جو ان کے تمدن کا آئینہ ہیں راستے اور گلیاں پھولوں اور درختوں سے گلزار ہیں رنگ اور پھول ان پر برس رہا ہے قالین پر بیل بوٹے دروازوں پر پھول پتیاں اینٹوں پر گل بوٹے مکان کی جالیوں میں پھول زمین پر گل کاری (ٹائل) در و دیوار پر نقش و نگار صنادید عجم کی یادگار ہے ان کی زبان میں رنگینی ہے ان کی شاعری میں رنگ اور پھول سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ آنکھ نرگس چہرہ گلاب جسم یاسمین دہن غنچہ لب برگ گل ہنسی خندۂ گل قد سرو زلف سنبل ہے۔ یہ استعارے ایران سے تمام دنیا میں پھیلے۔

مہندی گلاب اور نرگس ایران کی خاص چیزیں ہیں۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے۔

"ہندوستان کے قدیم ہندو لٹریچر میں عورت کے سولہ سنگھار میں مہندی نہیں یہ ہندوستان کی چیز نہیں ہے مسلمانوں کے ساتھ آئی ہے۔

فارسی شاعری میں اس سے جتنے مضمون پیدا کئے گئے ہیں وہ کسی اور زبان میں نہیں ہیں نرگس اور گلاب وہاں کا خاص پھول ہے نرگس کو کہیں اور کی آب و ہوا راس نہیں آئی اس لیے اس نے ایران سے باہر قدم نہیں نکالا گلاب ہر جگہ پہنچا مگر ایران میں اس کا جس جس طرح استعمال ہوا کہیں نہ ہو سکا وہاں اسے گل کہتے ہیں یہ تمام پھولوں کا سرتاج ہے اس کا رنگ آنکھوں میں کھپ جاتا ہے اس کی خوشبو شامہ کو معطر دل میں سرور آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرتی ہے۔ بلبل مست ہو کے چہکنے لگتی ہے اور اس کے قریب بیٹھ کے اس کی مستی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رات رات بھر بولتی ہے۔

گلے کے ہار میں اس کا پیوند ہار کو بھاری بھر کم بنا دیتا ہے گلدان میں دوسرے پھولوں کے ساتھ رعایا میں بادشاہ معلوم ہوتا ہے شاعری میں تشبیہ و استعارہ ہے اس کا عرق کھانوں کو معطر کرتا ہے محفلوں کو بساتا ہے مریضوں کی دوا ہے زبان میں اس کا اثر سب سے زیادہ نمایاں ہے سیکڑوں مرکبات ہیں تنہا گل کے کئی معنی ہیں۔ گلابی کے کئی مفہوم ہیں ہر اچھی چیز اس سے تعبیر کی جاتی ہے اچھی صورت گل رو، گل رخسار، گل عذار، گل چہرہ، خوبصورت جسم گل اندام، گلبدن، اچھا لباس گل پیرہن، اچھی بات گل فشانی، گل پاشی، گل ریزی، اچھی آواز گلبانگ۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کے سابقے لاحقے اتنے مرکبات ہوں۔

لاحقے | گلاب، گل آفتاب، گلابی، گل بو، گل بازی، گل برگ، گل بن، گل بیگانہ، گلبانگ، گل پاپوش، گل پاش، گل پوش، گل پیادہ، گل تر، گل تراش، گل تسبیح، گل چیں، گلچمن، گل زرد، گلدم، گل دام، گلدار، گل دوزی، گل رعنا، گل رنگ، گل زمین، گلزار، گلستان، گل شمع، گل شکر، گلشن، گل صبح، گلفام، گلغنہ، گلکار، گل کدہ، گلگوں، گلگونہ، گل میخ، گل مہتاب، گلنار، گل وش، گلی۔ گلِ چشم۔ گلِ کفش۔ گلِ خود رو۔ گلِ رستہ۔ گلِ نورستہ۔ گلدان۔ گلِ شب افروز۔

سابقے | برگ گل، تبسم گل، خندہ گل، عرق گل، غنچہ گل، دامن گل، زر گل، بوئے گل، نکہت گل، شمیم گل، فصلِ، موسم گل، سبدِ گل، قبائے گل، جامۂ گل، رنگ گل، روغن گل، ساغر گل۔

محاورے | گل گفتن، گل دیگر شگفت، گل گشت، گل در آب کردن، گل دادن، گلگل شگفتن، گلِ خوردن۔

اب معلوم ہوا کہ وہ دنیا کو گلشن ایجاد کیوں کہتے ہیں۔

رنگ اور ایران | یہی عالم رنگ کا ہے ہر اچھی چیز رنگین ہے، رنگین نوا، رنگین سخن، رنگین زبان، رنگین بیان، رنگین شعر، رنگین ادا، بہت سے محاورے ہیں۔ رنگ بر روے آوردن، رنگ ریختن، رنگ زدن، رنگ بستن، رنگ شکستن، رنگ بر آب ریختن، رنگ گرفتن، رنگ گذاشتن، رنگ نہادن، رنگ ماندن، رنگ چسپیدن، رنگ مالیدن، رنگ پوشیدن، رنگ خندیدن، رنگ برخاستن، رنگ گسیختن، رنگ گردانیدن، رنگ جستن، رنگ، رنگ بردن وغیرہ غرض رنگ و بو کا ایک سیلاب ہے اور دنیائے رنگ و بو اسی سے تعبیر ہے اس طوفان رنگ و بو میں پلنے والے اپنی شاعرانہ طبیعت سے روزانہ نئی تشبیہیں اور استعارے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

خراسان میں ایک لڑکا دو گلدان ہاتھ میں لئے بیچ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ ہم گل و ہم گلدستہ، گلدستہ کے لئے ہم نے یہ فقرہ نہیں سنا تھا۔

اہل ایران کی ایجادیں | دنیا میں ہزاروں چیزوں کے وہ موجد ہیں اور اس دور ترقی میں بھی ان کی بہت سی ایجادوں پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا جام شراب تخت و تاج دربار اور اس کے آئین ساری دنیا نے ایران سے سیکھے کافوری شمعیں، شمعدان اور فانوس ان کی نفیس طبیعت اور ایجاد ذہن کی پیداوار ہے۔ بیمارستان (اسپتال) دنیا میں سب سے پہلے ایران (جندیشاپور)

ہیں بنا اور طب یونانی وہیں سے ساری دُنیا میں پھیلی۔

دُنیا میں سب سے پہلے مشین ایرانیوں نے ایجاد کی۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی نے آلہ جرثقیل مشین گن (ایک راؤنڈ میں بارہ فیر کرنے والی بندوق) قلعہ شکن توپ ہوا سے چلنے والی چکی ایجاد کی۔

خط نستعلیق ایرانیوں نے ایجاد کیا جب ایران میں عربی خط (نسخ) رائج ہوا تو اس کی ناہمواری اہل ایران کی نفیس اور حسن پرست طبیعت پر بار ہوئی انھوں نے اس میں گول دائروں اور نوک پلک سے حسن پیدا کیا اور اس کا نام نسخ تعلیق رکھا کیوں کہ وہ نسخ پر تعلیق تھی رخ ثقل کیوجہ سے خارج ہو گئی اور نستعلیق رہ گیا پھر اس میں جدتیں پیدا کیں اور اس کی بہت سی قسمیں ایجاد کیں خط گلزار خط ماہی خط غبار خط طغرا، خط ریحان، خط شفیعہ وغیرہ اور ہر خط کو مضمون کی مناسبت سے استعمال کیا۔

نسخ کو بھی انھوں نے اس کی حالت پر نہیں چھوڑا اس میں بھی ایک حسن پیدا کیا گویا اونٹ کو بنا سنوار کے دلہن بنا دیا۔ مکانوں کی جالیاں اور ٹائل کی زمین ان کی اختراع ہے۔

قالین کی ایجاد بھی ان کی حسن پسند طبیعت کا کارنامہ ہے انہوں نے جیسے قالین بنائے دُنیا میں کہیں نہ بن سکے آج بھی وہ اعلیٰ تمدن کا اہم جزو ہے اور اس سے بہتر کوئی ایجاد اب تک نہیں ہو سکی سفید فرش اور اس کا نام چاندنی نورجہاں کی اختراع ہے۔ عطر بھی اسی کے حکم اور تجویز سے بنا اس سے پہلے مشک رکھتے اور غالیہ (خوشبودار بوٹی) بالوں میں ملتے تھے درختوں میں پیوندکاری بھی انھوں نے ایجاد کی۔ راستوں میں میلوں کے نشانات اور کاروان سرائیں انھوں نے بنائیں۔ کھانے میں پلاؤ زردہ مزعفر متنجن شیربرنج انہیں کی ایجاد ہے۔

شاعری میں غزل، رباعی اور مثنوی کے وہ موجد ہیں۔

ایران کے تمدن میں انقلاب صفویوں کے زمانہ میں ایرانی تمدن میں انقلاب آیا شعیت اس میں شدت سے داخل ہوئی اہلبیت سے عقیدت میں ترقی ہوئی شعراء کو مدح اہلبیت میں قصائد اور مصائب میں مرثیہ لکھنے کی ہدایت ہوئی اور اس پر بڑے صلے دیئے گئے علماء کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا یہاں تک کہ سلاطین ان کے سامنے تخت و تاج پیش کر کے ان کی نیابت میں امور سلطنت انجام دیتے تھے اپنی بیٹیوں کی شادی ان کے ساتھ کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلبیت مرکز عقیدت بنے صوفیت و امرد پرستی کا خاتمہ ہوا خانقاہیں ویران ہوئیں مجلس و ماتم نذر و نیاز اور تعزیہ داری کو فروغ ہوا۔ یہی زمانہ ہندوستان سے روابط بڑھنے کا تھا شاہ اسمٰعیل نے بابر کی اور شاہ طہماسپ نے ہمایوں کی مدد کی جس کے نتیجہ میں ترکستان افغانستان اور ہندوستان میں ان کی حکومت قائم ہوئی بابر اور ہمایوں سے قریبی تعلق رکھنے والوں کا بیان ہے کہ یہ دونوں شیعہ ہو گئے تھے[1] ان کے زمانہ میں ہر شعبہ میں ایرانی نظر آتا تھا اور اپنی صلاحیتوں سے سب پر چھایا ہوا تھا۔

ہندستان کا قدیم تمدن ہندوستان کے قدیم تمدن میں ہاتھی کی سواری کو بڑی اہمیت تھی اور اس میں شک نہیں کہ اس سے زیادہ شاندار سواری دُنیا میں کوئی نہیں۔ جامہ مختلف قسم کی پگڑیاں۔ مٹھائیاں۔ کھانوں میں پوریاں کچوریاں مال پوا دہی بڑے پھلکیاں مزیدار چیزیں تھیں۔ پان بھی یہاں کی خاص چیز ہے جس سے کسی وقت منہ میٹھا پھیکا نہیں رہتا۔ طوائفیں بھی یہاں کی

---

[1] محمد اکبر جوہر ہمایوں کے آفتابہ بردار نے ہمایوں نامہ ایک مستقل کتاب اس موضوع پر لکھی جس میں ان لوگوں کو شیعہ ثابت کیا ہے یہ کتاب حیدرآباد دکن اور کراچی چھپ چکی ہے۔

دُنیا بھر سے الگ بڑی خصوصیتوں کی حامل تھیں جنسی تسکین کے علاوہ شادی بیاہ اور تفریحی محفلوں کا وہ لازمی جزو تھیں ان کا گانا اور ناچنا یہاں کی محفلوں میں ایک سماں باندھ دیتا تھا وہ امراء اور رؤسا کی مقرب اور ان کی تفریح کا سامان تھیں شادی بیاہ کی بھی بہت سی رسمیں یہاں مخصوص تھیں ان سب کو مسلمانوں نے اور ان کی بہت سی باتیں ہندوؤں نے اختیار کرلیں، اسی طرح ایک مخلوط تمدن قائم ہوا۔

لکھنؤ کا تمدن

برہان الملک سید محمد امین ایرانی امیر زادے جوانی میں بیوی سے خفا ہو کے اپنے وطن نیشا پور سے نکلے اور ہندوستان کا رخ کیا یہاں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے بہت جلد بلندی پہ پہنچ گئے پہلے سعادت خان پھر برہان الملک بہادر جنگ خطاب ملا ۱۱۳۶ھ میں اودھ کے صوبیدار ہوئے ان کے ساتھ بہت سے ایرانی سپاہی اور سردار جو دہلی میں بیکار پڑے تھے لکھنؤ آئے جب یہاں ان کا تسلط ہو گیا تو اپنے اہلِ خاندان اور لواحقین کو ایران سے بلوا لیا اس طرح لکھنؤ میں ایک چھوٹا سا ایران آباد ہو گیا یہ لوگ صفوی دور کے ایرانی تھے جو شیعیت میں بہت سخت اور رسم عزا کی بجا آوری کا بڑا اہتمام کرتے تھے اب لکھنؤ میں بھی مجلس و ماتم ہونے لگا جس طرح ایران میں ہوتا تھا۔ اس کی ترقی دیکھ کے دہلی سے مشہور مرثیہ گو حیدری لکھنؤ چلے آئے ان کی مرثیہ خوانی خوب چمکی اور لکھنؤ میں پہلے پہل شیعیت نمودار ہوئی اس سے پہلے کوئی شیعہ نہ تھا اودھ کے مشہور فلسفی ملا حمد اللہ شیعہ ہو گئے ان سے متاثر ہو کے بعض اور لوگوں نے بھی شیعیت اختیار کرلی۔ برہان الملک خود شاعر تھے اور بہت اچھے شعر کہتے تھے ان کے گرد علماء و شعراء کا مجمع رہتا تھا۔

اور سب ان کی قدر دانی سے خوشحال تھے۔ کئی شاعر ایران سے آئے اور ان کی مصاحبت میں داخل ہوئے۔

اب لکھنؤ میں جو تمدن قائم ہوا اس میں دہلی سے زیادہ شائستگی اور نفاست تھی کیونکہ یہاں ایران کی نقالی نہ تھی بلکہ اصل ایران آ گیا تھا جس میں شیعیت نمایاں تھی برہان الملک نے سولہ برس اودھ پر حکمرانی کی ۱۱۵۲ء میں زہر باد سے دہلی میں انتقال ہوا۔

صفدر جنگ برہان الملک نے اپنے بھانجے مرزا مقیم کو ایران سے بلوا کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا وہ ابو المنصور خان صفدر جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ پانچ سال تک مہمات سلطنت میں شریک رہنے کے بعد اپنی بیٹی صدر جہاں بیگم سے ان کی شادی کی برہان الملک کے بعد وہ اودھ کے صوبیدار اور ابدالی کو شکست دینے کے صلہ میں ہندوستان کے وزیر اعظم ہوئے۔ ملکی نظم و نسق اور شجاعت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے تمام مورخین ان کی بہادری پر متفق ہیں۔ خود بھی شاعر اور شعراء کے قدر دان تھے ایک ایک شعر پہ ہزاروں روپیہ انعام دیتے تھے علماء اور صاحبان کمال کے مرجع تھے خوش رو خوش خلق شان و شوکت اور خوش پوشاکی میں مشہور تھے ان کے ہاتھیوں کے گنگا جمنی کارچوبی جھولیں گھوڑوں کے گنگا جمنی ساز و یراق کی ہندوستان میں شہرت تھی میر تقی میر نے ذکر میر میں لکھا ہے کہ "ان کی شان و شوکت بادشاہ سے بھی زیادہ تھی ان کی فوج کے سپاہیوں کی بانات کی وردیاں تھیں اسلحہ سے لیس گھوڑے ساز و یراق سے آراستہ تھے دنیا بھر کے سپاہیوں سے زیادہ ان کی تنخواہ تھی اس پر بھی وہ جیالے نوجوانوں کو اضافی تنخواہ دیتے تھے اور سپاہیوں پر عام بخشش بھی کرتے تھے اس کی شہرت سن کے

نادر شاہ کی فوج کے بہت سے سپاہی اور سردار ہندوستان آ کے ان کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔

سخاوت میں بھی وہ مشہور تھے کوئی ان کی داد و دہش سے محروم نہ تھا۔

شام اودھ اجودھیا کے قریب برہان الملک کی فوجی چھاؤنی بنگلہ کو انھوں نے ترقی دے کے شہر بنا دیا اور ایران کے ایک شہر کے نام پر اس کا نام فیض آباد رکھا اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہندوستان میں سہ پہر کو بازار بند ہو جاتے تھے ایران میں اسی وقت بازار گرم ہوتا تھا اور گیارہ بارہ بجے رات تک چہل پہل رہتی ہے۔ یہی حالت فیض آباد کی بھی تھی یہی شام اودھ ہے جو ہندوستان میں ایک انوکھی بات ہونے کی وجہ سے مشہور ہو گئی۔

۱۱۶۵ھ میں ان کو زہر باد ہوا نہایت کرب میں مبتلا تھے مگر اتنا تحمل تھا کہ اس کا اظہار نہیں ہوا انتقال کے بعد لوگوں کو ان کی قوت برداشت پر حیرت ہو گئی کہ مرنے سے کچھ پہلے وہ بڑی شان و شوکت اور سکون و وقار سے بیٹھے دیکھے گئے تھے۔

ان کے زمانہ میں شان و شوکت خوش پوشاکی لکھنؤ کے تمدن میں داخل ہوئی اور ان کے بعد اذیت کا تحمل اہل لکھنؤ کی وضع بن گیا کراہنا اور ہائے وائے کرنا بزدلی سمجھا جانے لگا۔

شجاع الدولہ جنگ ۱۱۶۵ھ میں جلال الدین حیدر شجاع الدولہ اپنے والد منصور کے بعد حاکم اودھ ہوئے۔ فنون حرب اور جسمانی قوت میں یکتائے زمانہ تھے ایک ضرب میں بھینسے کی گردن اڑا دیتے تھے گوسفند کا کلہ چیر ڈالتے تھے۔ روپے کے حرف چٹکی سے مسل کے مٹا دیتے تھے انھوں نے فوج کی تعداد بڑھائی توپ اور بندوق ڈھالنے کے کارخانے قائم کئے عام طرز زندگی میں سپاہیانہ بانکپن پیدا ہوا اور فیض آبادی آن مشہور ہوئی۔ ایرانی طرز کے چار سو باغ اور سیر گاہیں بنائیں جن کی اتنی شہرت ہوئی کہ شاہ عالم ان کو دیکھنے آئے۔

شعر و سخن کے دلدادہ اور اہل کمال کے قدر داں تھے دہلی کی ابتری سے اہل کمال نے فیض آباد کا رخ کیا اور انھوں نے ان کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ان باتوں میں اپنے پیش رووں سے بڑھ کے قدم مارا۔

وہ ایرانی ہونے کے ساتھ ساتھ دہلوی بھی تھے ان کی بیوی اور ماں ایرانی باپ کی بیٹیاں ضرور تھیں مگر دہلی میں پیدا ہوئی تھیں خود شجاع الدولہ نے دہلی میں آنکھ کھولی۔ امرائے دہلی کے اکثر ذوق ان میں موجود تھے رقص و سرود و جانوروں کی لڑائی ان کی بہترین تفریح تھی ارباب نشاط سے دلچسپی کی شہرت دور دور پہنچی کشمیر کلکتہ اور اطراف ملک سے اتنی حسین و جمیل طوائفیں آئیں کہ ان سے فیض آباد کی گلیاں کوچے بھر گئے۔ کسی عورت کو شہر سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی اس حکم میں طوائفوں پر پابندی مقصود تھی وہ اپنے کو قید نہ سمجھیں اس کے لئے ان پر طرح طرح کی نوازشیں ہوئیں اور بغیر کسی خدمت کے انعام و اکرام کا دستور قائم کیا کہ وہ خوش اور مطمئن رہیں۔

سیر و شکار میں حرم سرائی ارکان سلطنت فوج کا ایک بڑا حصہ شہر کے خوش باش امیر رسد کے لئے ہر طرح دوکاندار ساتھ ہوتے تھے ہر منزل پہ بازار لگ جاتا طوائفوں کے ڈیرے نصب ہو جاتے اور جنگل شہر بنجاتا۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ طوائفوں کی کتنی کثرت تھی اور وہ زندگی کا ایک جزو بن گئی تھیں۔

ان کے گھر میں ایرانی فضا تھی ان میں متانت و وقار سنجیدگی اور

بلند نظری تھی طوائفوں سے اتنی دلچسپی اور قدردانی کے بعد بھی انہیں تہذیب و متانت کے حدود سے تجاوز کی اجازت نہ تھی وہ یہاں آکے پہلے تہذیب سیکھتیں ادب تعظیم کے طریقے دیکھتیں اس کے بعد کسی رئیس کے سامنے آنے کے قابل ہوتیں۔

شجاع الدولہ کے سالے سالار جنگ کھانے کے بڑے شوقین تھے ان کی وجہ سے اہلِ لکھنؤ میں کھانے کا ذوق پیدا ہوا دور دور سے باورچی آئے اور بڑے لذیذ و تکلفی کھانے پکنے لگے۔

مذہبی حیثیت سے ہندو مسلمان دو فرقے تھے جنہوں نے ایک دوسرے کے بہت سے رواسم اختیار کر رکھے تھے۔

سنی شیعہ کی تفریق نہ تھی شیعہ تھے تو مگر کوئی علیحدہ قوم نہ تھے نکاح طلاق دفن کفن سب اہلِ سنت کے طریقہ پر ہوتا تھا نماز جماعت وغیرہ کچھ نہ تھی کیونکہ کوئی شیعہ عالم نہ تھا۔

مذہبی رواسم میں پیری مریدی عرس قوالی بڑے پیر کی فاتحہ میراں جی کے گلگلے شیخ سدو کا بکرا سید احمد کبیر کی گائے مدار صاحب کی کندوری سید سالار کا جھنڈا شیعہ سنی دونوں کے مذہبی رواسم تھے۔

محرم میں دس دن تعزیہ داری بھی سب مل کے ایک ہی طریقہ پر کرتے تھے۔ صرف شجاع الدولہ کا علم عام طریقہ کے خلاف اٹھتا تھا لمبی چھڑیں بڑا سا علم اس کی گردن میں کمان کے بیچ کا حصہ مضبوط بندھا ہوا جس کے دونوں سروں پر ذوالفقار لٹکتی ہوتی تھی اس سے کچھ نیچے چھوٹی سی مشک اس کے نیچے پرچم اس کے نیچے پھریرا سیاہ یا سفید شہاب جھڑ کا ہوا شجاع الدولہ یہ علم لے کے سیاہ لباس میں سر و پا برہنہ

ماتم کرتے نوحہ پڑھتے گشت کرتے تھے۔

عزاداری کا یہ طریقہ شجاع الدولہ کے زمانہ سے شیعوں میں رائج ہو گیا۔ سپاہیانہ بانکپن خوش پوشاکی خوش خوری شان و شوکت تہذیب و متانت کرب و اذیت کی اتنی برداشت کہ اس کا اظہار نہ ہو شعر و شاعری کے ساتھ رقص و سرود اور اربابِ نشاط سے دلچسپی لکھنؤ کے تمدن میں داخل ہوئی۔ سنہ ۱۱۸۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

آصف الدولہ | شجاع الدولہ کے فرزند اکبر مرزا یحییٰ آصف الدولہ رستم جنگ سنہ ۱۱۸۸ھ حکمراں ہوئے ایک سال کے اندر فیض آباد چھوڑ کے لکھنؤ چلے آئے اور باون گاؤں ملا کے اس کو وسیع کیا نئے محلے عمارتیں اور باغ ایسے عالیشان اور اتنی کثرت سے بنوائے کہ لکھنؤ دنیا کا سب سے بہتر شہر سمجھا جانے لگا۔ بڑے دیندار سخی بہادر شاعر اور فنِ تاریخ و سیر میں کامل تھے۔ ان کے زمانہ میں بڑے بڑے اہلِ کمال لکھنؤ آئے اور شعر و سخن کا ذوق بڑھا۔

ان کو تعزیہ داری سے بڑی دلچسپی تھی اپنا عظیم الشان امام باڑہ بنوایا محرم میں وہ تعزیہ کی زیارت کو نکلتے تھے ہر تعزیہ پر کچھ چڑھاتے تھے یہ طریقہ عام ہو گیا اُمرا نے بھی اسے اختیار کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا شہر تعزیہ خانہ بن گیا مجلسیں بڑے اہتمام سے ہوتی تھیں ایران تک سے حدیث خواں واقعہ خواں روضہ خواں اور کتابخواں آئے۔

پہلے شیعہ مجتہد | ان کے زمانہ میں مولانا دلدار علی (غفرانمآب) عراق و ایران سے مذہبی علوم کی تکمیل کر کے آئے اور لکھنؤ میں قیام کر کے شیعوں کی جمعہ و جماعت قائم کی نکاح طلاق دفن کفن سب ان کے طریقہ پر ہونے لگا۔

شیعیت اور صوفیت میں کوئی حد فاصل نہ تھی علمائے عراق نے اس موضوع پر کچھ نہیں کہا علمائے ایران میں ملا محمد باقر مجلسی نے ایک ہلکی سی روشنی ڈالی۔ علامہ محسن کاشانی صاحب تفسیر صافی قوالی کے جواز کے قائل تھے۔ قاضی نور اللہ شوستری نے بھی صوفیا کی بڑی حمایت کی ہے شیخ علی حزیں بھی صوفیت کے حامی تھے۔

غفرانمآب پہلے شیعہ عالم ہیں جنھوں نے آصف الدولہ کے زمانہ میں صوفیت کے خلاف مہم کا آغاز کیا ایک مستقل کتاب (شہاب ثاقب) لکھی اور تقریر و تحریر سے یہ ثابت کیا کہ صوفیت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں صوفیا گمراہ ہیں سوائے ائمہ اہلبیت کے کوئی مرکز عقیدت بننے کے قابل نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا عرس قوالی بڑے پیر کی فاتحہ شیخ سدو کا بکرا سید احمد کبیر کی گائے غازی میاں کا جھنڈا اور چادر۔ گاگر وغیرہ رسوم جو شیعوں میں رائج تھے وہ چھوڑ دیئے گئے ان کی جگہ حاضری علم تعزیے اور آئمہ و شہدائے کربلا کی نذر و نیاز ہونے لگی۔ اس زمانہ میں لکھنؤ کے تمدن میں کسی خاص چیز کا اضافہ نہیں ہوا مگر ہر چیز میں ترقی ہوئی غفرانمآب کی کوشش سے شیعیت کو بڑا فروغ ہوا اور غزل میں بھی عورت سے عشق یا بیباکانہ بانکپن اور شیعی عقائد کا اظہار کیا جانے لگا۔ میر تقی میر نے تو مناظرانہ نوک جھونک سے بھی پرہیز نہیں کیا۔ باغ فدک خلافت بلا فصل وغیرہ کا ذکر ان کی غزلوں میں موجود ہے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں آصف الدولہ کا انتقال ہوا۔

یمین الدولہ سعادت علیخاں آصف الدولہ کے بعد ان کے سوتیلے بھائی سعادت علیخاں سنہ ۱۲۱۲ھ کو مسند حکومت پر بیٹھے وہ بہت بڑے عالم مفکر فلسفی سیاستداں اہل کمال کے سرپرست تھے رقص و سرود اور حسن پرستی کی فضا میں انہوں نے پرورش پائی تھی شعر و سخن کی فضا میں آنکھ کھولی تھی نفاست و پاکیزگی

ذوق ان کے گرد و پیش پھیلی ہوئی تھی سنجیدگی و وقار ان کی فطرت تھی۔ اس وقت تک رات کو سواری کے ساتھ مشعلوں کا رواج تھا انھوں نے سونے چاندی کی ایسی سولا لالٹینیں بنوائیں جن میں شمعیں جلتی تھیں یہ خوبصورت چھڑوں میں ان کی سواری کے ساتھ رہتی تھیں۔

شجاع الدولہ کے زمانہ سے ناچ گانے اور طوائفوں سے دلچسپی فرمانروایان اودھ کی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ سعادت علی خاں ایسا متین و سنجیدہ شخص بھی اس سے نہ بچ سکا صبح کو اجلاس کے وقت ایک طرف امرائے دربار فوجی افسر کاغذات لیے حاضر رہتے تھے دوسری طرف طائفے رقص و سرود میں ہمہ تن راگ الاپنے میں مشغول رہتے تھے نوبت و نقارے کی آواز اس پر مستزاد تھی اور وہ کام کرتے میں اٹھ اٹھ کے کھڑکیوں میں سے دیکھتے رہتے تھے یہی حالت تمام امراء کی تھی عوام کو بھی اس سے بڑی دلچسپی تھی اس وجہ سے طوائفوں کی بڑی کثرت ہو گئی ان کو شہر سے باہر جانے کی ممانعت تھی نواب کا خیال تھا کہ یہ شہر کی رونق ہیں حکومت اور روسا کی طرف سے ان کو بغیر کسی خدمت کے انعامات ملتے رہتے تھے۔

زبان کے معاملہ میں بھی ان کا ذوق بہت پاکیزہ تھا شوکت الفاظ کے ساتھ بلیغ مختصر معنی خیز اور مرصع فقرے برجستہ ان کی زبان سے نکلتے تھے۔ وہ ملائی کو بالائی کہتے تھے انشاء نے دریائے لطافت میں لکھا ہے کہ:۔

"حضور والا کی اردو میں تحریر و تقریر مقامات حریری
کی یاد دلاتی ہے۔ نہ کوئی ایسا فصیح زبان اور شیوا بیان
پیدا ہوا نہ ہوگا کسی وقت ان کی بات لطیفہ سے خالی نہیں
ہوتی کبھی طباق کبھی ایہام کبھی ترشیح کبھی محتمل الضدین"

بظاہر یہ خوشامد معلوم ہوتی ہے مگر سچ پوچھیے تو ان کی ادبیت کا حق ادا
نہ ہو سکا حریری نے انشاء پردازی کی ہے اور سعادت علی خاں کی معمولی
بات چیت اور روزانہ کے احکام ہیں یہ بات حریری کو کہاں نصیب ہوئی۔ انھوں
نے قانون بنایا کہ جو منشی املا کی غلطی کرے اُسی حرف کے ہم عدد اس پر
جرمانہ کیا جائے۔ ایک نیا منشی نوکر ہوا اس نے بر نوع تو "برنو" لکھدیا
تحریر نظر سے گذری اس پر حکم لکھا،

"منشی نو لفظ نوع را بطرز نو نوشت عین خطا کرد ہفتاد
روپیہ جرمانہ"

ایسی برجستہ عبارت بڑے بڑے انشاء پرداز نہیں لکھ سکتے" سرکاری
درزی نے اضافہ تنخواہ کی درخواست دی اس پر حکم لکھا۔

گر زمیں را با سماں دوزی ندہندت زیادہ از روزی

جان بیلی صاحب فارسی دانی میں بڑی شہرت رکھتے تھے خود بھی ان
کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا سعادت علی خاں کے مختصر معنی خیز اور مرصع
جملوں کی شہرت تھی بیلی صاحب جب رزیڈنٹ ہو کے لکھنؤ آئے تو کہا
تو یہی ہے ان سے مختصر سوال کروں اور انھیں طولانی جواب دینا پڑے
اپنے دل میں کچھ سوال مرتب کئے جب ملاقات کو آئے تو سلام، مزاج پرسی کے بعد پوچھا

آپ کے عجائب خانہ میں کون کون سے جانور ہیں؟ از شیر تا بیٹر۔

آپ کے مُلک کے کیا حدود ہیں۔؟ از سنگ تا گنگ
ہمالیہ گنگا

بیلی صاحب حیران ہو گئے اور پھر کسی سوال کی جرأت نہ ہوئی۔
سعادت علی خاں کا یہ انداز تحریر و تقریر بیحد مقبول ہوا خاص و
عام سب معمولی گفتگو صنائع و بدائع میں کرنے لگے۔ سودا بیچنے والوں کی

صدائیں مشہور ہیں۔
علماء کی تقریر و تحریر بھی اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی سلطان العلماء
مجتہد العصر کی تصنیفیں ایسے فقروں سے بھری پڑی ہیں ان کی روزانہ
کی گفتگو اور مقدمات کے فیصلے بھی اسی رنگ میں ہوتے تھے۔
متی طوائف بدکاری جُرم میں گرفتار ہوئی جُرم ثابت ہوا فیصلہ میں لکھا
متی بالتضم والتشدید[1]
ایک حکیم مہتا نے کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ کر لیا اس کی شکایت صحیح ثابت
ہوئی فیصلہ میں لکھا۔

"حکیم صاحب رفع قبض نمائید"

یہ انداز تقریر و تحریر لکھنؤ کے تمدن کا ایک جزو بن گیا۔
سعادت علی خاں کو اپنے باپ دادا اور بھائی کی طرح عزاداری سے
بڑی عقیدت تھی وہ محرم بہت اہتمام سے مناتے تھے۔ اب تک صرف دس دن
محرم میں تعزیہ داری ہوتی تھی انھوں نے چہلم بھی قائم کیا تال کٹورے کی
کربلا اور حضرت عباس کی درگاہ بنوائی۔
میر سید علی نے سوز خوانی میں وہ کمال پیدا کیا کہ لوگ حیران ہو گئے
اور لکھنؤ میں سوز خوانی نے ایک اعلیٰ فن کی حیثیت اختیار کی۔
ایک نیا شہر انگریزی طرز کا آباد کیا۔ بڑے بڑے شعراء دہلی
سے آئے اور مختلف سرکاروں سے وابستہ ہوئے۔
پرکاش نے بتاسے پر ناچ کے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا

---

[1] متی برائی میں شدت سے ملوث ہوئی۔

۱۲۲۹ھ کو سعادت علی خاں کا زہر سے انتقال ہوا۔

غازی الدین حیدر | غازی الدین حیدر سعادت علی خاں کے فرزند اکبر اپنے باپ کے بعد ۱۲۲۹ھ میں مسند حکومت پر بیٹھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اپنی شاہی کا اعلان کیا اپنے نام کا سکہ ڈھلوایا۔ دو کروڑ میں تاج و تخت اور گنبد زرنگار تیار ہوا اٹھارہ ذی الحجہ ۱۲۳۴ھ کو تخت شاہی پر جلوس فرمایا سلطان العلماء مجتہد العصر نے اپنے دست مبارک سے تاج شاہی ان کے سر پر رکھا اور پہلا حکم کچھ سادات کی تنخواہ کا شاہی قلم سے صادر ہوا شاہ زمن لقب اختیار کیا۔ وہ بڑے شجاع و بہادر عالم و فاضل علماء و فضلا کے سرپرست و مرجع تھے۔

شاعری سے بھی دلچسپی تھی حمد نعت اور مرثیہ زیادہ کہتے تھے غزل میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ فارسی کی ایک بلند پایہ لغت (ہفت قلزم) کے مصنف ہیں ایک عربی لغت (تاج اللغات) مستند علماء سے لکھوائی۔

ٹائپ کے حرفوں کا چھاپہ خانہ اور کنواری لڑکیوں کی شادی کا محکمہ قائم کیا۔ طبیعت نفاست پسند اور جدت طراز تھی کپڑوں کے ذوق کی بشپ ہیبر نے بہت تعریف کی ہے ایک ٹوپی مندیل کی قسم کی ایجاد کی گھوڑے اور مچھلی کی شکل کی کشتیاں بنوائیں ہاتھی کا ایسا ہودا بنوایا جو چاروں طرف گھومتا تھا گینڈے پر ہودا رکھ کے سواری کی پے طناب کا خیمہ بنوایا۔ حقہ کا نام حسن محفل رکھا نجف اشرف قدم رسول اور سعادت علی خاں کا مقبرہ تعمیر کرایا نہر کھدوائی اور اسمیں پانی کے لیے انجن منگوایا ان کے زمانہ میں شہر کی بہت رونق بڑھی۔

آداب نشست و برخواست اور لوازم تعظیم و تکریم سخت ہو گئے چھینکنا کھانسنا۔ جماہی لینا کھانا بے تحاشا ہنسنا خلاف تہذیب قرار پایا خطاب و جواب میں بڑی لچک اور دلکشی پیدا ہوئی سلام و مزاج پرسی کے انداز میں اشتیاق اور خلوص کا مفہوم پیدا ہوا سنجیدگی متانت کی پابندی لازمۂ شرافت تھی۔ غیر مہذب آدمی شرفا کی محفل میں بیٹھنے کے قابل نہ تھا اسوجہ سے ہر شخص کو آئین تہذیب کا معیار بننا پڑا مصاحب، خواتین، خدمتگار خاص طور پر مہذب ہو گئے یہ بات صرف دربار اور امیروں کی سرکار تک نہ رہی بلکہ عام ہو گئی اس کا اثر یہ ہوا کہ بازاری اور مکروہ لفظیں لونڈا۔ لیٹر۔ چانٹا۔ جوتا۔ جورو۔ بھڑوا۔ ابے وغیرہ زبان سے خارج ہو گئیں نقل۔ قول کی ضرورت پر موزون الفاظ سے کام لیا جاتا ہے یہ معیار تہذیب دہلی میں بھی نہ تھا۔

فن سپہ گری کو ترقی ہوئی لوگ عموماً سپاہیانہ وضع میں رہنے لگے شعر و شاعری کا ذوق بڑھا علوم و فنون کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا علماء شعراء اطبا اور دوسرے صاحبان فن دور دور سے آئے اور قدر دانی سے سرفراز ہوئے نفاست اور پاکیزگی ذوق کا شعور پیدا ہوا

تعزیہ داری کو ترقی ہوئی بادشاہ نے حضرت علی کے روضہ کی نقل تعمیر کرائی اور اس کا نام شاہ نجف رکھا انگلینڈ سے بلور سبز کی ضریح ڈھلوا کے منگوائی علم و تعزیے کے ساتھ یہ ضریح بھی اٹھائی جاتی تھی۔

۱۲۴۳ھ میں ان کا انتقال ہوا اپنے بنوائے ہوئے امامباڑہ (شاہ نجف) میں دفن ہوئے لالہ صاحب رائے فریاد نے تاریخ کہی

حیدر بنجف مقام بگرفت

نصیر الدین حیدر | غازی الدین حیدر کے اکلوتے بیٹے نصیر الدین حیدر ۱۲۴۳ھ میں

تخت سلطنت پر بیٹھے۔ اور سلیمان جاہ لقب اختیار کیا سلطان العلماء سید محمد رضا مجتہد العصر نے تاج پہنایا۔ وجیہہ و شکیل، رعب شاہی چہرہ سے نمایاں اعلیٰ درجہ کے شہسوار اچھے پیراک اور خوشگو، شاعر تھے بادشاہ تخلص تھا ان کا دربار بڑے رعب و داب کا دربار تھا کسی کو چھینک آگئی تو اس کی ناک کٹوائی[1] طبیعت میں بڑی نفاست اور خوشبو سے بہت رغبت تھی عطر اور پھول کا استعمال عجیب عجیب طرح کیا خس کی ٹٹیوں پر کیوڑہ اور گلاب چھڑکا جاتا تھا عطر کے فوارے چھوٹتے تھے اور حوض بھرے جاتے تھے ہزاروں سرکاری باغوں کے علاوہ سیکڑوں روپیہ کے پھول روزانہ بازار سے آتے تھے[1] مزاج میں اتنی نزاکت تھی کہ بیلے کے تیل کی خوشبو ناگوار ہوئی۔

خوبصورت عورتوں کو جمع کرنے اور انھیں آراستہ رکھنے کا بے حد شوق تھا کئی ہزار کہاریاں پہرہ دارنیاں خواصین اور کنیزیں تھیں جو بہت بناؤ سنگھار سے رہتی تھیں ان کی لونڈیوں نے جو لباس پہن ڈالا وہ مغل اعظم کی ملکہ اور شہزادیوں کو نصیب نہیں ہوا ایک ایک دوپٹہ چار چار ہزار کی لاگت کا ہوتا تھا[2]

رفاہ عام کا بڑا خیال تھا شہر کے ناداروں کا وظیفہ معین کیا انگریزی اسپتال یونانی شفاخانہ۔ محتاج خانہ اپاہج خانہ بنوایا جو ابتک موجود ہے۔ گومتی پر لوہے کا پل بنوایا۔

علم نجوم کے بڑے ماہر تھے رصد خانہ سلطانی تعمیر کرایا اور زیچ سلیمان جاہی مرتب کرائی۔

لیتھو کا چھاپہ خانہ کھولا ڈرامے کی بنیاد قائم کی رقص و سرود کو ترقی

۱؎ لکھنؤ میں چھینکنے پہ ناک کٹنا محاورہ اسی سے بنا ۱؎ فسانۂ عبرت ۲؎ تاریخ اودھ

اور عالموں کی کثرت ہوئی شعر و سخن کا ذوق اور سپہ گری کا شوق بڑھا سارا شہر ہتھیار بند ہو گیا تعزیہ داری کو بہت عروج ہوا۔ ذوالجناح اور مہندی نکالنے کی ابتدا کی آٹھویں ربیع الاول تک ایامِ عزا قرار دیئے ایک عالیشان کربلا تعمیر کرائی میر ضمیر نے تحت لفظ مرثیہ پڑھنے کا طریقہ ایجاد کیا۔

اہلِ بیت سے مودت اور عقیدت عام تھی اہلِ سنت تفضیلی تھے ہندو مسلمان سب تعزیہ داری کرتے تھے پہرہ وار علم حیدر جا گو کہہ کے پہرہ دیتے تھے فقیر مناقب پڑھ کے بھیک مانگتے تھے یہ لکھنؤ کے شباب کا زمانہ کہا جاتا ہے اس وقت لکھنؤ کا تمدن یہ تھا۔

لباس کا شوق۔ عطر کا ذوق۔ سپہ گری میں مہارت ہتھیار سے لیس شہسواری بٹیر بازی مرغ بازی عشق و عاشقی شعر و شاعری رقص و موسیقی علوم و فنون کی قدر جسمانی تکلیف کا اتنا تحمل کہ زبان سے ہائے وائے نہ نکلے خوش خوراکی اور کم خوری مفلسی کو چھپانا۔ اپنے کو خوشحال ظاہر کرنا ادب و تعظیم کا لحاظ رفتار و گفتار میں سنجیدگی وقار بازاریوں کے الفاظ سے پرہیز نکتہ رسی و بذلہ سنجی خلق و انکسار باتوں میں اپنی تعریف اور نمائش کا پہلو نہ آنے دینا گفتگو میں تشبیہ و استعارہ صنائع کا صرف شعروں اور مصرعوں کا برمحل استعمال ہر بات میں اپنے اوپر نگاہ احتساب کہ کوئی فعل نفاست و سنجیدگی کے خلاف سرزد نہ ہو۔ اس معاشرہ میں نسلیں گذر گئیں ذہن اس سانچے میں ڈھل گئے سپہ گری کی آن بان کے ساتھ خلق و انکسار عشق و عاشقی اور رقص موسیقی کے ساتھ تہذیب و وقار نفاست و نزاکت مزاج بلند نظری جدت اور جودت طبع حاضر جوابی نکتہ سنجی فصاحت و بلاغت اہلِ لکھنؤ کی خصوصیت اور شناخت بن گئی۔

ناسخ کی شاعرانہ اصلاحیں

اسی فضا میں ناسخ نے نشوونما پائی ان میں فصاحت کا شعور ذوق سلیم شاعرانہ حیثیت صلاحیت جدت طبع بے انتہا تھی ان کی فطری صلاحیتیں لکھنؤ کی تہذیب نفاست کے سانچے میں ڈھل کر بسیار گوئی ذوق کی شکل میں نمودار ہوئیں جس کا لکھنؤ کی تہذیب تقاضا کر رہی تھی انھوں نے زبان کی صفائی پاکیزگی کے ایسے قاعدے بنائے اور ان پر عمل کر کے فصاحت و بلاغت کا ایسا معیار قائم کیا کہ لوگوں کو ان کی تقلید سے گریز ممکن نہ ہوا۔ شاعری میں مضامین کی سنجیدگی اور ادائے مطلب میں جدتوں سے ایسی دلکشی پیدا کی کہ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی ہر جگہ کے شاعر نے اس کی تقلید کی کہنہ مشق اپنے انداز کو چھوڑ کے ان کی پیروی کرنے لگے مصحفی ایسے استاد کل اتنا مرعوب ہوئے کہ سر مشاعرہ ان سے غزل پڑھنے کی اس طرح فرمائش کی ؎

ہاں مگر شیخ کی خدمت میں یہ ہے اپنا سوال جو پڑھ چکے ہم تو کچھ اب آپ عنایت کیجئے

معلوم ہوتا ہے کہ غزل کہتے وقت ناسخ کا اتنا رعب تھا کہ نہیں معلوم وہ اس زمین میں کیا کیا گلکاریاں کریں گے عنایت کیجئے کے قافیہ میں دل کی بات بے اختیار زبان پر آگئی۔

اپنے چھپے دیوان کے مقدمہ میں ان کی تقلید کا صاف لفظوں میں اعتراف کیا ہے:۔

تخلص خود را اسم بالمسمیٰ نگاشتہ بر طرز ریختہ گویان

سادہ کلام در عرصہ قلیلے خط نسخ کشیدہ ——————

غزلیات ایں دیوان ششم را اکثرے بر رویہ الیشاں گفتہ

غالب ایسا مغرور شاعر جو بڑے بڑوں کی حقیقت نہیں سمجھتا کسی کی جھوٹی تعریف کو کبھی کہتا اور اپنے لیے اس کو ننگ و عار جانتا ہے ناسخ کے

آفتاب کمال کے سامنے سر بسجود ہو جاتا ہے اور ان کو موجد و مجدد و مصلح زبان و شاعری تسلیم کرتا ہے۔ عبدالغفور نساخ کو ایک خط میں لکھا ہے:۔

"ہم فقیر لوگ اعلان کلمۃ الحق میں بے باک اور گستاخ ہیں شیخ امام بخش ناسخ طرز جدید کے موجد اور پرانی ناہموار روش کے ناسخ تھے۔"

ناسخ کو اپنے دیوان کے ساتھ جو خط بھیجا ہے اس کے ایک ایک لفظ سے وہی عقیدت ٹپکتی ہے جو ایک لائق شاگرد کو اپنے باکمال استاد سے ہونا چاہیے۔

غالب کا خط ناسخ کے نام

"ایں ورقہائے بخون جگر نگار بستہ ارمغانیست بغالب جگر خستہ بحضرت خدام والا مقام سخن سنج۔ معنی نیاہان امید گاہ بی نظامان نظام ظہوری ظہور۔ نظیری نظیر فیضی فیض۔ ضمیری ضمیر۔ شافی شان نوائی نوا۔ فغانی فغان۔ در علم صائب دو در عمل راسخ مخدوم معظم مطاع مکرم۔ مولانا ناسخ کہ در سخن طرح نوی ریختہ اند و در ریختہ نقش بدیع انگیختہ اند فرستادن ایں فہرست نادانی بدان دانا آموزگار نہ ازاں رواست کہ طبع آہنگ نمائش و ہمت بعرض تجمل گرائش دارد بلکہ نامہ نگار دریں پردہ سگالیدہ است کہ تغیر ایں تیرہ بخت سرانجام قلم و تحریر بلیغان نگاہ قبول مولانا رو بنشیند زدوانچہ بجز لک انصاف قابل ازیں اوراق سترون نوشیدہ است بغازہ تحسین مخدوم رخ امتیاز افروزد۔۔۔"

ناسخ نے اپنا دیوان مرزا موسیٰ جان کے ہاتھ غالب کو بھیجا تھا اس کا شکریہ جن الفاظ میں ادا کیا ہے اس کے ضروری اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

"ندانم چہ می نگارم کہ دریں نگارستن نگاہ از ناز بدیدہ درمی گنجد و
دریں نگارش خامہ از شادی در بنان می رقصد ۔ بخت را برسائی
ستایم و پندارم کہ بطور معنی رسیدہ ام و خود را بگمان مائگی آفریں
گویم و انگارم کہ سوئی را باید بعصا دیدہ ام۔
زہے دیوان کہ سوادش از دودۂ چراغ طور است و غلافش از دیبائے
طاحور قمہ معنی را گنجینہ ۔ چوں بگوئی خواہ نامہ گرا ورد نگارندہ ایں نگیم
شادم کہ ایں نامہ دومیں نقش است از آں خامہ اگر ان نقش تیغ
نامہ دلپذیر نبودے مرا ایں راہ بجستی نظر نبودے ۔
آرے ہر متاعے را کہ بیک نامے نام برآورد گرد چشم زخمش
بہمہ بیشتر آید سبحان اللہ سخن بروزگار مخدوم بپایہ بلند بود
دارد و بار رونق دیگر پدید آمد ۔"
(پنج آہنگ)

اس خط میں غالب نے ناسخ کے مقابلہ میں اپنی ہیچ میرزی اور ان کے کمال کا جن لفظوں میں اعتراف کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان سے بہت مرعوب تھے اور ان کے مقابلے میں کسی شاعر کی حقیقت نہیں سمجھتے تھے ۔ کچھ انھیں پر موقوف نہیں اس وقت کے تمام ادبا و شعرا ان کے طرز سخن کے شیدا اور اس کی تقلید حسن کلام کی ضمانت سمجھتے تھے دہلی کے مستند اہل زبان اور قادر الکلام شاعر مرزا قادر بخش صابر گلستان سخن میں یوں زمزمہ سرا ہیں ۔

"گرسنہ ہزار اس کے مائدہ سخن سے زلہ ربا دعویداران کمال اس کے شوکت
الفاظ سے پائمال اہل انصاف اس کو استاد مانتے اور ارباب فہم
اس کے شعر کو سحر جانتے ہیں ۔"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ گلشن بے خار میں یوں نغمہ طراز ہیں۔

"نسیم طبعش نکہت ریز۔ شمیم گل فکرش دل آویز۔ طائر بلند پرواز
غورش جز بشاخ سدرہ آشیانہ نسازد۔ و مرغ تیز بال خیالش جز
بہ بام فلک جلوہ نیا ندازد ۔ والا مایہ ۔ بلند اندیشہ ۔ نازک خیال و
در تلاش مضمون تازہ و معنی سیراب بے مثل و بے مثال"۔

مؤلف تذکرہ بہارِ بے خزاں یوں گل فشانی کرتے ہیں :۔

"سحر بیان استاد نزاکت بنداں زبان بود"

تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے مؤلف لکھتے ہیں :۔

"ناسخ رسم کہن مجتہد شعر و سخن ۔ صاحب رائے سلیم یادگار رضا و
کلیم خلاق معانی شیریں بیان مرحوم مغفور شیخ امام بخش ناسخ۔"

مؤلف بہارستان اودھ رقمطراز ہیں :۔

شیخ امام بخش ناسخ سر دفتر شعرائے عظام لکھنؤ مانا گیا ہے فصاحت و معنی آفرینی میں یکتائے روزگار تھا فکر رسا اور بلاغت کلام میں مرزا صائب اور ملا ظہوری سے گوئے سبقت لے گیا ہے

طرز اندیشہ آفریدہ اوست   در تن لفظ جان دمیدہ اوست

نصر اللہ خان خویشگی گلشن ہمیشہ بہار میں لکھتے ہیں ۔

شاعر غرا کلامش از سخن معرا طبعش نکہت انگیز فکرش دل آویز
والا مایہ عالی پایہ بلند اندیشہ

ناسخ کی زبان و شاعری کے قبول عام کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کا کلام لکھنؤ کا تحفہ سمجھا جاتا تھا شیفتہ ان کے حال میں لکھتے ہیں :۔

جدید غزلوں کے بھی دو تین اشعار جو بعض احباب تحفۃً لکھنؤ سے لائے

تھے قلم بند کئے گئے۔"

(گلشن بےخار)

صفیر بلگرامی نے جلوۂ خضر میں غالب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب ناسخ کا کلام دہلی پہنچا تو ایک دھوم مچ گئی، میں نے اور مومن نے ان کا متبع ہونا چاہا۔

اتنی پسندیدگی کی وجہ سمجھنے کے لئے انہی لوگوں کے بیانات پر غور کرنا چاہیئے۔

مصحفی:- طرز جدید کے موجد متقدمین کے کلام پر خط نسخ کھینچ دیا۔

غالب:- طرز جدید کے موجد۔ پرانی ناہموار روش کے ناسخ۔ شاعری کو پایہ بلند پر پہنچایا۔ اردو کے قالب میں روح تازہ پھونکی۔"

شیفتہ:- ان کا کلام دل آویز۔ ان کی فکر بلند۔ خیال نازک تلاش مضمون تازہ اور معنی سیراب میں بے مثال۔

نصر اللہ خان:- طبع نکہت انگیز فکر دل آویز۔ بلند اندیشہ۔ نازک پیشہ۔

مرزا قادر بخش صابر:- شوکت الفاظ سے ان کا کلام سحر ہے۔"

سعادت ناصر خان:- ناسخ رسم کہن خلاق معانی۔

بہار بے خزاں:- سحر بیان استاد نزاکت بندان زبان

بوستان اودھ:- بہ نصاد جدت معنی آفرینی میں یکتائے روزگار میرزا صائب اور ملا ظہوری سے بازی لے گئے۔

ان اقوال سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کے نزدیک بلند پروازی معنی آفرینی نازک خیالی طرز ادا میں جدت اور زبان میں فصاحت و بلاغت تھی جس کی وجہ سے ناسخ کے کلام میں دلکشی ہے اور یہی باتیں شاعری کی جان ہیں یہی دہلی و لکھنؤ کا فن ہے فرق صرف اتنا ہے کہ لکھنؤ میں یہ فن سنجیدہ صاف ستھرا اور معراج کمال پر پہنچا ہوا ہے اس کی تفصیل لکھنؤ کی شاعری کو سمجھنے میں مدد دے گی۔

زبان میں ناسخ کی انقلابی اصلاحیں

۱۔ گنواری بازاری۔ بھونڈی۔ بھدی لفظیں اور ترکیبیں ترک کیں۔

۲۔ تذکیر و تانیث کا تعین بڑے سلیقہ سے کیا۔

۳۔ علامات فاعلیت وغیرہ کا ترک ممنوع قرار دیا۔

۴۔ حرف کا دبنا۔ گرنا اور بڑھنا ترک کیا۔

۵۔ تعقید اور اضمار قبل الذکر سے پرہیز کیا۔

ان اصلاحوں سے زبان میں روانی سلاست اور صفائی پیدا ہو گئی۔

۶۔ شعر کی ایک خاص زبان بنائی۔

لکھنؤ کی مادری زبان لکھنؤ میں دو زبانیں بولی جاتی ہیں ایک گھر کے اندر کی زبان ہے جسے اہل لکھنؤ کی مادری زبان کہنا چاہیئے اس میں عربی فارسی لفظوں تشبیہوں استعاروں اور صنعتوں کا بڑا ہلکا پھلکا استعمال ہے بچے بوڑھے عورت مرد سب یہی زبان بولتے ہیں۔ مثلاً مزاج عالی مزاج اقدس گھر کے اندر کی زبان نہیں اس کی جگہ مزاج اچھا ہے؟ مزاج کیسا ہے؟ کہتے ہیں بڑے بڑے علماء گھر کے اندر اسی سادی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔

ہم آپ کو لکھنؤ کی دو ہمسائیوں کی بات چیت سناتے ہیں ایک ہمسائی اپنے گھر کی کھڑکی سے دوسری ہمسائی کے گھر آئی ہیں۔

بہن تسلیم۔ تسلیم مزاج اچھا ہے آج کدھر بھول پڑیں؟ کیا بتاؤں سارا دن الم غلم میں گذرتا ہے گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی آج سب کاموں کو تج کے آئی ہوں۔ بٹیا کہاں ہیں؟ کمرے میں سو رہی ہیں رات کو باجی اماں کے یہاں رتجگے میں گئی تھیں۔ ماشاء اللہ کیا سن ہے؟ خدا رکھے ڈنگنا برس ہے

اللہ سلامت رکھے اب تو شادی کا سن ہوگیا کہیں سے بات آئی ہے ؟

ہاں چچا کے لڑکے کا پیام ہے مگر وہ شہدہ پاک پنج عیب شرعی نہ کماتا ہے نہ کجاتا ہے۔ کنکیا ہے اور وہ ہے محلے لفندرے گھیرے رہتے ہیں باپ کی دولت ہے جو ہوا میں اڑ رہی ہے۔

باپ دیتے کیوں ہیں ؟ اے لو۔ کیوں نہ دیں چہیتے ہیں اکلوتے ہیں۔

نوج۔ "ایسی چاہت پر خدا کی مار" جو بچے کو برباد کر دے خدا رکھے بہن کا لڑکا بھی تو سمجھدار ہو گیا۔

دو کی بیوی۔ آپ کہاں رہتی ہیں اس کی تو شادی بھی ہو گئی۔ اے سچ کہئے کہاں ہوئی ؟ پھوپھی کی لڑکی سے۔

خدا مبارک کرے۔ لڑکی کیسی ہے ؟

چندے آفتاب چندے ماہتاب کا منی سی مورت۔ بوٹا سا قد نک سک سے درست خوبصورت۔

کچھ سلیقہ کی بھی ہے ؟ کیوں نہیں سینا پرونا پکانا ریندھنا کیا نہیں آتا ماشاء اللہ پانچوں انگلیاں پانچ چراغ ہیں۔

میاں کا کیا حال ہے ؟ پروانہ ہے دیکھے جیتا ہے۔

جہیز کیا ملا ؟ ارے جہیز کی بھلی چلائی موئی بچھیا بہن کے نام بیچ کھچ گئے ٹوٹے پھوٹے دو چار ٹھیکرے بوری بوری کپڑے انھیں کے ہاتھ لگ گئے دو چار تار چھچھڑے۔

چلو دو سر تو جڑ گئے۔ ہاں خدا رکھے گھر آباد ہو گیا میاں بیوی دونوں خوش ہیں۔ بس اور کیا چاہیئے۔

خدا رکھے صاحب زادے کا کیا حال ہے ؟

بہن کیا بتاؤں خدا موت دے ایسے لڑکے سے نہ ہونا اچھا۔

اے نوج - دور پار - چھائیں پھوئیں - شیطان کے کان بہرے انگریز بندوں کو۔ آپ کو وہم بھی نہیں آتا جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ خدا رکھے ابھی سن ہی کیا ہے ؟ اے سن کیوں نہیں موا لونبڑ ہو گیا نہ لکھنے کا نہ پڑھنے کا سارا دن کنکوے پیچھے لقر لقر کرتا پھرتا ہے نہ کھانے کی سدھ نہ پینے کی۔ سوکھ کے کانٹا ہو گیا آنکھیں ہیں کہ ڈھکر ڈھکر کر رہی ہیں دو نوالے اتارے اور بھاگا دو نوالے اتارے اور بھاگا کا کھائے گا دن بھر میں پانچ چھ دفعہ مگر وہی دو چار نوالے وہ بھی بیٹھ کے اہل دل ہیں۔ جاتا کہاں ہے، باہر تو میں نکلنے نہیں دیتی وہی بارہ دری کے سامنے والے ہاتے (احاطہ) میں دن بھر ادھم مچائے رہتا ہے۔

اکیلا ؟ نہیں اکیلا کیوں ہرمزی خانم کا لڑکا اچھے صاحب کا لڑکا اور محلے کے دو چار شہدے۔

خدا رکھے سن آئے پر سنبھل جائے گا بچپنا ایسا ہی ہوتا ہے شادی بیاہ ہو گا بیوی بچوں میں پھنس جائے گا پھر کہاں کا کنکوا کہاں کا وہ اے بہن آپ کی بھی باتیں یہ عادتیں کہیں چھٹتی ہیں بچپنے سے سنتی آ رہی ہوں۔ نواب آغن صاحب میں ان بڑا ہے کنکوا لڑ رہا ہے پوتا پوتی نواسا نواسی والے ہو گئے مگر کنکیا ہاتھ سے نہ چھوٹا تھی نہ چھوٹی۔ ارے سب ایسے تھوڑی ہوتے ہیں اتنے بڑے شہر میں ایک نواب آغن صاحب ایسے نکل گئے تو کیا۔ اے ایک انہیں پہ تھوڑی موقوف ہے ایسے نہیں معلوم کتنے آغن صاحب شہر میں

نوٹ:۔ خط کشیدہ فقرے عورتوں سے مخصوص ہیں باقی عورت مرد سب یکساں بولتے ہیں۔

لہ تکرار بار بار کے مفہوم کو ظاہر کرتی ہے۔

ہیں۔ آخر ان سے کنکیا لڑانے والے بھی تو ہوں گے۔

لکھنؤ کی ادبی زبان | دوسری زبان باہر کی ہے یہ ذکاوت و ذہانت ادبیت اور قابلیت کے اظہار کی زبان ہے اس میں عربی۔ فارسی لفظیں تشبیہیں استعارے اور صنائع و بدائع ہیں ناسخ نے اس زبان کو شعر میں اس خوبی سے استعمال

لکھنؤ کی ٹکسالی زبان | کیا کہ عربی فارسی لفظوں اور ترکیبوں سے ؎

تماشائے بجوش غلطیدن بسمل پسند آیا

یا

سلسلہ روز و شب نقش گر حادثات

کی طرح فارسیت نہیں پیدا ہونے پائی بلکہ اردوئے معلیٰ بن گیا ؎

یہ سما عدون کا ہے اس کے عالم کہ جس نے دیکھا ہوا وہ بیدم

نیام تیغ قضائے مبرم نقاب ہے قاتل کی آستیں کا

ناسخ کے اس شعر میں ان کے اور شعروں کی بہ نسبت عربی فارسی لفظیں اور ترکیبیں زیادہ ہیں۔ یہ شعر خاص طور پر اس لیے منتخب کیا گیا ہے کہ عربی فارسی لفظوں اور ترکیبوں کی افراط کے بعد بھی ناسخ کے شعر سے فارسیت نہیں ٹپکتی بلکہ نہایت فصیح اردو معلوم ہوتا ہے اسی کو ٹکسالی زبان کہتے ہیں۔ لوگ اس کا مطلب نہیں سمجھتے وہ اسے مستند زبان کے معنی میں بولتے ہیں۔

ٹکسالی زبان کے معنی | دنیا کی کسی زبان میں مستند زبان کو ٹکسالی نہیں کہا جاتا۔ ٹکسال میں سکے ڈھلتے ہیں زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں یہ صرف اردو میں ناسخ کی زبان کے لیے کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ محلہ ٹکسال میں وہ رہتے تھے ان کی زبان میں جو شعر کہتا تھا اس کی تعریف میں کہا جاتا تھا کہ یہ ٹکسالی زبان ہے یعنی ناسخ کی زبان ہے باہر والوں نے اس کا مطلب نہیں سمجھا وہ اسے مستند زبان کے معنوں میں بولنے لگے۔

شاعری میں ناسخ کی انقلابی اصلاحیں

۱۔ بھونڈے بازاری اور اوباشانہ مضامین اور انداز بیان کو ترک کر کے تہذیب و شائستگی پیدا کی۔

۲۔ ہر طرح کے اخلاقی تمدنی اور فلسفیانہ مضامین غزل میں داخل کیے۔

۳۔ صنائع و بدائع تشبیہ و استعارے ایہام و اشاریت سے نئی راہیں کھولیں۔

۴۔ ادائے مطلب کے سیکڑوں طریقے بتائے ؎

بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا ∴ روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

معجزہ شاعرانہ ہے۔ شعرا نے اس زمین میں غزلیں کہیں مرثیہ گویوں نے سلام کہے۔ میر انیس ایسے خدائے سخن نے سلام کہا اور پوری قوت سے کہا مگر اس کا جواب نہ کہہ سکے اس کی ساری خوبی ادائے مطلب میں ندرت سے ہے۔

شدت جنوں سے برہنگی کی حالت کس طرح بیان کرتے ہیں ؎

پوچھتا اشک اگر گوشۂ داماں تا ∴ چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا

عالم بیخودی

دل کو خوش آئی ہیں صحرا کی بولیں پر خار ∴ اب کسی سرو گل اندام سے کچھ کام نہیں

دنیا میں مجھ سے زیادہ گناہگار کوئی نہیں۔ ؎

نجات ہو گی عذاب حساب سے سب کو ∴ جو پہلے روز قیامت مرا حساب ہوا

مفلسی کی وجہ سے کوئی پرسان حال نہیں۔

سد راہ کس و ناکس ہے مرا شہرۂ فقر ∴ ورنہ کب مجھ کو میسر کوئی درباں ہوتا

ترکِ دنیا میں آسودگی ہے ؎

کھلے دروازے ہر شب چین سے سوتے ہیں ہم جیب سے !

دیا ہے خانۂ ویرانی کو عہدہ پاسبانی کا !!

اسی مضمون کو دوسری طرح یوں کہا ہے ؎

بادشاہی کر رہے ہیں اس زمانے کے فقیر بھی ؛ بخت خفتہ کو کہیں اطاق لحد بیدار ہم

معشوق کے باغ میں جانے سے گلوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور باغ بے رونق ہو گیا۔ اس مضمون میں ناسخ کا اہتمام اور جدت دیکھیے وہ کہتے ہیں کہ باغ کی ساری رونق اس وجہ سے ہے کہ تو اپنی نزاکت سے باغ میں نہیں جاتا اگر تو اپنی نزاکت سے باغ میں جانے کی اجازت مانگے تو روئے گل سے رنگ اڑنے کی اجازت طلب کرے ؎

تو نزاکت سے گلستاں کی جو رخصت مانگتا ؛ رنگ روئے گل سے اڑنے کی اجازت مانگتا

گلوں کی پردہ دری کیا ہو بلی تمھیں منظور ہے ؛ جو آج سیر گلستاں کو بے نقاب چلے،

رفتار ناز کا اثر دیکھیے۔

آستین زن سے بجھا کوئی چراغ جاں پہ ہے ؛ کہا گیا واں روشِ ناز سے ٹھوکر دامن

قناعت کا فائدہ کس طرح بیان کیا ہے ۔

فاقہ مستی پہ قناعت ہو جو تم کو ہمیشہ ؛ ہے لبالب بادۂ عشرت خمِ افلاک میں

اپنی عاشق مزاجی کس انداز سے بیان کی ہے ؎

تو نے شہبازِ نظر کو جو ادھر چھوڑ دیا ؛ ہم نے بھی طائرِ دل باندھ کے پر چھوڑ دیا

معشوق کے چہرہ کے سامنے چاند سورج ماند پڑ جاتے ہیں اس کو کس طرح کہا ہے۔

جلوہ رخسارِ تاباں سے وہ رشک مہر ماہ ہے ؛ چاند سورج کو بنا دیتا ہے تارا چاند کو

عشق میں جان نہیں بچتی اس مضمون میں ناسخ کی جدت دیکھیے۔

تنگ ہوں زیست سے ہو جاؤں کسی پر عاشق ؛ کوئی اور اس کے سوا مرنے کی تدبیر نہیں

دنیا کی ہر چیز بے ثبات و ناپائیدار ہے اس مضمون کو کس طرح ادا کیا ہے ؎

عیاں ہے ہر حباب بحر سے کیفیت دنیا ؛ برائے چشم بینا ہیں ہزاروں جام جم پیدا

مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے ایک دفعہ ناسخ کا یہ مطلع پڑھا ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا ؛ طلوعِ صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

اور کہا کتنا سجا ہوا مطلع ہے مگر ہمارے دل پر کیا اثر کرتا ہے ؟

میں نے کہا اگر اس سے ان کے شاعرانہ کمال سے انکار ہے تو مجھے اختلاف ہے۔ جب پہلے پہل یہ مطلع میں نے سنا تو مجھ پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی اس سے پہلے کسی نے اس مضمون کو اس طرح ادا نہیں کیا جس اہتمام سے انہوں نے کہا ہے ادائے مطلب کے ان اسلوبوں سے اردو پہلی مرتبہ ناسخ کی بدولت واقف ہوئی انھوں نے نئے اسلوب کی راہیں کھولیں تشبیہ و استعارے کے استعمال کے نئے نئے طریقے بتائے زبان میں ادائے مطلب کی صلاحیتیں پیدا ہوئیں۔

ناسخ سے پہلے اردو میں غالب و اقبال کہاں تھے یہ سب ناسخ ہی کے خوشہ چیں ہیں وہ کون سا اسلوب اور مضمون ہے جو غالب نے ناسخ سے نہیں لیا۔

مرزا صاحب مسکرا کے چپ ہو رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ناسخ ہی نے زبان کو اس قابل بنایا کہ اس میں ادائے مطلب کی صلاحیت پیدا ہوئی ایک ہی بات کو سیکڑوں طرح سے کہا ہے ایک شب ہجر کے مضمون کے ہر شعر میں اندازِ بیان کی ندرت دیکھیے۔

طولِ شبِ فراق کے شکوے سے فائدہ ؛ ہم جاں بلب ہیں ہم کو امید سحر کہاں

شبِ فرقت میں شمع کا کیا ذکر ؛ زندگی کا چراغ بجھ گیا ہے

وہ کہہ گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے ؛ تمام رات چراغوں سے دل کے داغ جلے

روز اک شام و سحر کرتا ہے پیدا ہجر خلق
صبح میری شام غم کو تمام کرتا نہیں

شبِ فراق نہ دیکھی نہ میں نے روز سیاہ
کبھی نہ ہوش تمہارے فراق میں آیا

آفتاب حشر بھی تارا ہے اس کی شام کا
گردش ایام میں صبح شب ہجراں نہیں

ہے بیاں کس کو شب فرقت میں ہوش
ہو چکی ہوگی ہزاروں بار صبح

وصل میں تھا صبح سے بیزار میں !
ہجر کی شب مجھے ہے بیزار صبح

وصل کی شب ہو چکی اندھیر ہے
شام سے دکھلاتی ہے آزار صبح

وصل میں غائب تو حاضر ہجر میں
دیتی ہے ہر شب نیا آزار صبح

توقع ہے شب فرقت میں مجکو صبح ہو چکی
معاذ اللہ کتنا موت سے انساں غافل ہے

رات ایسا انتظار یار میں بیتاب تھا
بستر گل نہ تھا میں آگ پر سیماب تھا

رات مجکو ترے آنے سے جو مایوسی ہوئی
انتظار مرگ تھا یا اشتیاق خواب تھا

خواب ہی میں نظر آیا وہ شب ہجر کہیں
سو مجھے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا

ہے شب ہجر تا ابد نہیں صبح
نہ رہا خوف روز محشر کا

صنعتوں کا استعمال | صنعتوں کے استعمال سے وہ شعر میں جس طرح لفظی و معنوی حسن پیدا کرتے ہیں اس کی تعریف نہیں ہو سکتی ؎

کشتی اس کی نہ ڈوبے صورت موج
جو کہ طوفاں کو ناخدا سمجھے !

کتنا بلند خیال ہے اس کو کتنی روانی اور فصاحت سے پیش کیا ہے اور کشتی - موج - طوفان - ناخدا سب جمع کر دیا ہے ؎

سیر خشکی و تری گھر میں میسر ہو جائے
دل اگر آئینہ ہو جائے سکندر ہو جائے

وحشیو کہتی ہے زنجیر باواز بلند
بستۂ عقل جو ہے غم سے وہ آزاد نہیں

چلا عدم سے میں گھبرا کے تو بولی یہ تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار دیتا جا

کس قدر بلند مضامین ہیں ان کو کس روانی برجستگی صنائع و بدائع اور طرز

ادا کی ندرت کے ساتھ بیان کیا ہے اور سنئے ؎

اے اجل کی تو نے بارِ جسم سے اگر نجات
کب سے میری پیٹھ پر یہ خاک کا انبار تھا

عشق جب کامل ہوا ہے عین حسن
آگ میں پڑ جائے جو سمٹے آگ ہے

تحفہ آفرینی ملاحظہ کیجئے ؎

ہمارے کیف کو کچھ خوف احتساب نہیں
خیال چشم ہے یاں ساغر شراب نہیں

جانب رحمت حق دھیان ہے ابرِ ندامت کا
شاد ہو جاتے ہیں کیا دیکھ کے میخوار گھٹا

جیتا فراق کا نہیں ہرگز حساب میں
مدت ہوئی کہ مر چکے ہیں ہم حساب سے

حذف وفا سے ندرت | ان کا ایک خاص اسلوب الفاظ و فقرات کے حذف سے بیان میں ندرت پیدا کرتا ہے ؎

ہر ایک کی صدا لئے قدم دور تک پہنچا دل
بہتر ہے مجکو یاس ترے انتظار سے

وہ بدگمان سمجھتا ہے چاند کا مشتاق
کبھی جو ہم سوئے گردوں نگاہ کرتے ہیں

فصل گل ہے پیارو ایام توبہ ہے مدام
عمر بھر اے میکشو باب اجابت باز ہے

آتا ہے رشک اے دل پر آبلہ تجھے
کیا جلد پھوٹتا ہے پھپھولا حباب کا

اشاریت | اشاریت کے معنی ہیں ایک نازک کنایہ سے ذہن کا معنی کی طرف منتقل ہونا ادائے مطلب کی اس ندرت سے لطف معنی بڑھ جاتا ہے اور یہ شاعری کا بڑا نازک مرحلہ ہے ناسخ نے اس میں جو کمال دکھایا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی ؎

خود عتاب ہے دھوئیں کے مثال
ہائے کیا آج رات کالی ہے !

خلل پذیر ہمیشہ ہے کارخانۂ عقل
کبھی نہ خانۂ زنجیریاں خراب ہوا

ابہام | کسی بات کا واضح طور پر نہ کہنا ابہام ہے شاعری میں ابہام اسی لطف پیدا کرتا ہے جب وہ سیکڑوں وضاحتیں اپنے دامن میں لئے ہو نہیں تو مہمل ہے ناسخ نے

اس میں جو کمال دکھایا ہے اس کی مثال اُردو میں کوئی نہیں ہے ؎

دل اس بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے
خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

حیات و کائنات کے مسائل | زندگی کی تلخ حقیقتیں کس شاعرانہ انداز میں پیش کی ہیں ؎

عالم ہے محوِ آئینہ خانہ کی سیر میں
اپنے سوا کسی کے کوئی روبرو نہیں!

تمام صفحۂ عالم ہے ایک ہی صفحہ
سرِ کتاب کا یہ اک ورق تمام نہیں

موسمِ گل کر گیا پرواز باغِ دہر سے
یاں ابھی تنکے ہیں پھر آشیاں منتقل نہیں

دشمن اگر وہ دوست ہوا ہے تو کیا عجب
یاں اعتبار دوستیِ جسم و جاں نہیں

ہمصفیرو دیکھنا قسمت چلی اُلٹی مرا
اُڑ کے گلشن کو جو بعدِ ذبح اپنے پر چلے

ہم میکدے میں آئے تو خالی نظر پڑے
رہتے تھے خم تمام جو اول بھرے ہوئے

ذکرِ پرواز تو کیا تنگ ہے اتنا یہ چمن
جھاڑ بھی سکتے نہیں ہم کبھی شہپر اپنا

روز مرہ اور سادگی دیکھیے

ہے عجب رنگ کی وحشت تیرے دیوانے میں
دل نہ آبادی میں لگتا ہے نہ ویرانے میں

وصل میں بھی تھے کہ جس دل کو نہ آتا تھا قرار
اے فلک تو نے کیا اس کو گرفتارِ فراق

تجھ سے انصاف تو کر چھٹ نہ سکا ایک عجب
میں نے کیونکر تری اُلفت میں زمانہ چھوڑا

بھولا وہ غمِ دوست کہ سینے ہی میں دل گھبرا گیا
غمِ عالم کی اگر دل میں سمائی ہوتی

صحنِ گلشن میں جو اس گل کی سواری آئی
سمجھے مرغانِ چمن بادِ بہاری آئی

لو بیٹھے ہوئے تھے آپ کی دولت سے بن گئے
بگڑے ہوئے تمام ترے کام بن گئے

فراقِ یار میں فصلِ بہار آئی ہے
الٰہی آتشِ گل سے تمام باغ جلے

تمثیل | ان کی بڑی خصوصیت تمثیل ہے جس میں انھوں نے غالب کو بھی پیچھے ہٹا دیا اور ایسی نادر تمثیلیں پیدا کیں جن کا مثل اُردو میں نہ تھا ؎

عشق سے کس کے دل کو لاگ نہیں
کون سا گھر ہے جس میں آگ نہیں

چوٹ دل کو جو لگے آہ رسا پیدا ہو
صدمہ شیشہ کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو

رہتا ہے کہاں ساتھ بُرے وقت میں کوئی
پتھر کو لگی چوٹ شرارے نکل آئے

آزادہ ہیں تیوروں سے اُفتادگانِ خاک
اُڑتا پھرا شجر سے جو برگِ خزاں گرا

شوخی | ان میں سنجیدہ ظرافت اور متین شوخی بھی تھی جو خاص لطف پیدا کر دیتی تھی ؎

خبر کرے کوئی زاہد کو آئے بہرِ خدا
شکستِ توبہ کو پھر موسمِ بہار آیا

کعبہ میں جا کے بیٹھ رہوں گا میں دیکھنا
تو دیر سے نکالے گا اے بت اگر مجھے

مے پرستو آؤ کر لو محتسب کو سنگسار
بچ رہے ہیں سنگ کچھ میخانے کی تعمیر سے

توڑی واعظ نے اگر گردنِ مینا ناسخ
مے پرستو نے بھی مسجد کا منارہ توڑا

صبحدم جب صحنِ مسجد میں اذاں ہونے لگی
ہم نے بھی میخانے کے دروازہ پر آواز دی

جو ہم فنا ہوں تو لازم ہے اے نظر بازو
ہمیں بھی یاد کرو جب کوئی حسین دیکھو!

تصوف | ان کے یہاں تصوف بھی ہے مگر وہ تصوف نہیں جو سمجھ میں نہ آئے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے مسلک شاعری کی مطابق بہت صاف اور واضح ہے ؎

سب طرف سے دیدۂ باطن کو جب یکسو کیا
جس کی خواہش تھی وہی ہر سو نظر آیا مجھے

تو کسی سے نہیں ہے بیگانہ
ہر کوئی آشنا نہیں تجھ سے

کس کی ہم جستجو میں نکلے تھے
نہیں پاتے کہیں سراغ اپنا

ہے جی میں آفتاب پرستوں سے پوچھیے
تصویر کس کی ہے ورقِ آفتاب میں

تغزل | غزل کا تیکھا پن ملاحظہ ہو ؎

بھول کر او چاند کے ٹکڑے اِدھر آ جا کبھی
میرے ویرانے میں بھی ہو جائے دم بھر چاندنی

تری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لیے پھرتے ہیں

گیا وہ چھوڑ کر رستے میں مجھ کو
اب اس کا نقشِ پا ہے اور میں ہوں

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں

دل ہی اس کا جانتا ہے جس پہ گذرا ہے یہاں — عشق کا صدمہ زبانوں سے کہا جاتا نہیں

آسماں پر دل فرشتوں کے بچھے جاتے ہیں آج — یہ زمیں پر پاؤں رکھنے کا نیا انداز ہے

چلنے سے عمرِ رواں اپنی ٹھہر جاتی ہے — جب ترا جلوۂ رفتار نظر آتا ہے

سو رمز کی کرتا ہے اشاروں میں وہ باتیں — ہے لطفِ تکلم سے خموشی میں زیادہ

سو رقص سے افزوں ہے پری رو ترا چلنا — پاؤں کی صدا لاکھ ترنم سے زیادہ

پوچھ اے ناصح نہ کچھ میری اداسی کا سبب — اب میں خود دن رات حیراں ہوں ہوا ہے کیا مجھے

بیٹھ جاتا ہوں جگر تھام کے میں دیوانہ — وہ پری رو مری محفل سے جہاں اٹھتا ہے

دل کو تھامے ہوئے بیٹھا ہے جو ہم فرقت میں — ہم نشیں آج بہت دردِ نہاں اٹھتا ہے

دل دوڑتا ہے کوچۂ دلدار کی طرف — جب سے نہیں ہے طاقتِ رفتار پاؤں میں

زبان کی یہ صفائی، بیان کی یہ سنجیدگی، مضامین کا یہ تنوع، طرزِ ادا کی یہ جدت، مضمون کی یہ خلاقی۔ تمثیلات کی یہ شان، صنعتوں کا یہ حسنِ استعمال نہ میر کو نصیب تھا نہ سودا کو۔ یہ اردو میں بالکل نئی چیزیں تھیں۔ انھیں کو دیکھ کے مصحفی مقلد ہوئے۔ غالب کو ان کی نشتریت محسوس ہوئی۔ نقادانِ سخن نے میر و سودا کے کلام سے مقابلہ کر کے فیصلہ کیا کہ ناسخ نے اس پر خطِ نسخ کھینچ دیا اور "در ریختہ طرحِ نوی ریختہ"۔

بعد کے شعراء نے اس طرحِ نو کی پیروی کی۔ غالب نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ ہم نے اور مومن نے ان کا اتباع کیا۔ ان کے بہترین اشعار وہی ہیں جن میں وہ ناسخ کی زبان و شاعری کے تتبع میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مثلاً

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا — اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا — غالب

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا ״

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا ״

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا — غالب

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا ״

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا ״

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا ״

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں — جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں ״

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے — آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا — مومن

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا — میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا ״

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا ״

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا ״

ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں ״

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو — عذر کچھ چاہیے ستانے کو ״

برق کا آسمان پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو ״

اک لحظہ نہیں قرار جی کو — موت آئے بس ایسی زندگی کو ״

کوئی نہ رہا جو پونچھے آنسو — کیا روؤں میں اپنی بیکسی کو ״

معلوم ہوا کہ ناسخ نے زبان و شاعری میں جو انقلاب پیدا کیا اس کو لوگوں نے زبان کے اعلیٰ معیارِ فصاحت و بلاغت پر پہنچنے اور شاعری میں ادائے مطلب کی جدتوں، تشبیہ و استعارہ کی ندرتوں، مضامین کی وسعتوں، خیالات کی بلندی، تہذیب و شائستگی، متانت و سنجیدگی کی وجہ سے پسند کیا۔ ان سب کی تفصیل آپ سن چکے۔ مصحفی، غالب اور سعادت ناصر خاں نے ایک بات اور کہی ہے کہ وہ پرانی ناہموار روش کے ناسخ تھے۔ اس پرانی ناہموار روش کو جب تک آپ نہ دیکھیں گے لکھنؤ یا ناسخ کی ہموار روش کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ناہموار روش مضمون، آبرو، میر و سودا سے مصحفی و جرأت تک باقی رہی اس لئے ناسخ سے پہلے کے تمام ادوار کا کلام دیکھئے۔

اردو شاعری کا ابتدائی دور

آبرو - یکرنگ - مضمون - ناجی - حاتم - آرزو - فغاں - مظہر

مجھے درد و الم گھیرے ہے نت میرے میاں جیسا تھا
انداز سے زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں
دل یوں ڈرے ہے زلف کا مارا سپید رنگ سیں
مسی کے چرچا غیر سے جا کر چھپو ندر چھوڑ دی
ہنسی تیری پیارے پھلجھڑی ہے !
چھپ کر تو لعلوں سے اس طرح آ پلنگ کے
کہتے ہیں ہم پکار سنو کان دھر سجن
یکرنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط
انگوٹھی لعل کی گرتی قیامت آج گر ہوتی
نہ لو کو یلد کو کہ خط رکھتا یا منڈاتا ہے
لیا اس گلبدن کا ہم نے بوسہ !
کئی عالم کئے ہیں قتل ان نے
دریائے اشک اپنا جب سر پر موج مارے
ہر شوخ خرابات کی کیفیت نہ کچھ پوچھو !
مفت سودا ہے لے یار کہاں جاتا ہے
کھا پیچ و تاب اب وہ ڈسیں مجھ کو کالیاں
نہیں آتا اسے تکیہ پہ آرام -
الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا
مگ کہتے ہیں مر گیا مظہر

خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں جیسا تھا — آبرو
جو خال اپنی حد سے بڑھا سو مسّا ہوا ،،
رتی سے اژدھا کا ڈیلے تو ان ڈھلا ہوا ،،
گھر جلا عاشق کا ان لوگوں کا کیا ٹوٹا ہوا ،،
یہی غنچے کے دل کی گھجھڑی ہے ! ،،
کوئی سنے زنبیاپے تیرے قدم کا کھٹکا ،،
گر غیر سے ملو گے تو دیکھو گے ہم نہیں — یکرنگ
رکھتا ہوں میں دو نین کہو تو نذر کرو لیں ،،
جنھوں کی ان پہنچی لڑ ہوئے وہ ایک ہلے — ناجی
مرے نقشہ کی خاطر لطف سے سبزی بنا لیجے ،،
تو کیا جو مار رقیبوں نے نکھارا — حاتم
کرے کیا دیکلا حاتم بچارا ،،
طوفانِ نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے — آرزو
بہار حسن کو دی آگ اس نے جب چمن میں پھولا ،،
آمرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے — فغاں
ظالم اسی لئے سینے زلفیں جیسی پالیاں ،،
یہ سر پاؤں سے تیرے ہل رہا ہے — مظہر
ڈبو لیا ہائے آنکھوں نے مشرہ کا تخا پیارا ،،
فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

اردو شاعری کا عہد زریں

میر - سودا - درد - سوز

یہ اردو شاعری کا تدریجی دور کہا جاتا ہے اس لئے ہم اسے تفصیل سے پیش کریں گے

تغزل

کہتے ہیں لوگ یار کا ابرو پھڑک گیا
ماہ تو تجھ یاد ابرو میں ہے سینہ کا خراش
ملے جسدن سے گیا ہو کر خفا وہ تند خو
دشنام دیجئے وہ جدھر کا کھینچا
مژہ اس چشم کا کھٹکے ہے دلِ محزوں میں
کیونکہ نہ چشم و ابرو سے ہو قتل دل مرا
خونِ جگر کا کھانا دل پر نہیں گوارا
آہ کس طرح تری راہ میں گھیرو کہ کوئی
اس کنج لب پہ چپکے ہوئے منہ کو رکھو گے ہم
دل پہنچا بلا کی کو نپٹ کھینچ کسالا
مت آنکھ ہمیں دیکھ کے یوں مار دیا کر
میرے سنگ مزار پر فرہاد !
ہم وحشیوں سے مدت مانوس جو رہے ہیں
طاقت نہیں ہے دل میں نے دل بچا رہا ہے
سلو ان دونوں ہم سے اک رات جاتی
ہو جاتی رہی وعدہ ہی تو شک گالی کی

تیغا سا کچھ نظر میں ہماری سٹرک گیا — سودا
کس سوئے سے ہم کم ہے ہر بیتنے کا خراش ،،
غنچہ دل کی کھلی پھر میں نہ کلیاں کھلیاں ،،
چبھتی ہے میرے دل میں وہی آن آن آن ،،
نشتر سے میرے لہو کی پڑی چھینٹوں میں ،،
دو ترک مست لیکے جو تیغا چلا کریں ،،
اس ترش ابرو کی جبیں تنگ نہ ہوئے چینی ،،
مدہ ہو نہ سکا عمر چلی جاتی کا ،،
دلچسپ اس مقطع پہ حرف و کلام کیا ،،
لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ — میر
عشق ہیں بلا ان کو نہ سکار دیا کر ،،
رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد ،،
مجنوں کو شوخ لڑکے کہنے لگے ہیں کا کا ،،
کیا ناز کر رہے ہو اب ہم میں کیا رہا ہے ،،
کہاں ہم کہاں تم کہاں زندگانی ،،
جواب بھی سو رہو مل کر تو جا آزادی کا سودا

لباس اور سامان آرائش

دندان و لب پہ ساکھا نیم جاں ہیں لیکن — مستی دو انگلی مل کر کھایا جو مان مارا سودا

شکل تیری سے میاں بند ہیں کتنے آن کے — منھ کی مسی ریکھ کی لالی کے لیے پان کے ،،

اندام گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے چاک — جوں خوش جھنجھوڑے کے تن پہ مسکتی ہیں چولیاں ،،

میں دیکھی دشمن ایمان لٹک جلی گوشہ میں دُر کی — نگاہ سرمگیں کیا کہوں جادو کی بھی ٹکڑی ،،

پان کھا کھائے آرسی کے بیچ — اپنے ہونٹوں کو دیکھتا ہے لال ،،

جلوہ ماہ تمام تنگ بھول گیا — ان نے سوتے میں دوپٹے سے جو منہ کو ڈھانکا ،،

کیا بدن دیکھا جسے چیپی سے ہائے — مار حسرت ہی کے ہم جان سے گئے میر

چلے ہیں مونڈھے سکتی ہے کرتی چھپی چولی انگیا کا ہر — بت قبا اس کی ہے تنگ پوشی بہار اجی تو تنگ آیا ،،

سیر کے قابل ہیں تنگ پوشی ان کے — کہنیاں پھنسے چولیاں چیتے ،،

لطف قبائے تنگ پہ گل کو بجا ہے ناز — دیکھی نہیں ہے ان نے تری چولی چست ہی ،،

چولی جہاں سے مسکی پھر آنکھیں وہیں جھکیں — جب پیرہن تنگ بھی اس چولی چسپ جاوے ،،

ناز و نیاز

جھٹ جاؤ گے درے تیر سے پر کہیں گے نیک بد — بے وفائی اس سے کرنی تھی فلاں سے بعید سودا

جو کہا میں ہو عاشقوں میں تیرے — بولا وہ مسکرا کے یہ نہ کہو ،،

لیتا ہے تو کسی کا تو دل لے سمجھ سمجھ — با نری نہ جان اس کو بلّے سمجھ سمجھ ،،

ہر دم تو مجھے اپنے کوچہ سے نکالے ہے — جاؤں ہوں بھلا اب میں لاؤں دل میرا پھیر دے ،،

دل سا تم چیز کو بے قدر کیے دیتے ہو — کیا میں تم سے کہوں افسوس بتا نہیں بتیاں ،،

مول لیتے ہو جو اس دل کو تو یوں ہی لیے — تم دئے دام مجھے اور میں پھر بیٹھا بتاں ،،

تم جس کی تمنا کرتے ہو کیا بات ہے اس کی — لیکن ٹک ادھر دیکھیو اے یار بھلا میں ،،

؎ غیر لکھنؤی حضرات ناز و نیاز کو معاملہ بندی کہتے ہیں اہل لکھنؤ کے نزدیک یہ مکروہ لفظ ہے۔

[illegible] خواہ مجھے خواہ میں بجائے ہیں — اتنا بھول ہو مرے یار نہیں چھپاتے سودا

یاں تک ستا نہ مجھ کو کہ رو رو کہے تو ہائے ،، — یار دلا تم سنا کہ فلانے نے کیا کیا ،،

پوچھا کسی نے مارا تو سودا کو کس لیے ،، — بولا مجھے وہ گھوڑے تھا ہر آن آن آن ،،

راتوں پاس پاس گلے لگ سوئے ننگے ہو کر — رن کو بے پردہ نہیں ملتے ہم سے شرماتے ہیں ہنوز میر

روزمرہ

چاہو تو کولی بھر کے اٹھا لو تمھیں ابھی — کیسے ہی بھاری ہو مرے گے تو پھول ہو میر

اتنا کہا نہ ہم سے تم نے کبھو کہ آؤ — کا ہے کو میں کھڑے ہو وحشی سے بیٹھ جاو ،،

بات کہو کیا چپکے بیٹھے ہو یہاں آکر ! — ایسے گونگے بیٹھو ہو تو بیٹھے اپنے گھر جاکر سودا

ہائے ہائے ہی کر گئے تھا اسکا غرور و عیذ لگی — گھگیائے ہے اب کیا حاصل یوں نہیں کریں ہائے ہائے ،،

جو بیک پڑتی ہیں دیکھا میں گلستاں میں — تجھ قد سے خجل ہو کر شمشاد بہت رویا ،،

لطف آنے کا ہے کیا بس نہیں اب تا جفا — اتنا عالم بھرا جاوے نہ کیا میں ہی ہوں ،،

میں کہتا ہوں کر دل مجھ لیا کون ہے وہ — یک بیک بولے اٹھا اس طرف آئینہ ہی ہو ،،

جب کہا میں تجھ تو ہی ہے تو پھر کہنے لگا — کیا کرے گا تو مرا دیکھو تو جائیں ہی ہوں ،،

چھن گیا سینہ بھی کلیجہ بھی !! — یار کی تیرے جان نے جا بھی ،،

کیوں تری موت آئی ہے گی عزیز — سامنے سے مرے ارے جا بھی ،،

حال کچھ چپ رہا جو میں بولا ! — کس کا قصہ تھا یاں کہے جا بھی ،،

میں کہا میر جان بلب ہے شوخ — کرنے کوئی خبر کو بھیجا بھی !! ،،

کہنے لگا تو واہی بک اتنا ! — کیوں ہوا استری آیے جا بھی ،،

مروت وشمنا غفلت ینا ہا ! — ادھر تک دیکھ بچھو مڑ کے آیا ،،

میاں دل بھائی دل او مہربان دل — مجھے تو چھوڑے جاتا ہے کہاں دل ،،

خدا جانے ہے اس شوخ سے کیا — ارے میرے لالے میرے بے زبان دل ،،

ہجر و فراق

جب رات سر پٹکنے نے تاثیر کچھ نہ کی !
ناچار میر منہ کو کری مار سو رہا میر

آشفتہ ہو گو اس کی پتیاں خراب حال
دیکھو مجھے تو خبطی دیوانہ سڑا کہو سودا

ملا جو عشق کے جنگل میں خضر تو نے کہا
کہ خوف شیر ہے مخدوم یاں کدھر آیا

جب غبار لینے جی کا نکلے ہے !
دیر رہتی اندھی کیسی دھوم

خمریات

جب پیر مغاں میں جا دختر رز مانگی
بولا کہ سعادت ہے پر وہ ابھی بالی ہے

تقویٰ ترک ہے ہے مجھ کو روز و شب لے زاہد
جو چکھے سہو سے گا ہے تو پی جاتا ہوں وہ چھو

دختر رز ہمارا باندھ دے گر تو نکاح !
خوب سا کھلو پیش اے ملا تجھے شکرانہ ہم

شیخ و واعظ

کیا ہم اکھاڑے کا بھلا شیخ تو دیکھیں
رندوں کو دھر آتا ہے جو ریش اپنی پکڑ کے

تھا ڈاڑھی تیری واعظ مسجد ہی میں منڈوا تا
پر کیا کریں ساتھ اپنے جام نہیں رکھتا

کچھ بھی نسبت نہ تھی جب پیر مغاں تھا شیخ
ہم حرم میں بھی تو ترسے واماد رہے

پہلے جو ہم مست آ گئے سو بار مسجد سے اٹھا
واعظ کو مارے خوف کے کل لگ گیا جلاب

شیطنت ہے نہیں ہے خالی شیخ
اس کی پیدائش احتلام سے ہے

رقیب

دیکھے ہے اس طرح تو مجھے دیکھ کر رقیب
چوہے کی بھانت جائے ہے نظروں سے پیر بلا

جوں لاٹھی دکھاتا ہو بھلا تو دانت پیسے کو
رقیب آگئے ترے دے ہے مجھ بندگی سی گھڑکی

اے غیر میر تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے
سید نہ ہو سے پھر تو کوئی چمار ہے

حیات و کائنات کے مسائل

انھیں طلب و ظلم بجا ہے پر ناسفلہ پرور
مسائل کر تا جیکے بخشش نہ ہے تیری

خطرہ ہے تجھ سے مسند شاہی کو اے فلک
حاضر ہے پوستخت مرا پشم تو اکھاڑ سودا

یہ بھی جاہ دنیا کا نہیں کم مال زادی ہے
کہ اس پر رو رو میں سینکڑوں چڑھتے اتر تے ہیں

ہوتے ہیں اس جہاں کی کوئی خلاص ہو گا
اس فاختہ پہ سب کے اساک ہو گیا ہے

مال دنیا سے ہے کیا بہرہ ہمیں
پاس رنڈی وے ہے ضعف باہ

ان اشعار میں مضمون آفرینی ہے مگر کیا بات کہیں اور کس طرح کہیں کا شعور مفقود ہے الفاظ مضمون اور طرز ادا سب میں بھونڈا پن اور ابتذال ہے اور دو تہائی سے زیادہ کلام ان لوگوں کا ایسا ہی ہے اس پر مستزاد طولانی غزلیں بلکہ دو غزلہ سہ غزلہ قافیے بھونڈے ردیفیں لمبی جن سے زمین ناہموار اور سخت ہو جاتی تھی اور اسی میں شعر کہنا استادی سمجھا جاتا تھا کچھ ردیف و قافیے میر و سودا کے دیکھیے۔

جبیں میرے پر	کہیں میرے پر	بازار فلک پر	گلزار فلک پر
مہمان بھی رات	جان بھی رات	آب و رنہ آب	داب ورنہ آب
یہاں دن دو چار ہیں	گلزار دن دو چار	پھیلا ہے آتش کا	سیماب ہے آتش کا
ہنگ اور سنگ	رنگ اور سنگ	گل کی اشارت	بلبل کی اشارت
سنگ و خشت شکست	رنگ و خشت شکست	کہنے لگا تو سو وہ ہو	تلوار نہ ہو وہ ہو
گل سے کچھ تو کہو	بلبل میں بھی کچھ کہو	چھاتی ہے میاں	جاتی ہے میاں

دیہاتی اور گنواری لفظیں بے تکلف استعمال کرتے تھے۔

دل جلوں تک اک کے آن میں جاتے ہیں تا بہ گرے
دل داغ ہو رہے ہیں چمن کے سہاگ سے

خود ہی تقویٰ سے کہتے تھے شیخ جی سرکش
پھر اب عمامے کے گرد وہ تنگ لڑائی ہے

ہو سکے جو شیخ میں وارد ہوا گھر اس کے
"پت" رہ گئی کہ ان آنکھوں ہی میں دھرایا

ہم اپنے جاگ جب کی سی رہتے یا نہیں !
"پھالے" میں پاؤں دیے کو لے کہاں سے تم

آیا ہے زیر زلف جو رخسار کا سطح ؛ — "پان" "سانجھ" کے تئیں بھی سحر کا سماں ہے آج

دل ہی کے غم میں گزرے وہ دن جو گزرتے — "اینچو" ہے اس نگہ سے جاتا نہیں دیا کچھ

گو وہ ہر جائی اسے اپنی اور — ہر طرف کو گمان جاتا ہے

تذکیر و تانیث کا شعور نہ تھا

بود نقش و نگار سا ہے کچھ — صورت اک اعتبار سا ہے کچھ میر

شب اس کے کوچے میں جاتا ہوں اس توقع پہ — کہ ایک دوست ہے دان خواب پاسبان میرا

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا — موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہ طور کا

جا ڈوب گئی اپنی اندوہ کے دریا میں — شے جوش کہاں اب ہم مدت ہوئی ...

ایک ہی لفظ کو مونث بھی باندھتے تھے اور مذکر بھی۔

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا ؛ — کچھ اسی میں ہمارا وارا تھا

پھرتے پھرتے تلاش میں اس کی — ایک میرا بھی لوں نہ جیان گیا

سیکڑوں جیسے کا جیان گیا — پر نہ تیرا یہ امتحان گیا

ہر چند جانیں جاتی ہیں پر تیغ جور سے — تم کچھ لیے سر کی سوں تم ہاتھ مت اٹھاؤ

اب جان جسم خاک سے تنگ آگئی بہت — کب تک اس ایک ٹوکری مٹی کو ڈھوئیے

خاطر کی بھی رہتی ہے پھر جان چمن ہی میں — گل آئے جہاں وہ بھی جو تب سے اں آیا ہے

زنانی اور مردانی بولی میں فرق نہ تھا اللہ کی سوں دیا توں میں اب بھی عورتیں بولتی ہیں

محاورہ استعمال کرنے کا شوق لطف زبان کے بجائے بھونڈا پن پیدا کر دیتا تھا۔

ناصحا کچھ یہ نصیحت سے نہیں ضبط سرشک — طفل خو ہے نہ کبھی ہو رے کے ٹھہرے باہر سودا

گر قصد ادھر کا ہے تو ٹک دیکھ کے آنا — یہ دیر ہے نہ ہادنہ ہو خانہ خدا لا

راحت پہنچی تم سے تو بخ اٹھایا برسوں تک — سر سہلاتے ہو جو کبھی تو بھیجا بھی کھا جاتا ہو

کام میرا تیرے غم میں جب کہوں ہو جائے گا — میں یہ کہتا ہوں تو کہتا ہے کہ ہو ہو جائے گا

صنعتوں کے استعمال کا بھی سلیقہ نہ تھا

چوڑائی میں فلک اپنی عدد اور بھی جم لے — لمبا کروں ہوں دیکھ تو کیا تجھے دم لے سودا

طائر فریب کیسا ہے وہ شکار پیشہ — مرغان باغ سارے گویا ہیں اس کے سارے میر

دہقان پسر وہ ہم سے یوں صلح کر گئے ہے — بوٹوں کے کھیت اوپر جب تک نہ جنگ ہووے

وہ تو بیچ کا ہر گز تجھے نہ ہم نامہ — گوڑی میں جا کبوتر لیتا ہے مول گولے

تم نے دیکھا ہوگا بچپن میر کا — ہم کو تو آیا نظر وہ خام سہل

ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر — پڑے ہیں گھاٹی میں مدت سے ہم

ضروری علامتیں حذف کر دیتے تھے ۔

دن رات ہر پلک نے مری چھڑی لگائی — کیا جانے آنکھ تجھ سے میں کس گھڑی لگائی

فارسی الفاظ کے صرف کا بھی سلیقہ نہ تھا ۔

دل جو پر بیقرار رہتا ہے — آج کل مجھ کو مار رہتا ہے میر

محاورے کا صرف بھی نہیں جانتے تھے ۔

پوچھ کر حال تو پھر سنتے نہیں — بس مجھے اور نہ بکوائیگا میر

ان ناہمواریوں کے ساتھ امرد پرستی آپ کا موضوع غزل بنا اور اس کی خدمت میں

تھے زمانہ میں جن کے خرچے روپیہ — ٹھانسا کرتے تھے ان کی آنون پر میر

ان سب پر مستزاد ہجو جس کی بنیاد فحش پر تھی مرزا مظہر جانجاناں جو عالم صوفی فقیہ سب کچھ تھے ابرو کو کہتے ہیں ۔ ابرو سب شاعروں کی جھانٹ ہے

ابرو کا جواب ۔ جانجاناں لیشم ہے

مصحفی ضاحک کی ہجو یوں کرتے ہیں۔

ضاحک نے تب کہا یوں مجھ پاس کب ہیں کوڑے ۔ تب شیخ سدو بولا استغفر اللہ... قدوی

فدوی سودا کو کہتے ہیں ۔ بھڑوا ہے مسخرہ ہے سودا اسے ہوا ہے۔

مصحفی و انشا کا دور

اس دور میں زبان کچھ صاف ہوئی مگر مضمون کا بھونڈاپن بیہودگی ابتذال باقی رہا۔ غزل سے چوغولہ تک کی نوبت آگئی ردیف قافیہ کی ناہمواری اور بڑھ گئی انشا کے دیوان سے صرف ردیف الف کے کچھ ردیف وقافیے دیکھئے

بچھایا بسترا ۔ بگایا بسترا	بنار نے غش کیا ۔ قرار نے غش کیا
جیٹ سے غش کیا ۔ غٹ سے غش کیا	ننگ میں گیڑا ۔ رنگ میں گیڑا
تختوں کی ہوا ۔ بختوں کی ہوا	چراغ ٹھنڈا ۔ دماغ ٹھنڈا
سیماب کا گٹکا ۔ بیتاب کا گٹکا	قلقل کا منہ چڑھایا ۔ بلبل کا منہ چڑھا
ہر آن یہ گالی دینا ۔ نقصان یہ گالی دینا	ادھیڑے جا ۔ چھیڑے جا

دس پانچ غزلیں ایسی ملیں گی جنمیں ردیف و قافیے مناسب ہوں پورا دیوان اسی طرح کی ردیف و قافیوں سے بھرا پڑا ہے ان میں کوئی اچھا شعر کہنا ممکن ہی نہیں۔
مضمون اور انداز بیان کا بھونڈاپن اور ابتذال دیکھئے ؎

منظور ایک بات اگر ہو تو آئیے ؛ گلشن میں اک کنارے ہے جینا چھا خوب ؟
کب چاہوں ہوں میں عمر ملاقات کی تیرے ؛ جب خوش ہو مرا دل کہ جب اس باغ کی ...
بھلا آپ تھرائے کس واسطے ؛ کبوتر کا باہم جو جوڑا لگا
اس ستمگر سے ہمارے جو کسی نے پوچھا ؛ کوئی رنگین بھی ترے کوچہ میں یاں رہتا ہے ؟
کچھ تو اک تاؤ سا کھا چیں بجبیں ہو کے دیا ؛ گالی دیکر یہ کہا ان نے کہ ہاں رہتا ہے
جب میں نے کہا کہ مجھ کو تم سے ! ملنے کا ہے اشتیاق بے حد
یکبار وہ کھلکھلا کے رنگین ! بولے کہ چہ خوش چرا نباشد
یاد کیا آتا ہے وہ میرا لگے جانا اور آہ ؛ پیچھے ہٹ کر اس کا یہ کہنا کوئی آجائیگا
یار کا در پر نکلنا اس دل بیتاب سے ؛ کوئی گر جھوٹوں کہے گا تو پڑ لونگا

مت یہ گھبرا کر کہو اب گھر کو پنڈہ جائیگا ؛ کوئی مر جائیگا صاحب آپ کا کیا جائیگا !
ڈوبے یوں بحر محبت میں کہ اب جیتے جی ؛ اپنا دشوار ہے اوپر کو اچھل کر آنا
ورنہ دل کہنا مرا شاید کہ اس نے سن لیا ؛ ورنہ کیوں مجھ کو دھرا ہے بے طرح چھلا گیا
کل جو ونے پہ میں تھے ٹک دھیان اس پر کیا ؛ ہنس کے یوں کہنے لگا کیا آنکھ میں کچھ پڑ گیا
جان بلب سن کے کسی سے وہ مجھے یوں بولا ؛ میری بیزار ہے منہ سے دو پہر ڈھلا بجھ کو کیا
شب گھر جو رہا مرے وہ مہمان ! تھا صبح یہ کس ادا سے کہتا !
طاقت نہ رہی بدن میں ہے ہے ؛ قربان گیا یہاں کا رہنا !
شب کیا وہ چپکے چپکے وہ شوخ و شنگ بولا ؛ دیکھو نہ ہم رہیں گے گر پھر پلنگ بولا
تجھی سے ہم کو کہتا کہ چل بے والی فرہو جا ؛ معلوم اس کو جس روز [illegible]
اپنے کوچہ میں مجھے دیکھا تو یہ کہنے لگا ؛ تو جو یاں رہتا ہے جرأت تیرے گھر کو کیا ہوا
جب میں نے کہا او بت بدنام ہوئے آ ؛ تب کہنے لگا چل بے او بدنام پرے جا
میں نے جو کہا ایک تو بوسہ مجھے دیدے ؛ بولا کہ زباں اپنی کو تو تھام ارے ہا !
ہوں گے دم میں تہ و بالا کونین ؛ آپ نتھنوں کو نہ پھڑکائیے گا
پیچھے پیچھے مرے چلنے سے رکو مت صاحب ؛ کوئی پوچھے تو یہ کہیو کہ مرا نوکر ہے

ایسے سیکڑوں اشعار ان کے یہاں سے اور پیش کئے جا سکتے ہیں اس وقت شاعری یہی تھی اس کے یہ معنی نہیں کہ صاف اور سنجیدہ شعر بالکل نہیں ہیں مطلب یہ ہے کہ ایسے شعر بھی کہتے تھے ان کو شاعری سمجھتے تھے اور اپنے دیوان میں داخل کرتے تھے اس کے مقابلہ میں لکھنؤ کی شاعری میں زبان کی صحت روانی و سلاست فصاحت و بلاغت ہے۔ گنواری اور بازاری الفاظ نہیں ہیں ادائے مطلب میں جدت تشبیہ و استعارہ کی

؎ اسی مضمون کا ناسخ کا شعر ہے ؎
ہو گیا قرآن کا پڑھنا غضب ۔ درد اسکو لن ترانی ہو گیا

کی ندرتیں ہیں اور یہ خوبیاں فنا رفتہ نہیں بلکہ ایک ایسی انقلابی صورت میں پیدا ہو گئیں اور یہ ناسخ کا بڑا کارنامہ ہے مولانا امداد امام اثر نے سچ کہا ہے کہ اگر ناسخ نہ ہوتے تو اردو زبان و شاعری آج اتنی شائستہ نہ ہوتی۔ یہ فرق ناسخ اور ان سے پہلے کی شاعری کے موازنہ سے واضح ہو جائیگا مگر میر و سودا کے بہت سے مضمون کا ناسخ کے یہاں وجود نہیں جیسے ؎

قدم کے چھونے سے استادگی مجھے سی ہوئی — کبھی وہ یوں تو مرے ہاتھ بھی لگا ہوتا — میر

شوخی تو دیکھو آپ کہا آؤ بیٹھو میر — پوچھا کہاں تو بولے کہ میری زباں پر — ،،

کیسا اب زہد و تقویٰ وارد ہے اور ہم ہیں — بنت العنب کی اپنا کچھ گیا گھر کر — ،،

مت پوچھ کچھ لب ترسا بچہ کی کیفیت — کہوں تو دختر رز کی فلاں جل جائے — ،،

اثبات کر کے تم سے اک بات اب کہوں میں — لیکن تو نہ کہنے لگیو مجھ پہ یہ جوتا ہے — سودا

سرین میں اتنی جھکی لی بذکر جام زاہد نے — کہ جتنا شیخ کو مذکور انگلاتا ہے شیشہ کا — ،،

یا شیخ وہ رشتہ ہے زنار ہمارا جس نے — پھاڑ ڈالی تیری تسبیح کے ہر دانے کی — ،،

شیخ کو ذوق اچھلنے سے نہیں محفل میں — اس بہانے سے مٹاتا ہے وہ اپنی چل کو — ،،

لے گھسے حجرہ میں خادم کو کہ ہم جا پہنچے — شیخ صاحب سے کرامات نہ ہونے پائی — ،،

عزلت سے محل شیخ کو نیز نے لئے تیار — کوئی ہفتہ گزری شیخ کوئی وہ دیکھی ہے — ،،

ایسے مضامین ناسخ کے یہاں نہیں موازنہ کے لئے ایک موضوع کے اشعار دیکھئے۔

کلام ناسخ !

تغزل

چلائیں صورت بد مست ٹھوکریں کھاتا — وہ یوں چلے کہ کوئی ساغر شراب چلے

خرام ناز تو اس کوچہ گرد کا دیکھو — نہ اس طرح کبھی صحن چمن میں آب چلے

دوڑتے ہیں دیکھنے والوں کے دل بے اختیار — ہے غضب انداز او ظالم تری رفتار کا

بیٹھنے سے عمر جاں اپنی ٹھہر جاتی ہے — جب ترا جلوہ رفتار نظر آتا ہے

وہ چشم فتاں ہے غیرت غزل وہ زلف پیچاں ہے رشک سنبل — عذار میں ہے شباہت گل بدن میں عالم ہے یاسمن کا

خاطر سے ہم کو کرتے ہیں بسمل کیونکر — تیر رکھتے ہیں پر نہ کمان رکھتے ہیں

لباس و سامان آرائش

منہ دیکھیں آفتاب پرست آفتاب کا — سرکا دے اپنے چہرہ سے کونا نقاب کا

رات گھٹتی ہے تو بڑھتا ہے فروغ آفتاب — حسن رخ چمکا جو اس نے زلف کو کم دیا

کرے تیرے مسی آلودہ ہونٹوں کی ثنا خوانی — خدا نے اس لئے اتنی زبانیں دی ہیں سوسن کو

بالے موتی کے ہیں تارے رخ تابان آفتاب — تیرے آنے سے ابھی بام آسماں ہو جائیگا

بندہ بالی میں نہیں تعویذ بازو میں نہیں — وہ ستارہ صبح کا ہے یہ ستارہ شام کا

سرخ پوشاک پہن کر وہ سہی قد جو گیا — جل اٹھے سرو چمن مثل چنار آپ سے آپ

ناز و نیاز

یاسمن دھوپ سے ہوئے گل تر — دیکھو آئینہ میں عذار اپنا !

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی — دل ہی دل میں تمہیں ہم یاد کیا کرتے ہیں

اب تو جی کھول کے دن رات کرو ظلم و ستم — ناتوانی سے مجھے طاقت فریاد نہیں

کہتے ہیں تیرے عارض و قامت کو دیکھ کر — بالائے سرو پھول کھلا ہے گلاب کا

آئینۂ دل میں ہے ترا عکس
دن رات میں تجھ کو دیکھتا ہوں

خمریات

پیشتر نشۂ ایجاد سے مدہوش ہوں میں
خم گردوں بھی نہ تھا جب سے کہ مے نوش ہوں میں

کرتے تھے فاش نشہ میں بد مست سر غیب
اس واسطے حرام کیا ہے شراب کو

حاجت نہیں نماز کی مستی میں زاہدا
کیا مرتبہ خدا نے دیا ہے شراب کو

لالہ و گل کا جوش ہے بلبلوں کا خروش ہے
فصل وداع ہوش ہے موسم نائے و نوش ہے

حشر تک جی میں ہے بے ہوش رہوں اے ساقی
کاش مے بھر دے مری عمر کے پیمانے میں

حیات و کائنات کے مسائل

ہر کسی کام رکھتا ہے دو دور آسماں
گر ہمیں پا سر شوریدہ تو پتھر نہیں

رنگ عشرت باغ عالم میں نظر آتا نہیں
گل کو گلچیں کا خطر بلبل کو ڈر صیاد کا

دو روز ایک وضع پہ رنگ جہاں نہیں
وہ کون سا چمن ہے کہ جس میں خزاں نہیں

پژمردہ ایک ہے تو شگفتہ ہے دوسرا
باغ جہاں میں فصل بہار و خزاں نہیں

جدّتِ ادا

اے پری مکھڑا ملا ہے کیا ہی پیارا چاند کو
رات میں نے تیرے دھوکے میں پکارا چاند کو

اس کی ہر دم کی نصیحت سے میں تنگ آیا ہوں
کاش صبح سے بھی آنکھ اس نے لڑائی ہوتی

تعبیر ہے کہ یار کی پڑ جائے گی نگاہ
بجلی گری رات کو کل مجھ پہ خواب میں

بے خودی میں یہ کون یاد آیا !
خود بخود دل ہے بے قرار اپنا !

ہجر و فراق

میں نے یہ جانا کہ میری طرح ہے فرقت نصیب
آنکھ میں جس کی نظر آیا کوئی آنسو مجھے

مرگ اک سوتی تھی ورنہ یہ کراہا شب کو
کہ جہاں کو ترے بیمار نے سونے نہ دیا

ناسخ غم فرقت میں یہ ہے حال ہمارا
جب کھینچتے ہیں آہ تو آتا ہے جگر ساتھ

یاس ہے نظارۂ رخسار آتشناک سے
آگ لگ اٹھی ہے دل میں شعلۂ ادراک سے

صنعتوں کا حسنِ استعمال

جس قدر ہم سے تم ہوئے نزدیک
اس قدر دور کر دیا ہم کو !

رہے وہ گل چمنستان دہر میں شاداب
دکھا کے سرو سا قامت کیا نہال مجھے

وحشیو کہتی ہے زنجیر با آواز بلند
پستہ عقل ہے جو ہے غم سے وہ آزاد نہیں

زاہد و واعظ

نہ پائیں زاہد بے آبرو شراب کہیں
نہ اپنے ساتھ کہیں کھوئیں آبروئے شراب

کسی لغت سے ہیں واقف نہیں جز بادہ تلخ
زاہدا اب تو سمجھ تارک لذات مجھے

عمر بھر دھڑکے عذاب حشر کے
زاہدا تیرا ہی یہ دل گردہ ہے

حسن بھی کیا چیز ہے زاہد ذرا انصاف کر
اپنے بندوں کو خدا دیتا ہے لالچ حور کا

فراق یار میں ڈر ہے مجھ کو بادہ خواری سے
کہیں زاہد نہ کر دے متہم پرہیزگاری سے

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے تقابلی مطالعہ سے ظاہر ہوا کہ وہ ناہموار روش زبان کی ناہمواری طرز بیان کی ہمواری مضامین کی ناہمواری لب و لہجہ کی ناہمواری تہذیب و شائستگی کی ناہمواری ہے اس وقت تک ناز حسن اور نیاز عشق کی حکایتوں ہجر و وصل کی کیفیتوں کے بیان کا سلیقہ نہ تھا بھونڈا پن ناشائستگی اوباشانہ لہجہ بیہودہ باتیں بھونڈی زبان اور بھدی ترکیبیں عام تھیں ناسخ نے اس طوفان بے تمیزی کو روکا اور شاعری کا رخ تہذیب و شائستگی حسن بیان لطف زبان اور طرز ادا کی ندرتوں کی طرف موڑ دیا اور ایک ایسا راستہ بنا دیا جس پر وہ آگے بڑھتی رہی۔

ذہنی شاعری | ناسخ کی شاعری ذہنی ہے اس میں ان کا دل شریک نہیں جن لوگوں کو مضمون آفرینی میں لطف آتا ہے ان کا ذہن موجد و فلسفی کے ذہن سے مماثلت رکھتا ہے ان میں حسن کی کرشمہ سازیوں سے متاثر ہونے کی صلاحیت کم ہوتی ہے ایسے لوگ ناسخ کے دلدادہ ہیں۔

قلبی شاعری | تاثرات کا اظہار قلبی شاعری ہے ایسے شاعروں کا بھی ہر شعر ایسا نہیں ہوتا ان کے یہاں بھی ذہنی شاعری کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ مگر ان کی قلبی کیفیت ان کی زبان اور لہجہ میں اثر اور کیف پیدا کر دیتی ہے جن لوگوں میں جمالیاتی احساس پیدا ہوتا ہے وہ آتش کے گرویدہ ہیں اور ذہنی شاعری کو پسند کرنے والے بھی اس میں ایک کیفیت محسوس کرتے ہیں کیونکہ بہر حال ان کا دل بھی عشق کی کشش سے بکسر خالی نہیں ہوتا مگر قلبی شاعری کے دلدادہ ذہنی شاعری سے محظوظ نہیں ہوتے کیونکہ وہ دماغ سے ادراک کے نہیں بلکہ دل سے محسوس کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

لکھنؤ کی اصلی شاعری | یہ دونوں رنگ ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ تک الگ الگ نظر آتے ہیں مگر ان کے بعد کے شعرا میں دونوں رنگ سموئے ہوئے ہیں کیونکہ تاثرات عشق سے تو کوئی دل خالی نہیں ہوتا کم زیادہ کا فرق ہے بعد کے شعرا نے قلب و دماغ دونوں سے کام لیا ہے اور یہی لکھنؤ کی اصلی شاعری ہے

ناسخ کی تحریک | ناسخ زبان مضمون لہجہ انداز بیان اور تہذیب و شائستگی کا ایک سیلاب اپنے ساتھ لائے جو تمام خس و خاشاک کو بہائے گیا پھر بھی دو غزلہ سہ غزلہ باقی رہا ردیف و قافیہ کا بھونڈاپن تو دور ہو گیا مگر مشکل ردیف و قافیہ رہ گئے میری جانب۔ جانی۔ پستان اور ساق باقی رہ گئی ناسخ کا مصرع ہے ؎

دکھوں میں ساقی ساقی گلفام دوش پر

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا اسلوب

آتش کا طرز لکھنوی شاعری کا دوسرا اسلوب ہے

ناسخ نے زبان کی سلامت و روانی تہذیب و شائستگی ضائع و بدائع تشبیہ و استعارہ کنایہ اور تمثیل مضمون آفرینی اور طرز ادا کی جدتوں سے شاعری میں جو فضا پیدا کر دی تھی اس سے نکلنا ممکن نہ تھا کیونکہ لطف زبان اور حسن بیان اسی پر منحصر تھا۔

آتش اس معاملہ میں غیر شعوری طور پر ناسخ کے متبع تھے لیکن ان کے یہاں ایک بات اور بھی ہے اور وہ عاشقانہ جذبات کا خلوص حسن و جمال کے تاثرات، والہانہ کیفیت ؎

آئینہ سامنے رکھتے تو غش آ جاتا
آنکھ اگر آئینہ سے تم نے لڑائی ہوتی
چمک چمک کے نکلنے کا حال کھل جاتا
کسی صورت سے نہیں جاں کو قرار اے آتش
رات بھر کیں دل بیتاب سے باتیں ہم نے
تصور سے کسی کے یہ میں نے گفتگو برسوں
یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
فراق یار میں دل پر نہیں معلوم کیا گذری
شباب تک نہیں پہنچا ہے عالم طفلی
ہم ساحسین ہو یا نہ ہو کیونکر نہ ناز کیجے پھر
کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا

تم نے انداز نہیں اپنی ادا کا دیکھا
رات بھر میری طرح نیند نہ آئی ہوتی
کیسے دکھاؤں رخ چشم مہر و ماہ نہیں
طپش دل مجھے اچھالے پھرتی ہے
رنج فرقت کے گرفتار نے سونے نہ دیا
رہا ہے ایک تصویر خیالی روبرو برسوں
ہم اور بلبل ناشاد گفتگو کرتے
جو اشک آنکھوں میں آتا ہے سو بہتا یار نہ تھے
ہنوز حسن جوانی یار راہ میں ہے!
ناز بجا و غمزہ بے جا اٹھائیے
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

ان کے شاگردوں نے یہ ناہمواریاں کم کیں بہت سی لفظیں ترک کیں اور شائستگی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا مگر مشکل ردیف و قافیے اور دو غزلہ سہ غزلہ باقی رہا حسن و عشق کے بیان میں کبھی کبھی متانت و شائستگی کی حد سے آگے بڑھ جاتے تھے۔

لکھنؤ کی شاعری کے دوسرے دور (جلال امیر مینائی) میں ردیف و قافیہ کی ناہمواری کم ہوئی تہذیب و شائستگی بڑھی پھر بھی ایسا مال رہ گیا جس کو الگ باندھ کے رکھا تھا اور اس سے تہذیب کی نگاہیں نیچی ہو جاتی تھیں۔

تیسرا دور جاوید عارف رشید مرزا رسوا اور نظم طباطبائی کا ہے اس میں زمینیں نہایت شگفتہ ہو گئیں ردیف قافیہ کی ناہمواری دور ہو گئی اور شاعری پہلے سے زیادہ مہذب و شائستہ ...... ہو گئی پھر بھی تا میری جان۔ جانی منفہ میں زبان ایسی باتیں باقی رہیں۔

چوتھا دور صفی عزیز محشر آرزو کا ہے اس میں زبان و شاعری کی تمام ناہمواریاں دور ہو گئیں زمینیں شگفتہ غزلیں مختصر اور شاعری مہذب ہو گئی۔ یہ دور دو سو برس کی شاعری کا جوہر اور ناسخ۔ آتش کی شاعری کی معراج ہے اسی دور سے بہتر شعر اردو میں نہیں کہے گئے۔

پانچواں دور مرزا جعفر علی خاں اثر کا ہے جو ملک غزل کے تنہا فرمانروا تھے یہ شاعری کے خاتمہ کا دور ہے کیونکہ اس پایہ کے شاعر پھر نہیں پیدا ہوئے یہ ہے لکھنؤ کی شاعری کا مختصر جائزہ اس میں ہر دور کے شعرا کا کلام تمام شعرائے ہندوستان کے لئے مشعل راہ رہا ہے اور آج بھی ہے جدید شاعری کے علمبردار اگر اس کا بغور مطالعہ کریں تو ان کو اپنے اشعار کے نقائص کا ... اور شاعری کا فن معلوم ہو سکتا ہے۔

ـــ:ـــ

لکھنؤ کی شاعری

کیا ہے ناسخ نے آسماں سے بلند تر پایہ اس زمین کا

دور اول

ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ

ناسخ

مست ہے عالم مرے اشعار کی تاثیر سے
مثل مینائے ٹپکتی ہے مری تقریر سے

پھر بہار آئی چمن میں داغ دل اچھے ہوئے
آنکھوں میں منتظر ہیں عبث یار آئے دل
خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر سربلند
ہو گیا گور غریباں میں عیاں حال جہاں
ہر صبح وہی صبح ہے ہر شام وہی شام
رکھتا ہے چرخ اوج کسی کا کب ایک دل
ناسخ شراب پی شب تاریک ہے تو کیا
جلا نہ آتش سودائے عشق سے جو جیا
یہ رنگ عارض گل رنگ ہے کہ نام خدا
نگہ ٹھہرتی نہیں ہے عکس پر اس کی
آپ میں دیوانہ پھوٹے ڈالتا ہوں پیاسا سر
خاک میں ملتا ہے غیرت رو رو کے ہم کو غیر
ازل سے عشق کی دولت ہے دیوانوں کی قسمت میں

پھر مرے زخم جگر آتش کے پرکالے ہوئے
آتا ہے ناوک نگہ ناز ادھر کہاں!
آسمان پیش زمیں ہر تواضع خم ہوا
کاسہ سر جو نظر آیا وہ جام جم ہوا
انسان پر ہے زور فقط انقلاب کا
ہوتا ہے دوپہر میں زوال آفتاب کا
محتاج آفتاب نہیں ماہتاب کا
تو واجب اس پہ جہنم کا بس عذاب ہوا
پڑا جو عکس ترا آب میں شباب ہوا
شعاع حسن سے آئینہ آفتاب ہوا
دست نازک سے نہ مجھ سے صنم پتھر اٹھا
اس گلی سے بس ہمارا خاک اپنے سر پر اٹھا
ملی ہے عقل لیکن بخت برگشتہ ہے عاقل کا

[illegible]

عالم اسباب میں اسباب ہیں عوض
کیوں نکہ گلوں کی خاطر نازک کو توڑنا
عمر گذری اک بت کافر نظر آتا نہیں
یاں تو دلی بھی سنبھل جاتی ہے گرتے گرتے
گر نگہ ہے تو باطن انسان کی سیر کر
کیا بھلا شکوہ بتوں کا قصہ یوسف سے یاد
جو ملا کے پردے میں ہم دیکھتے ہیں ذرہ خدا
ہو گئی نظروں سے غائب تیرے نظارے کی تہ
بولے ہو سکی دیکھ کر اس عارض پر نور کو
صبح شب وصال کیسے ہوتے ہیں ہم کہاں تک
شب سے زیادہ صبح ہماری ہوئی سیاہ
خاک سا لگتا ہے سر جاں سرکشوں کی سرکشی
دم ہے جب جسم عاشق میں ہے خامی کی جبلی
عمر بھر وحشت میں گر صحرا نوردی کی تو کیا
چاہیے تا انہاں اثر کی حسرت انداز کی ہے
مری آنکھوں سے کیا نسبت کہ قطرہ ... کا
اٹھنے لگا ہے کیوں مرے زخم کہن سے دھواں
وہ بے نقاب ہوا ہے تو یہ تماشا ہے
اٹھا کے سر تو یہ وحشت غبار لیتا جا
دل میں پوشیدہ غم عشق بتاں رکھتے ہیں
ہماری جامہ دری میں گلوں کی کیا تقلید

خلق کی آنکھوں میں جا بہ جا دیکھنا تو قہر خوب
گلشن میں عندلیب سے بھی چھپائے داغ
حشر میں کیونکر خدا کا پا سکیں گے دیدار ہم
شمع کے قطرے یہ قدم کیا مرے دل نے میں
کیا کیا طلسم دفن ہیں مشت غبار میں
رنج دیتا ہے خدا بھی طالب دیدار کو
کر دکھا دیکھنے کی اے کلیم تاب نہیں
کاہ تھی ہستی ہماری شعلہ ادراک میں
کر دیا روشن اسی شعلے نے شمع طور کو
ہے زہر سا قیا قدر شہ آفتاب میں
جو شیب میں کیا نہ کیا تھا شباب میں
وہ زمیں ہے کون جس پر آسماں تو نہیں
خوب چل جاتی ہے جو شے چھڑ کوا ہو نہیں
سیر کے قابل جو تھا دل کا بیاباں ہو گیا
گر دیا کاک ہو گئی کانٹے کیوں بلبل تجھ پہ ہے
... ہو سکتا ہے آنسو پونہیں سکتا
آگ ہے شاید آج ہوا کو رے بیڑے سے
دو چار ہوئے کی آنکھوں کو اپنی تاب نہیں
مجھے ترکتا ہے ہیں او شہسوار لیتا جا
آگ ہم سے گئے اندر نہاں رکھتے ہیں
یہ وہ جنوں ہے جو وابستہ بہار نہیں

آئی قیامت اس نے لگایا ہے منہ سے جام
عشق جب کامل ہوا ہے عین حسن
ایک عشق تھا کبھی زمانہ میں ہو اہم کو نہ اوج
نکہت گل کہتی جاتی ہے زباں موج سے
صدمے اٹھانے والے ہیں روز فراق کے
ندے اے جوش بدمستی بہت ہے غیر گستاخی
تنگ آ کر جب کہا میں نے کہ مر جاؤں کہیں
ہوا ہر نفس اک بادباں ہے
مر جاؤں بیشتر ہیں الٰہی وصال کے
ایک چھوٹا تو ملی دوسرے کو قید حیات
نام خدا لیا جو منکرین کے حضور
ڈر تھا اثر کا اس کو سو وہ بھی نکل گیا
آب و گل میں اڑ گیا ہے توسن عمر رواں
اندر کر خسر دیکھیں رنگ کیسے دیس ل جھیل چلا
اپنا کی آگ تو کہاں سنگ بھی لوگ کو نگ نہیں
جانتا ہوں انھیں آنکھوں کو یہ دیکھ آیا تھا
کام کچھ بھی دیدۂ بیدار سے بنتا نہیں
رنج غربت وحشت گیسو دشمن ہجر دوست

ہے اتصال ماہ میں دور آفتاب میں
آگ میں پڑ جائے جو شے آگ ہے
آسماں پر کیا جائے بخت کا اختر نہیں
قابل نظارہ رنگ گلشن عالم نہیں
کیا لائیں ہم شمار میں روز شمار کو
خجالت یار سے ہوگی کبھی تو ہوش آتا ہے
بدگماں سمجھا کہ اس کو اشتیاق حد سے ہے
رواں کشتی عمر رواں ہے
فرقت میں زیست کی ہو تمنا اگر مجھے
کبھی ہوتا نہیں یہ خانہ زنداں خالی
مر کر بھی وہ صنم مجھے اخفائے راز ہے
نادم ہوا ہوں منہ سے میں نالا نکال کے
توڑ کر تار نفس کو تازیانہ کیجیے
کون ہے اک مشت گل میں جو چمن آرا ہوا
سر سودا زدہ بیکار نظر آتا ہے
مست جب تم کوئی میخوار نظر آتا ہے
دولت بیدار ملتی ہے دل بیدار سے
کس طرح ہو ستا رہانی خاطر ناشاد کی

اس سے پہلے اردو میں ایسے شعر نہیں کہے گئے۔ ان میں زبان کا لطف اور ادا کی خوبی زندگی کے پیچ و خم تمثیلات استعارات اپنی مثال آپ ہیں اس طرز فکر و انداز بیان نے غالب و اقبال کو پیدا کیا غالب نے اس کا اختراع کیا۔

پہنچی نہ اس کے کان تلک آہ نارسا
کیا فائدہ زمین سے اگر تا فلک گئی

کچھ حال اپنی زلف کے دیوانے کا نہ پوچھ
بس مختصر ہے گرچہ قصہ دراز ہے

سر پٹکتا ہوں پلا دے سر جوش مجھے
ساقیا دور کر پھر آنے لگا ہوش مجھے

آگئی لغزش مستانہ کسی مست کی یاد
دور ساغر نے کیا بزم میں بے ہوش مجھے

اس دور میں کیوں آئے چرخ جفا جو کو اضطراب
دل کو مرے قرار کہیں آگیا نہ ہو

ساغر عمر کو اللہ نے لبریز کیا
جام تو نے نہ دیا اے بت مے نوش مجھے

باتوں میں نگاہوں کا غزالان ختن
آنکھوں سے تری سیکھ لیا طرز سخن کو

تصویر کھنچ چکی تو لکھا حشر زیر پا !
مانی سے جب کھنچا نہ وہ انداز چال کا

غنچے چمن میں چٹکے چلی ناز سے نسیم !
انداز اڑایا سب نے تری بول چال کا

راز دل کتنا چھپایا کھل گیا
حال اس دولت سری کا کھل گیا

اگر زمین کی پوچھی فلک کی اس نے بھی
یہ ان کا آدمی اچھا فرشتہ خو آیا

وہ حال پوچھتے ہیں تیغ میں خموشی ہوئی
زبان بند ہوئی وقت گفتگو آیا

کب خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائیگا
دوست کا ملنا نصیب دشمناں ہو جائیگا

جلایا طور کو جس نے وہی گری تجلی
کدہر سے شعلہ آواز گفتگو آیا !

جی ڈھونڈ رہا ہے دل جو کیا دلربا کے ساتھ
نا آشنا کو ہم نے کیا آشنا کے ساتھ

کیا کیا نہ ہم کو اپنی عبادت پہ ناز تھا
بس دم نکل گیا جو سنا بے نیاز ہے

یہ دل بدگماں نہ دیکھ سکے
اگر وہ بت کے ہو خدا ہمراہ

بہت کچھ کھو کے پائی اس نے راہ خود فراموشی
دل گم گشتہ آپ خضر ہے اپنے بیاباں کا

کسی کی جستجو میں تخت دل آنکھ نہیں آتے ہیں
تلاش یوسف گم گشتہ میں ہے قافلہ دل کا

کبھی خورشید نہ افلاک پہ پنہاں ہوگا
لاکھ پردوں میں جو تو ہوگا نمایاں ہوگا

اپنے گناہ آنہیں سکتے حساب میں
زاہد کو خوف چاہیے روز حساب کا

دیکھ بہتر ہے -

خواجہ محمد وزیر وزیر

تعارف:- حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندی کی اولاد میں سے کل اور گوشہ نشین آدمی تھے عربی فارسی کی معمولی استعداد تھی شاعری میں ناسخ کے ایسے شاگرد تھے کہ استاد کو ان پر ناز تھا اور ان کی زندگی میں ان کی استادی مسلم ہوگئی تھی استاد نے اپنے اکثر شاگرد ان کے حوالے کر دیئے تھے ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا سنہ ولادت نہیں معلوم انتقال کے بعد ان کے اعزہ و احباب نے دیوان جمع کر کے ۱۲۷۲ھ میں شائع کیا

گردش پہ چشم مست کی دل میں گیا تغیر
ٹوٹا ہے دور جام سے شیشہ شراب کا

تھام لوں دل کو ذرا ہاتھوں سے
ابھی پہلو سے نہ اٹھ جایئے گا

ہو گیا ہے سینہ دل دشمن کی بھی فریاد سے
دل نے جب نالہ کیا ٹکڑے جگر ہونے لگا

مر گئی بلبل جو کیا یاد چمن کو
غربت میں خدا یاد دلائے نہ وطن کی

قفس تن میں نہ گھبرائیو اے طائر روح
جو گرفتار ہے اک روز رہا ہوتا ہے

ہم اسیران قفس کو بھی ذرا چین نہیں
دھڑ دھڑکا ہے کہ اب کون رہا ہوتا ہے

بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ
اب توقع نہیں رہائی کی

بگڑے ہوئے بنائے گریباں سبز کے
انگڑائی میں جو یار کی چولی مسک گئی

جب خفا ہوتا ہے تو یوں دل کو سمجھاتا ہوں میں
آج ہے نامہرباں کل مہرباں ہو جائیگا

بیٹھے بٹھائے تمہیں کیا ہو گا
اٹھ کے چلے حشر بپا ہو گیا

آج مجھ سے بات اگر کرتے نہیں
دیں گے یہ بت کل خدا کو کیا جواب

افزوں کہیں ہیں حسن میں ستمگر قمر سے آپ
آئینہ لے کے دیکھئے میری نظر سے آپ

شکر ہے ان بتوں کے کوچہ میں
پہنچے ہیں ہم خدا خدا کر کے

قدر نعمت ہوتی ہے بعد از زوال
پوچھئے لطف جوانی پیر سے

یوسف جو کہا ہنس تو بولے
کیا آپ نے مول لے لیا ہے

اے جانے سے ہوا وہ باھر !
ہم بھی آنکلیں گے مسجد میں وذیر
اس کو طاعت پہ غرور اس کو ہے آمرزش پہ
ہمیشہ گریہ وزاری رہی کو خونباری
چھپایا جام جو ساقی نے کرکے پے رشک
پلا ہوں دامن صحرا سے بیقراری میں
ستم ایجاد جفا کرتے ھیں
بند ھیں وہ ہاتھ حنا سے کیا بچے جن سے شہید
نہ دیکھا نقش قدم کا صدئے ناز بنی
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
نقشہ ہوئے کر کھینچا تو بھولا اتھا لچک
پھول جب جھڑنے لگے رنگین بیانی سے مری
مثل سایہ سرو ہے پامال دیکھو تو خرام
اندھا ہے وہ جس نے ترا دیدار نہ دیکھا
بلبل کی بھلا پوچھتا کاہے کو کوئی بات
بت کہتے ہیں کیا کیا مجھے اس بیدمنی پر
پائے مجنوں جب کھینچے زنجیر سی اک بن گئی
یاد جب کرتا ہوں لطف سایہ دیوار کو
سب اک ہو وہ دل کہ جو درد آشنا نہ ہو
کبھی ستی کی تبلیغ بیر نہ خرافت سے کچھ سکی
اس نے جالستے ابد تک مجھے چھٹنے نہ دیا

جس نے تجھ کو کبھی عریاں دیکھا
خشت خم لے گئے جو ہو آئے گا
کبر زاہد سے جدا کبر گنہگار جدا
جو اشک ختم ہو گئے تو آنکھ سے لہو آیا
ستارے آئے نکل آفتاب ڈوب گیا
ہوا ہوں طائر بسمل کے زیر پر پیدا
ستم ایجاد کیا کرتے ھیں
کچھ اور یار سے منظور انتقام نہیں
سمند عمر سا کوئی سبک خرام نہیں
کیسے ترا نظارہ ہو سیدھا تو کر تو تیر کو
ہو گئی لغزش یکایک خامہ بہزاد کو
رہ گئی حسرت سے بلبل کھول کر منقار کو
پھول منہ سے جھڑتے ہیں سنیو ذرا گفتار کو
بہرا ہے وہ جس نے نہ سنا تیرے سخن کو
صد شکر دیا نطق نہ غنچے کے دہن کو
اللہ نے صد شکر بنایا نہ دہن کو
خود بخود لغزش ہوئی یہ خامہ بہزاد کو
ڈھونڈھتا پھرتا ہوں جنت میں میں کوئے یار کو
پھوٹے وہ آنکھ جس سے کہ آنسو گرا نہ ہو
قاتل کا کیا قصور جو مری قضا نہ ہو
ہجر میں لگ گئی تھی ایک گھڑی سی مجھ

جیتے جی بس وہ بت رہا ہمراہ !
دل دیا اس کو پر یہ ڈرتا ہوں
تجھے دیکھا جدھر نگاہ گئی
رنج تنہائی مجھ سے نہ رہا
اس نے تنہا مجھے نہ جلنے دیا !
ناتواں ہے بہت غبار مرا
رہی یاں گردش اور عامہ داری
نکہ سکا خط میں نہ عیب و صفائے رخ یار
چاہیے اگر فدا تو ہر اک عیب ہو ہنر
آئینے کی وہیں کھل جاتی ہے ساری قلعی
سخت جاں ہوں نہ مرو کاش فرقت میں وزیر
ایک فتنے کو نہیں ہوتی ہے جنبش بے حکم
قصہ فرہاد کے دھوکے میں جاں اس نے سنا
آنکھوں کو کب ہے تاب یہ دیکھیں بے نقاب
جنت میں جائیں یا کہیں دوزخ نصیب ہو
بر وقت یاراں جس کو کہتے ہیں مرا افسانہ ہے
دیکھ لیتے ہیں وہ دل میں جو نہیں دیکھا کبھی
آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے
حجاب آتا ہے جراتوں کو قفل لگانے
دن ہو گیا نمود شب وصل کو یاں آ گئی !
مجنوں نے کہہ دو کہتے ہیں جوش جنوں سے
گر پڑے پھولوں کے خرمن پہ یکایک بجلی

اب تو بندے کے ہے خدا ہمراہ
دشمن اک دوست کے کیا ہمراہ
تھا تصور زبس ترا ہمراہ
یار کے غم کو لے لیا ہمراہ
غم فرقت کو کر دیا ہمراہ
تو ذرا رہیو اے صبا ہمراہ
کاش لاتے نہ دست و پا ہمراہ
دیدیا آخر کو دست نامہ بر میں آئینہ
موسیٰ کو وعدہ یار یہ بیضا جلا کے ہائے
تیرے چہرے کے مقابل جو ذرا ہوتا ہے
سیکڑوں بار جل آئے تو کیا ہوتا ہے
تو جو پھر جاتا ہے اللہ پھرا ہوتا ہے
سرگذشت اپنی کبھی ہم نے بھی کس تدبیر سے
گویا کہ ہے حجاب جو وہ بے حجاب ہے
یہ پرستش عمل تو ہیں اک عذاب ہے
کچھ حقیقت نے کی تجھ حال بتایا نہ گیا
جام جم کہتے ہیں جس کو کیا یہی پیمانہ ہے
فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے
بھی شرمگیں سے نرگس نے دل بہلا ہے
اٹھی نقاب کیا مری قسمت الٹ گئی
آتے ہی فصل گل مری تصویر پھٹ گئی
نالہ بلبل سن کے تو جانب گلشن دیکھے !

دیکھیے کیجیے گا جو لے مالقا ہوتا ہے
کیا کہیں ہم سے شب ہجر میں کیا ہوتا ہے

فصل گل آتے ہی عالم میں قیامت آئی
پھر جنوں تازہ ہوا پھر وہی آفت ہوئی

پھر وہی آئی مصیبت وہی آفت آئی
روز مر مر کے کٹا پھر شب فرقت آئی

خوف کیجیے دل مظلوم کی بربادی سے
حشر ہوگا اثر نالۂ فریادی سے

خدا غریب کی سنتا ہے غیب سے فریاد
اثر عجیب دل دردمند رکھتا ہے

شہرت بجا جہاں میں اس خود نما کی ہے
ویسے بشر بھی ہوتے ہیں قدرت خدا کی ہے

ساقی ہے مے ہے باغ ہے ابر سیاہ ہے
اس وقت میں شراب نہ پینا گناہ ہے

کوکتی ہیں کوئلیں کی پیہو کے شور ہیں
طاؤس رقص کرتے ہیں ایام ہیں بہار کے

زلفوں میں دل الجھ کے سر تن سے کر گیا
اچھا ہوا بلا سے چھٹے درد سر گیا

ناسخ میں لاکھ بار جیا اور مر گیا
کیا کیا فراق یار میں مجھ پر گزر گیا

کیا شوخیاں ہیں ابلق لیل و نہار کی
جھپتی نہیں ہے ران کسی شہسوار کی

راحت بھی کم از غم نہیں دل جبکہ خالی ہو
سرسر مجھے جھونکا ہے نسیم سحری کا

بحر عالم میں رہی کشتی امید تباہ
دم بدم موج حوادث نے طمانچا مارا

خاکساری کا جہاں میں سبب عالی رتبہ
یہ وہ زینہ ہے کہ جس سے انساں بالا ہوتا ہے

سبزہ باغ دہر میں برگ خزاں ہوتا نہیں
پیر ہو کر پھر بشر کوئی جواں ہوتا نہیں

غیروں کا حال دیکھ کے روتا ہوں زار زار
پوچھو نہ حال میرے دل دردمند کا

غم اتنے اور بڑھے جس قدر وقار ہوا
ثمر سے نخل ثمر دار سنگسار ہوا

عیاں ہوتا ہے راز عشق سینہ میں نہاں ہو کر
بیاں کرتی ہیں آنکھیں حال دل ترجماں ہو کر

ڈر غریق عشق کو موج حوادث کا نہیں
مچھلیوں کو خوف کیا ہے صدمۂ سیلاب کا

قوت بازو مصیبت میں غلط آتا ہے کام
سر کی آفت اٹھانے کو جہاں میں دو قدم

تکلیف کیوں اٹھائیے بن بن کے ہوشیار
مرتا ہوں میں تو اہل جنوں کے شعور پر

محمد رضا برق

تعارف:- ناسخ کے شاگرد، واجد علی شاہ کے استاد اور مصاحب خاص تھے فتح الدولہ بخشی الملک خطاب تھا واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے تھے وہیں ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء میں انتقال ہوا ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑا جو شائع ہو گیا ہے۔

نہ کوئی ان کے سوا اور جہاں میں دیکھا
وہی وہی نظر آئے جہاں جہاں دیکھا

کہیں نہاں نظر آئے کہیں عیاں دیکھا
نئے لباس میں دیکھا انہیں جہاں دیکھا

وہ جنگ اور محبت ہوئی محبت سے
غضب ہوا جو کبھی ان کو مہرباں دیکھا

دیدار کو ترستے ہیں عاشق جمال کے
پر جل رہے ہیں طائر وہم و خیال کے

عاشق زار کہاں تم وہ ستم عشق کہاں
جو فرشتوں سے نہ اٹھے وہ اٹھا لاتے ہیں

بتوں سے جلوۂ حق کا ظہور ہوتا ہے
عجیب خاک کے پتلوں میں نور ہوتا ہے

اذان دی کعبہ میں ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

لن ترانی تمہیں زیبا ہے کسے تاب نظر
غش پہ غش آتے ہیں پردہ جو اٹھا دیتے ہو

اے صنم وصل کی تدبیروں سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

شکوہ میں نے جو کیا جائے شکایت یہ نہیں
جس سے ہوتی ہے امید اس سے گلا ہوتا ہے

بے اثر نالہ نہیں آپ کا ڈر ہے مجھ کو
ابھی کہہ دیجیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

کہہ گئے تنگ جو سوچا ہم بھی ہیں نسخ آخر
حال دل منہ سے کہیں کچھ تو گلا ہوتا ہے

وصل کی رات تو دھڑکے میں کٹی فرقت کے
آپ کے جانے کے دن دیکھیے کیا ہوتا ہے

بلاؤں میں دل مبتلا ہو گیا
مجھے عشق گیسو بلا ہو گیا!

مر مر کے ساری رات تو فرقت میں کٹ گئی
لیکن امید آج نہیں ہم کو شام کی

مضطرب سن سن کے وہ رشک قمر ہونے لگا
رفتہ رفتہ نالہ دل میں اثر ہونے لگا

حسرت موت میں مرتے ہیں مگر تنگ عاشق
ہم سے پوچھو کہ شب ہجر میں کیا ہوتا ہے

جور زمانہ کیا ہے جفائے فلک ہے کیا
اٹھا کے آئینہ دکھلا دیا اسے میں نے
مربوط ہم شیشہ و ساغر ہیں ازل سے
درد فرقت میں زہر لازم ہے
شب فرقت بھی کاٹ دیتے ہیں ہم
ہجر میں اور بڑھی حسرت [illegible]
حشر تک کوچہ محبوب میں جانا نہ ہوا
چاند سورج کو تو شرماتا ہوں [illegible] میں
محال ہے کہ جنوں [illegible] خلوت سے جا سکیں
بے قرار ہی سہی بے قراری ہے
جس شعلہ رو کو دیکھ لیا دل جلا [illegible]
گذر بھی ہے جو دل پر وہ ہم نہیں کہتے
میکشی کے پہلو سے جو دن سر پہ قیامت اٹھا
وعدہ فردا قیامت تک کے لیے امید صبح
پیر مغاں سے پوچھئے مری خرابیاں
غضب کیا کہ جوانی میں توبہ برق تک کی
زاہد ڈرا رہے ہیں حشر سے بڑھتی ہے اپنی
روز حوروں کی بہت وصف کیا کرتا ہے
آج دیتے ہیں سزا ہم کو خطا سے پہلے
کیا رخسار دیکھ پائی زلفوں نے وحشت میں
برق زلفوں کے تصور میں رواں ہیں لکھو

خوگر وہ ہوں قدم میں خم ہے یار کا
نہ سو بھی عارض گلوں کی جب شمال مجھے
آنکھیں نہ پھیراؤ دل مضطر نہ ملے گا
آدمی کب تلک دیوانہ کرے
کیا کریں عمر اگر وفا نہ کرے
پھر نظر آئی نہ اس طرح کی صورت آئی
کس کو ملتا ہے خمار وہ جو اس سے ہے
کس کو پھر کہیے شب غم میں بجائے مشتاق
جو دو پہر آپ کے بنا [illegible] نہیں آتا
نہ جیتے رہ گئے اگر یہ جدائی رہتا
جو کھینچ آئے آگئی [illegible] دیوانہ ہو گیا
کسی کو منظر درد جگر نہیں ہوتا
دم میں سو بار جگر تھا ہمکے بیٹھا تھا
شام ہی سے آج تو درد جگر اٹھنے لگا
سو بار توبہ توڑ چکا ہوں شباب میں
اگر یہ سچ ہے تو پھر عمر بھر خراب رہا
دانستہ ہم تصور کریں گے قصور پر
ہم بھی زاہد کو دکھائیں گے تماشہ اٹھا
بات تک آپ کہتے تھے حیا سے پہلے
داد پوچھتے ہے شہرت بڑھ گئی منصور کی
[illegible] رستا سے اٹھا چار طرف بھائی ہے

دل کے ٹکڑوں سے نہ خالی کبھی پلکیں نکھیں
دیتا ہوں جان جان سے اس نوجوان پر
کاوش دہر سے ہیں اہل بصیرت محفوظ
ناطاقتی اس قدر بدن دار ہو گیا
جہان دیتا ہو میسر مجھے درد ہوتا
بہار سے عجب نہ عجیب کر دیا ہم کو
ضد سے اس رشک پری کا کوئی شے خاکی نہیں
دل کا غبار جوش جنوں کے نکال کے
ہر ایک نفس عشق میں ہے زندگی خضر
حسن رفتار جو اعجاز نما ہوتا ہے
چال وہ ہے کہ فلک بنتی ہے چلنے زمیں
مختصر طول شب ہجر بیاں کرتا ہوں
جو بلا آئی وہ لی دانستہ اپنی جان پہ
فرقت نے بنایا ہے مجھے طالع بیدار
بھیج کر قاصد کو کہتا تا ہوں یہ سارشک
اے صنم حسن ایسے کہتے ہیں اللہ اللہ
جب خلق یہ اس طرح سے بیدار کر دو گے
حباب نقاب میں ہے رخ مہر میں رخسار
کس طرح کہوں نالوں میں تاثیر نہیں ہے
زور لذت ہے مجھے بادیہ پیمائی کی
جوش وحشت یہی کہتا ہے نہایت کم ہے

کھنچ گئے سیکڑوں منصوبہ یہاں دلسوں پر
دنیا بھی ہے ایک کھیل جو کھیلا ہوں جا بجا
آج تک پائے نظر میں نہیں سنگ دلیا
دم توڑتا فراق میں دشوار ہو گیا
سر نہ رکھتا سے سر پر اگر احسان ہوتا
یہی ہنر ہے کہ کوئی ہنر نہیں آتا
سحر ہے گفتار میں بھی زہر ہے رفتار میں
صحرا نے بنائیں گے گرد ملال کے
جینے کے لیے مرتے ہیں بیمار محبت
مہر ہر ذرہ خاک کف پا ہوتا ہے
مہر اس ماہ کا نقش کف پا ہوتا ہے
کہتے ہیں ایک گھڑی حشر کے سارے دن کو
میں نے جس فتنہ کو دیکھا اسی پر مفتوں ہو گیا
کس طرح ملوں خواب میں جانا نہیں آتا
وہم میرا دیکھیے کیا کیا گماں ہوتا نہیں!
ایسی صورت کا بھی دنیا میں بشر ہوتا ہے
ایجاد نیا گلشن ایجاد کر دو گے!
کس طرح نہاں حسن خداداد کرو گے
تدبیر مطابق ہو یہ تقدیر نہیں ہے
ہر قدم پر یہی کہتا ہوں کہ صحرا اڑ جائے
دو جہاں سے بھی اگر وسعت صحرا بڑھ جائے

میر علی اوسط رشک

تعارف:۔ ناسخ کے شاگردوں میں بڑا درجہ رکھتے ہیں ان کے بنائے ہوئے قاعدوں پر عمل کیا اور ان قاعدوں کی روشنی میں نئے قاعدے وضع کئے ناسخ کے زمانے کی بعض بھونڈی لفظوں اور ترکیبوں کو ترک کیا اور ان کے جانشین کی حیثیت سے مسلم درجہ رکھتے تھے آخر عمر میں کربلائے معلیٰ چلے گئے تھے وہیں ۱۲۹۴ھ میں انتقال ہوا۔

نہ ہوا وقت خزاں ضبط فغاں و نالہ
بات تھی جو صدا مرغ چمن سے باہر

ہم تجھ میں محو قدرت پروردگار ہیں
اک مشت خاک کو مہ انور بنا دیا

جو ساغر و مینا نظر آیا مجھے خالی
یاد آ گیا ساقی دل مایوس بھر آیا

محفل میں شمع چاند فلک پر چمن میں گل
تصویر روئے انور جاناں کہاں نہیں

یارب وہاں چشم و دل زار کیا کرو
فریاد و اشک و آہ کسی میں اثر نہیں!

دل نہ قابو میں ہے نہ دلبر ہے
موت اس زندگی سے بہتر ہے

ایذائے دل بیان کروں کس زبان سے
یارب کبھی کسی کو یہ درد نہاں نہ ہو

موت آئے مجھے اجل مجھے اے ہمسفر اگر
ساقی نہ ہو بہار نہ ہو جانِ جاں نہ ہو

بتوں کو دل مبتلا چاہتا ہے
کوئی کہ وہ آفت گرا چاہتا ہے

ہجر جاناں میں کہیں جینے سے مرنا بہتر
زندگانی کے مزے کو یہیں کھلتے دیکھا

بیڑیاں پاؤں میں ہیں اور اطفال سنگ انداز گرد
لوگ کہتے ہیں میرا آنا غل بعید حشر ہونے لگا

کس کو تاب نظارہ باقی ہے
رکھتے ہو چہرے پر نقاب عبث

غم دل سوز جگر داغ فراق!
میرے مرنے کے یہی کیا کیا باعث

ناصحو عشق میں رکھو معذور
جانتا ہوں کہ برا کرتا ہوں

شیخ بگڑے کہ برہمن بگڑے
میں ترا نام لیا کرتا ہوں

پتھر کسی کا ہے لب کسی کا دل آئینہ
ششدر رہوں کارخانۂ درد جہاں میں

ہجر میں ابلق ایام بھی کاوش میں رہا
بارہا میری سواری میں یہ گھوڑا الٹا

کرتی ہے غریق یم غم آرزوئے دل
ملتا ہی نہیں بحر تمنا کا کنارہ

ہاتھ آیا لطف جبیں سر اپنا اٹھا لیا
دنیا سے ہمت نے دست تمنا اٹھا لیا

ترک دنیا کرتے ہی کھلنے لگے اسرار غیب
باخبر ہونے لگا جو بے خبر ہونے لگا

دل بستۂ لطافت باغ جہاں نہیں
پروا نہیں جو رنگ بہار و خزاں نہیں

نخل امید کسی روز نہ پایا سرسبز
گلشن عمر میں پیوستہ خزاں رہتی ہے

عیش ممکن نہیں مجھ کو چمن ہستی میں
جب بہار آتی ہے تشویش خزاں رہتی ہے

دمبدم وادی الفت میں جنوں کہتا ہے
فہم کہتے ہیں جسے عقل کہاں رہتی ہے

جو کہ خالی ہو علائق سے اسے غم کس کا
نے سے پوچھے کوئی کیوں گرم فغاں رہتی ہے

چھوٹ وہ خود رفتۂ الفت کسے معلوم نہیں
زندگی کہتے ہیں کیا روح کہاں رہتی ہے

دوست جاناں جسے وہ دشمن تھا
بس اسی اشتباہ نے مارا

چمن دہر میں وہ طائر خوش قسمت ہوں
کہ ہوا دام مصیبت سے دم چند جدا

بحر غم میں ڈبو دیا ہم کو
دل نے بیڑا ہے خدا پار ہی کیا

مال جو صرف ہوا پھر کے کہاں آتا ہے
کبھی دیکھا نہیں بہتے کو دریا آتا

تو اپنا سا ہے دیکھئے جس کو
حق پرستی کا ہوش ہے کس کو

ہو گا ہم چہرہ روئے دلبر کا
منہ کبھی دیکھئے ماہ انور کا

روتے ہیں ہجر یار میں گھٹتے ہیں انتظار میں
اب دل بیقرار میں نام نہیں قرار کا

جس کی آبادی اجاڑی آپ نے
نام دل تھا اس خرابہ آباد کا

حلق سے نکلی خلق تک پہنچی
ہے یہ سو بار آزمائی بات

مطلب یہ ہے صدائے شکست حباب کا
دیکھا بنائے ہستی ناپائیدار کو

صحن چمن ہو خیمہ دور سحاب ہو
ساقی ہو یار ہو قدح پر شراب ہو

شکوہ ہو ایک خانہ دل ہو اگر خراب
اس عشق فتنہ گر نے کیے گھر کے گھر تباہ

ہجر میں تاب و تواں ہوش و حواس
سب گئے دھیان تمہارا نہ گیا

مجھے تھا کام آئینہ سے یا زلف بنانے سے
تم اپنے حال آشفتہ میں حیران و پریشاں تھا

سنا رہا ہوں ہجر میں کو فسانہ ہجر
سوال ان کے جدا ہیں مرے جواب جدا

وہ کوٹھے پر چڑھے دنیا میں چاندنی چھٹکی
سدھائے باغ میں کیا وہ مژدہ بہار آیا

دل و دیدہ پہ گیا اعتبار ہمارا
نہ صحرا ہمارا نہ دریا ہمارا

تم نے کیوں عشق میں چھپائی بات
آ گیا اے رشک مہ پر آئی بات

قسم اول تو تیرے عارض تاباں میں ہے
اس کے کم سمجھ ہیں کہ اس کے جاند میں

سعد شب ہجراں کی درازی حد بیاں سے باہر
بات آئی تو صبح ہے عشق ادا ... تو شام

گھر کا دروازہ اسی جا کھلا رکھتا ہوں میں
جس طرف سنتا ہوں شہرہ آمد سیلاب کا

ارباب فنا ڈوبے کا غم نہیں کرتے
دریا میں پھرا کرتی ہے نہ خطرہ

عمل نیک و بد اک روز نظر آتا ہے
بیچ بھنور میں نہیں دیکھتے بیت الٹا

اپنی پہچان ہے انسان کو صانع کی شناخت
آپ تک جو کوئی پہنچا وہ خدا تک پہنچا

جلوہ یار سے روشن ہے زمانہ دن رات
کہیں خورشید کہیں شمع شبستاں نکلا

تو نظر آئے دیکھے جس کو
احد توحید کہتے ہیں کس کو

یاد آیا میکو میلان مزاج یار تھا
یاس میں امید تھی اقرار میں انکار تھا

بیچ دریا پھینک کو تو قسمت مند کی
بحر غم سے پار اتر جاتے تو بیڑا پار تھا

کیوں نہ مرتا عاشق چشم و لب و زلف و کمر
زار تھا آشفتہ تھا خاموش تھا بیمار تھا

اے خدا کوئی نہ دیکھے مرض الفت چشم
دم اس انداز میں آنکھوں سے نکلتے دیکھا

اب جہان شام و سحر ہے ہمارا غم و رنج
شام ہوئی تو صبح لائے صبح ہوئی تو شام نہیں

کیا قصہ الست و بلا کی خبر نہیں
حاضر جواب ہم تو ازل سے بلا کے ہیں

بعد مردن خاک کا انبار یا لوح مزار
اے اجل اس کو ہوا کیا خاک پھر چاہیے

ہے مائل عیادت اگر یار کا مزاج
بہلے گا سیر باغ سے بیمار کا مزاج

نہ کرے باغ میں خزاں جو کچھ
مجھ سے تو نے وہ آئے بہار کیا

ہوں اسیران بلا میں وہ گنہگار قدیم
کبھی کھلتا نہیں دیکھا در زندان جنوں

مجھ کو بدنام کیا درد کا ہو جائے برا
کہ لب پیکر تصویر میں فریاد نہیں

اور آمد شد جاناں کے مشابہ کیا ہے
دم کو آتے کبھی دیکھا نہ نکلتے دیکھا

ضرب تہ دل کے ہے داغ ہجراں بھی
عمران و دلوں کی برابر ہے

دیکھا جو چشم غور سے دونوں کا حال ایک
گردش چشم یار کا گردش روزگار کا

تصور تھا جو اس آئینہ رو کا قید خانے میں
علاج تھا کہ تھا آئینہ ہر دیوار زنداں کو

کرے نگاہ بصارت کی کیا حقیقت ہے
وہ لعب ہے قدرت پروردگار کی صورت

کہاں شبیہ خیالی مانی و بہزاد
کہاں وہ خامہ قدرت نگار کی صورت

سمجھوں جو مدعا تو لکھوں کچھ جواب کیا
تقریر سے زیادہ ہے تحریر لاجواب

مشتاق سیر لالہ دل داغدار ہے
ہنگام آمد آمد فصل بہار ہے

قتل کرنے کو خوش اندازی کا جوہر چاہیے
کون کہتا ہے کہ تیغ و تیر و نشتر چاہیے

کمال تنگ ہوا ہوں جہان فانی سے
دیا خدا نے عجب خانہ خراب مجھے

راستہ صبح سے اے رشک قمر دیکھیں گے
آج ہم شام سے آہوں کا اثر دیکھیں گے

جب تک عوض صبح نہ ہو صبح قیامت
لطف اثر نالہ شبگیر نہیں ہے

شمع میں لو نہ سوز دل پروانہ رہا
کچھ کہیں بھی نہ رہا جب ترا جلوہ نہ رہا

صبح سے ہیں قائل تاثیر وحشت اہل ہوش
بکتے بکتے مجھ سے ناصح ہو گیا دیوانہ آج

کھلیں خدا نے کیا آب و تاب غنچہ و گل
چمن کی سیر کرو ڈالدو بہار میں سرخ

ہوا ہے تنگ جہاں اب کی وحشت دل میں
کدھر میں جاؤں زمیں آسماں سے باہر

باتیں وہ کر رہا کہ ہیں رنجیوں کے بول
یہ ساز میں صدا ہے یہ لطف راگ میں

امداد علی بحر

تعارف امام بخش کے بیٹے اور امام بخش ناسخ کے شاگرد۔ علمی استعداد کا حال معلوم نہیں۔ تحقیق الفاظ و محاورات عروض و قوافیہ میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ چھوٹی شہزادی کے یہاں سے وظیفہ ملتا تھا اور انہی کی ڈیوڑھی کے بغلی کمرہ میں قیام تھا۔ افیون کے عادی تھے۔

کچھ دنوں کے لئے رام پور بھی گئے تھے مگر پھر لکھنؤ واپس آ گئے۔ ۱۲۹۵ھ میں ۹۵ برس کی عمر میں وفات پائی۔ ایک دیوان ان کی یادگار ہے۔

ہر خاک نشیں مظہر انوار خدا ہے
یہ کہدو کوچۂ جاناں کے جانے والوں سے
عذابِ نزع ہے قاصد کا انتظار مجھے
جیسے ہی عاشق بیتاب کا کب دل ٹھہرا
یہ رازِ عشق رہے دل ہی میں تو بہتر ہے
عشاق کی تقدیر میں آرام نہیں ہے
گو وہ چپ بیٹھا ہے پر شوخی کی باتیں ہوتی ہیں
کہاں وہ نغمے وہ اب سیمِ چمن فریاد کرتے ہیں
ہمارے حق میں یہ وہ میری بلا کے آشنا ہے
کشتے کھاؤ دیکھ لیا اپنا ... کوئی کسی
کوئی سجدہ ترا درگاہ کے قابل ہوا
آدمی گردشِ ایام سے غافل ہے
نہ وہ تا دورا ہے اسلام و کفر ہے

ہر دانۂ ذرات میں خورشید نظر آیا
ادھر جو کوئی گیا پھر ادھر نہیں آیا
اجل بھی آئے اگر نامہ بر نہیں آیا
روح جب کر گئی پرواز تو بسمل ٹھہرا
ادھر زباں سے نکلا ادھر فسانہ ہوا
کیا سمجھ کر شبِ وصل کو دھڑکا ہے سحر کا
ہے لب خاموش پہ عالم لب تصویر کا
ہمارا دل مشق ہی نے ورق الٹا گیا
شبِ ظلمت کا جانا اور آنا روزِ محشر کا
چھپایا کیا ... ڈھونڈھا مزاج پایا ...
لے چلا ... جبیں رہتی جبیں سائی سے
تمام شب کیا ہو گا خدا جانے سحر کیا ہو گا
زاہد ادھر خراب ادھر برہمن خراب

روئے کوئی غریب تو ہنسنا نہ چاہئے
اے دل نہ چھیڑ بہار میں گم ہو ترے ہوش
ہے موجِ نسیمِ سحری ہونٹوں کی جنبش
بروزِ وعدہ کہاں اڑ گئے یہ فرماؤ
یہ بات سچ ہے کہ دنیا مقامِ عبرت ہے
رونے دھونے سے فائدہ بحر
کوئی آدابِ محبت کو بھلا کیا جانے
جو میری عرض ہے وہ نہیں یار کو قبول
عشق کیا درد ہے خداوندا
کیا برا درد ہے جدائی کا
بے تابیاں بھی ہیں تو بعدِ نجات ہے
میں قسم کھا کے یہ کہتا ہوں کہ مے نوش نہیں
شاعر کا محتاج نہیں حسنِ خداداد
معاف کیجئے ایسی خطا نہ ہو گی کبھی
بہار آئی ہے کہدے یہ مصفر دل سے
ترے ملاپ میں دونوں جہاں کی عشرت ہے
اللہ ہی بچائے اجل کا ہے سامنا
قبلہ ہے کس طرف میں دو دہ نہ ادا کرد
صاحبِ ہنر کو آج کوئی پوچھتا نہیں
کچھ نہ سمجھے آئینہ کی شکل حیرت میں ہے
کیوں نہ بند آنکھیں کئے دنیا سے جائے بحر
عاشق زار ہوں میں مجھ کو نصیحت ہی بری

وا تعوذ نہیں کسی کی فغاں اثر سے آپ
سینہ میں حسرتوں کا نہ اتنا ہجوم کر
ہنستے ہر تو ہو جاتا ہے غنچہ سا دہن چھوٹا
مکان میں رہیں اے یار بازار میں ہم
کہ خواب دیکھتے ہیں جب خیال کرتے ہیں
کب سینے کے داغ چھوٹے ہیں
دلِ شیشہ تھا میں عاشق کی وہ تو قبریں ہیں
بند سے کی جو خوشی دیکھئے وہ خانہ نہیں
کوئی دارو کوئی دوا مفید نہیں
کسی کروٹ مجھے قرار نہیں
صیاد یا تو میں ہی نہیں یا قفس نہیں
آنکھ دیکھی وہ نشیلی کہ مجھے ہوش نہیں
تم چاند نظر آتے ہو بے ساختہ ہوں میں
برا کیا تمہیں چاہا گناہگار ہوں میں
چمن کا ذکر اسیروں کے سامنے نہ کرو
جو تم ملے تو کسی شے کی آرزو نہ کریں
فرقت کی شب کہاں میں چلوں سحر کہاں
صاحب قدم تمہارے کہاں سر کہاں
یارب تلاشِ رزق کرے بے ہنر کہاں
ایک ہے دیکھا نہ دیکھا عالمِ ایجاد کو
اس پری کو دیکھ کر کیا مجھے کوئی حور
ذبح کرتے ہیں جو لوگ آتے ہیں سمجھانے کو

دیکھنے دیتے نہیں کان رخِ زیبا کو
مار ڈالے گا مجھے عشق یہ معلوم نہ تھا
بسمل کو سنبھالے سے سنبھلنے نہیں دیکھا
کب مجھ سکوں گل کو جو تقدیر میں ہے داغ
دل کو لگی ہے تو انسان سمجھتا نہیں کچھ
ہوا بدل گئی پیری میں نوجوانی کی
گلے شکوے نہ کر ارض و سما کے
ہم نے ڈھونڈھا نہیں ہستی کو عدم تک کیا کیا
شراب مانگیں تو خضر سے بھی طلبِ آبِ بقا کر بیٹھے
اب ان میں اپنا نہیں گنا بتوں سے دل کو ٹکّا ہارا
جو ہر اس حسن پرستی میں وہ پیدا کرتے
روز تقسیم ہوئی کچھ نہ بن آئی آسے بجز
نیرنگیٔ دنیا کا تماشا ہے نمایاں
ہم خزاں کی اگر خبر رکھتے
یار کی دونوں آنکھیں قاتل ہیں
پار اتر ئے مددِ غیر سے کیا لطف ہے بحر
جنوں کے جوش میں نکلے جو گھر سے
چرخ کے ہاتھوں تو بلا ہیں دل جیا ہے
ہوئی تفریح مجھ کو پھاڑ کر پوشاک خستہ میں
عجب یہ رسم محبت ہے جس نے ظلم کیا
ناقوس کی آواز سے جو نکلا نہ اذاں سے
دیکھوں انجام مرے عشق کا کیا ہوتا ہے

بجلیاں کوندتی ہیں تاب نظر کیوں کر ہو
ناگہانی ہو جو شے اس کی خبر کیوں کر ہو
میرے دلِ بیتاب کی کیا چارہ گری ہو
جب فصلِ چمن آئے تو بے بال و پری ہو
نالے کرنے سے مجھے کام اثر ہو کہ نہ ہو
بہار دیکھ چکے باغِ زندگانی کی
خدا کو یاد کر بندے خدا کے
نہ ادھر ہاتھ لگے تم نہ ادھر ہاتھ لگے
سرور لطفِ زندگی ہے خمار میں جی گیا کر بیٹھے
کر بیٹھے بت خانے سے کیا احرام میں یاد خدا ہم بیٹھے
دل کو آئینہ بنا کے تجھے دیکھا کرتے
بیکسی بگڑی ہوئی تقدیر کو ہم کیا کرتے
غفلت اسے کہتے ہیں کہ عبرت نہیں ہوتی
آشیانے میں پھول بکھیر رکھتے
اک نظر ہم کدھر کدھر رکھتے
ڈوب بیٹھے یہ نہ کشتی کا سہارا کیجئے
ادھر سے ہم چلے پتھر ادھر سے
اس ہنڈولے میں کوئی بیٹھا نہیں آرام سے
در حقیقت نظر آیا مجھے چاکِ گریباں سے
اسی کی خدمتِ عالی میں دادخواہ چلے
کس نیند سلایا ہے مجھے بےخبری نے
بت خفا ہوتے ہیں ناراض خدا ہوتا ہے

پھول مرجھائے ہوئے دید کے قابل کب ہیں
شوقِ دیدار جو منظور نظر اس کا ہے
بت کدہ میں سر بسجدہ کعبہ میں ساغر بدست
بیمارِ محبت کا خدا حافظ و ناصر
روز اک تازہ بلا در پئے جان رہتی ہے
آنکھیں نہ جینے دیں گی تری بے وفا مجھے
بتلائے کون کعبۂ مقصود کا پتہ
سیر کو اٹھے تو ہیں وحشی مزاج
توڑ کر دیکھ لے آئینہ کے ٹکڑے ناصح
کیا اعتبار تیری قسم کا تو وہ ہے یار
دل بھی ہے ایسی چیز کہ تم کو نہ دیجئے
بنی ہے جان پہ ایسی کہ اب نہیں امید
خدا پرست ہوئے ہم نہ بت پرست ہوئے
اپنے اعمال سے پیری میں خبردار ہوئے
ہر طرف لوگ تماشے کو کھڑے رہتے ہیں
تتلیوں کو اور ہی صورت نظر آنے لگی
کچھ اعتبار نہیں قول و فعل کا ان کے
ہیں گلا تم سے کریں اے یار کس کس بات کا
اس چمن میں پہنچ کر کسی سے نہیں پہنچا مجھے
آغازِ جوانی ہی میں پیرانہ سر ہیں ہم
کون دنیا میں بٹاتا ہے کسی کا دکھ درد
میں ڈھونڈھتا پھرتا ہوں وہ قاتل نہیں ملتا

آنکھ پڑتی ہے آئینہ پر جو کھلا ہوتا ہے
ہم جدھر دیکھتے ہیں جلوہ ادھر ہوتا ہے
بحر اپنے خوابِ غفلت کی یہی تعبیر ہے
تشخیص یہ ٹھہری ہے کہ تدبیر یہی ہے
نہیں معلوم مری موت کہاں رہتی ہے
ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے
اپنا ہی دل جو قبلہ نما ہو تو جانیے
باغ جاتے ہیں کہ صحرا دیکھیے
کیا چھپے حسن پرستی کی جسے خو ہو جائے
فردا کا وعدہ کر کے قیامت پہ ٹال دے
الفت یہ کہہ رہی ہے کلیجہ نکال دے
کوئی گھڑی کوئی ساعت کوئی پہر
کسی طرف نہ جھکا سر ہم ایسے مست ہوئے
سوتے تھے سر پہ جو دھوپ آئی تو بیدار ہوئے
ہم جو دیوانے ہوئے رونقِ بازار ہوئے
جب ہوا دل آئینہ آنکھ تو حیرانی ہوئی
کبھی بہار نے ہوئے اور کبھی پرائے ہوئے
یہ کہانی دن کی ہو جائے نہ قصہ رات کا
شکوہ گلچیں کا کروں میں یا گلہ صیاد کا
وہ شام بہاری ہے کہ عالم ہے سحر کا
کون سر پہ بوجھ لیتا ہے کسی مزدور کا
گھر بھول گئی ہے میری تقدیر اجل کا

امان علی سحر!

تعارف :- ولادت و وفات معلوم نہیں ناسخ و برق کے شاگرد اپنی شہرت کی بدولت واجد علی شاہ کے دربار میں طلب ہوئے اور وظیفہ پایا بڑے جامہ زیب اور کبوتروں کے شوقین تھے غدر کے بعد وفات ہوئی۔

ہر خشک و تر میں تو ہے سبب ظہور ترا
گور بھی خلوت میں ہوگی تو بس ایسی ہوگی
لگ انداز ہوں سے نقشے نقشِ دل پر ہو جاتے ہیں
وصل یار ہے مرنے پہ موقوف
قید دل نے اہلِ شرع کی دیوانہ کر دیا
جیتے جی انساں آتے ہیں فرشتے بعد کو
ایک معشوق وہ ہیں اور زمانہ عاشق
کوہ پہ فرہاد پہنچا دشت کو مجنوں گیا
بعد از فنا بھی جنیں ملے یہ یقین نہیں
خوش قطع کس قدر ہے قبائے برہنگی
دل دیا اللہ نے صدمے اٹھانے کے لیے
راحت کی خوشی رنج کا کچھ غم نہیں رکھتے
چلتے چلتے تو پڑ کر ادھر دیکھ لیتے
ہمیں کیا جو تربت پہ بیٹھے لیے ہے
گو زار و ناتواں تھے لیکن نقش کھڑے رہتے
دنیا کو چھوڑ بیٹھے جب کوچے میں آپ کے
گردش چرخ سے تنگ آیا ہوں دم گھٹتا ہے

دل میں جگہ ہے تیری آنکھوں میں نور تیرا!
آج ان پریوں میں بیٹھا ہے اک انسان!
ایسی صورتیں اس ویرانہ کو آباد ہونا تھا
جو یہ سچ ہے تو کچھ مشکل نہ ٹھہرا
کیسے گنہگار ہیں بے قصور ہیں ہم
گھر یہ کیا ہے گور میں بھی کنج تنہائی ہے
کیا کریں وعدہ فردا لے قیامت نہ کریں
ہم کہاں ہیں کچھ ہمیں اپنی خبر ملتی نہیں
کیا گردش آسماں کی زیر زمیں نہیں
دامن نہیں ہے جیب نہیں آستیں نہیں
ہم فقط پیدا ہوئے تھے آزمانے کے لیے
لی لب پہ کیسی شے کا وہ دل ہم نہیں رکھتے
کہ ہم اور اک نظر دیکھ لیتے!
تہِ قسمت ہم تو اکیلے ہی ہے
اک مشت استخواں تھے اور لاکھ متحمل
آکر کبھی تو سیر لب بام کیجیے
آخر اس گنبد بے در کی کہیں ملتا بھی ہے

ہم بے بلائے تو نہیں آئے ہیں خدا کے گھر
تب فرقت میں اٹھائی ہے وہ ایذا ہم نے
زندگی ہے تو بہر طور گزر جائے گی
حشر میں حشر قیامت میں قیامت ہوگی
کچھ زمانے سے طبیعت بھی ہٹی جاتی ہے
پیہم جو تازیانہ تار نفس سے لگے!
راہ دکھلائی خوب وقت اخیر
پاس آ بیٹھے تو دل اٹھ گیا اک عالم سے
بہت پچھتائے تم کو پیار کر کے
میں پہروں تختۂ نرگس کو دیکھا ہوں سحر
فقط مقسوم سے اپنے گلا ہے
دل کا آئینہ اگر ہم نہ دکھاتے تم کو
کوہ و صحرا کے بھی وحشت میں نہیں کچھ پابند
آج جو کچھ کہ ہوا کل بھی وہی ہونا ہے
غریبوں کا کیسا مزاج مبارک
صدمے فرقت کے نہ اٹھتے ہیں اٹھیں کیونکر سحر
ہے سامنے مرقع یاراں رفتگان
عجیب لطف تھا کچھ ابتدائے وحشت میں
دل نے پھر دل سے راہ پیدا کی
آنکھیں دی ہیں دیکھنے کے واسطے
کسی کی گور میں سونا نہیں ہے

جانا نہیں بغیر طلب کیا ضرور ہے
شکر کرتے ہیں تو ہوتی ہے شکایت تیری
کٹ چکی ہجر کی شب صبح بھی ہو جائے گی
فیصلہ اپنا اسی دن پہ اٹھا رکھا ہے
زندگی موت کے دھڑکے میں کٹی جاتی ہے
کوسوں سمند عمر گریزاں نکل گیا
آنکھوں کی راہ دم مرا نکلا!
اب جو اٹھ جاؤ گے لے رشک قمر کیا ہوگا
گناہ عشق کی پائی سزا خوب
بندھی ہوتی ہے عجب انتظار کی صورت
کسی سے کچھ نہیں شکوہ شکایت
آنکھ ہوتی نہ محبت کی نظر سے وا وقت
کر دیا عشق نے ہر قید سے آزاد مجھے
کب لیا ہاں اتنا ہے وعدہ فردا کوئی
یہ پوچھو کہ بگڑی طبیعت تمہاری
صبح کے ہوتے ہی اپنا خاتمہ بالخیر ہے
روؤں بھلا سحر میں کس کس کو یاد کر کے
وہ ولولہ وہ جنوں اب کی سال بھی نہ ہوا
چھپ کے جانے کا راستہ نکلا!!
دیکھیں گے جو کچھ خدا دکھلائے گا
ہمیں کیا یار کے مذہب سے مطلب

آتش اور ان کے تلامذہ

آتش

بہزاد کا کیا مرقعِ عالم کے حسن پر — ہر روز عشق اک نئی تصویر سے ہوا!

جوشِ جنوں میں دیکھے پیچھے نہ مڑ کے پھر — منھ جس طرف کو صورتِ دریا اٹھائیے

ہم کو درپردہ محبت غائبانہ عشق ہے — لن ترانی ان سے ہو سائل جو ہو دیدار کے

کرکے آرائش جو دیکھی اس صنم نے اپنی شکل — بند آنکھیں ہو گئیں آئینہ حیران ہو گیا

بیانِ خواب کی طرح جو کر رہا ہے — یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا

اس بلا جان سے آتش دیکھئے کیونکر بنے — دل سوا شیشہ سے نازک دل سے نازک خو ہے وہ

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے — موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا!

فصلِ بہار آئی پیو صوفیو شراب — بس ہو چکی نماز مصلیٰ اٹھائیے

تکلف سے بری ہے حسنِ ذاتی — قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر — دل سے دشمن کی جفاؤں کا گلہ جاتا رہا

کوئی زمانہ جاتا ہے کوئی آتا ہے — کسی کو کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

وہی سر کا ٹیکنا ہے وہی رونا دن بھر کا — وہی راتوں کی بیداری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

کیا کہوں وعدہ خلافی سے تری احوالِ شب — کھول کر دروازہ کو کرتا ہوں سو سو بار بند

تمام رات ہوئی کر گیا کنارا چاند — اترے تھے بام سے تم جیسے ادھر ڈھلا چاند

ان انکھڑیوں میں اگر نشۂ شراب آیا — سلام جھک کے کروں گا جو پھر حجاب آیا

شیشہ میں جو ہے روشنی بادۂ گلگوں — فانوس میں یہ شمع کا عالم نہیں ہوتا

موسمِ گل کی ہوا نے کئے ساغر بیکار — بطِ مے اڑ کے لبِ جست کو چھو آتی ہے

سبوئے غنچہ ہے معمور و جامِ گل لبریز — ٹپک رہی ہے شراب ابرِ نوبہاری سے

ہر شب شبِ برات ہے ہر روز روزِ عید — سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے

آئینہ میں پری سے چہرہ کو دیکھتے تو — کیونکر بھلا محبت تم سے بشر نہ کرتا

منھ نہ دیکھا ہو ترا اس رشک سے مبتلا ہو — اے صنم جب پوچھتے ہیں گبر و ترسا آفتاب

ایک گل ایسا نہیں ہوگا نہ خزاں جسکی بہار — کون سے وقت ہوا تھا یہ گلستاں پیدا

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا! — بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

نہ قبرِ سکندر ہے نہ ہے گورِ دارا — مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی — گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

باغِ جہاں کو یاد کریں گے عدم میں کیا — کنجِ قفس سے تنگ رہے آشیاں میں ہم

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے — سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

چال ہے مجھ ناتواں کی مرغِ بسمل کی تڑپ — ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

کام کرتی رہی وہ چشمِ فسوں ساز اپنا — لبِ جاں بخش دکھایا کئے اعجاز اپنا

رنگ بدلا نظر آتا ہے ہوا کا مجھ کو — گلِ تازہ کوئی اس باغ میں شیدائی ہوگا

کیسی کیسی صورتوں کے اپنے دل میں داغ ہیں — اس مرقع میں بھی ہے کیا کیا ورق تصویر کا

طلبِ دنیا کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی — خیالِ آبروئے ہمتِ مردانہ آتا ہے

تماشا گاہِ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو — کسے اس انجمن میں یادِ خلوت خانہ آتا ہے

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا — کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر — دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال — ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش — گلِ مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

سوائے نام کے باقی اثر نشاں کے نہ تھے — زمیں سے دب گئے جھکتے جو آسماں سے نہ تھے

سعی لاحاصل مداوا اے مریض عشق ہے
تھامنا ممکن نہیں گرتی ہوئی دیوار کا

ناگفتنی ہے حال بہار و خزاں باغ
اک زخم ہے کہ خشک ہوا اور ہرا ہوا

صورت شمع ہوں ہر چند فروغ محفل
بات کرنے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے

موسم گل کر دیا ان کی قبائے سرخ نے
چاک تا دامن ہزاروں ہی گریبان ہو گئے

تم اندھیری رات میں الٹو جو چہرے سے نقاب
روئے رشک مہ ذروں کو جگا دے خواب سے

وہ آب و رنگ کہاں تیرے یار کا گل پر
ہزار آنکھ ہو نرگس کی وہ نگاہ نہیں

وہ رخسارے جو ہوتے ہیں مقابل
نکل جاتے ہیں دب کر چاند سورج

آئینہ نے کیا ہے جو صورت سے آشنا
گردن میں ان کی ہاتھ ہیں ان کے پڑے ہوئے

کرکے آرائش جو دیکھی اس صنم نے اپنی شکل
بند آنکھیں ہو گئیں آئینہ حیران ہو گیا

شوق ہے دل میں تو آنکھوں میں تصور اس کا
منزلیں جلوۂ محبوب کی آباد ہیں سب

آئینہ خیال کو منظور تو رہا!
جب سامنا ہوا تری تصویر سے ہوا

ہر لحظہ دگرگوں ہے مرا حال پریشاں
صورت نہیں ملتی مری تصویر میں میری

ہو گیا عشق حسن سے آگاہ!
پوچھیے کیا ہو ناشناسائی کی

کون سے دن ہاتھ میں آیا مرے دامان یار
کب زمین و آسماں کا فاصلہ جاتا رہا

کارواں تک گرد واماندوں کو پہنچا لے گیا
اے جرس شاہد ہوں تیرے نالہ کی تاثیر کا

اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں
اس بت کے آستانے کا پتھر رگڑ گیا

خدا بھی خوبصورت کو نہایت دوست رکھتا ہے
ارادہ کون سے دربر کروں میں دادخواہی کا

غنیمت جانئے دل جنبش ابروئے قاتل کو
بڑی معراج ہے تلوار سے مرنا سپاہی کا

دم آخر بھی بالیں پر مرے ہمراہ یار آئے
رقیبوں نے محل باقی نہ رکھا عذرخواہی کا

تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

نہ چھوٹے گا چھڑائے سے ارے قاتل ترے تن کا
وفادار دل کے خوں کا داغ کیا دھبا ہے کپڑے کا

میرے مرنے کی دعا مانگے وہ بت پڑھ کے نماز
کس طرف جا کر کروں میں سجدۂ شکرانہ آج

بتوں کے قہر و غضب کا کسے ہے اندیشہ
خدا نہیں یہ پیغمبر نہیں امام نہیں!

نہ مجھے دماغ نگاہ ہے نہ کسی کو تاب جمال ہے
انھیں کس طرح سے دکھاؤں میں وہ جو کہتے ہیں کہ نہیں حجاب

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

نام سنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا
دل دھڑکتا ہے جدائی کی شب تار نہ ہو

ترک الفت کا ارادہ نہ کر آتش زنہار
دل سے بیزار تو ہے جاں سے بیزار نہ ہو

خون ہوا جاتا ہے دل کیا دیدۂ تر خشک ہو
روز ٹانکے ٹوٹتے ہیں زخم گو کم خشک ہے

ذات باری کو کیا ظلم بتاں نے ثابت
عدل کرتے یہ اگر ان کی خدائی ہوتی

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

گور میں بھاگ اہل دنیا سے
خلوت اس انجمن سے بہتر ہے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

ہوا میسر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

کچھ نظر آیا نہ پھر جب تو نظر آیا مجھے
جس طرف دیکھا مقام ہو نظر آیا مجھے

کرتا ہوں جو میں حسرت پرواز میں نالے
صیاد کو غم ہے مری بے بال و پری کا

شرط وفا کی کسی بے وفا سے کی
آتش سا عارف آگاہ بھولا

نہ کسی کو کڑی کہی صنم نے
نہ کسی کی کڑی اٹھائی بات

موسم گل میں جو ہوتا ہے زیادہ سودا
دوڑتے پھرتے ہیں ہم باغ کی دیوار لیے

آتش آغاز محبت کا ہوا انجام بخیر
خاک پر تیری قدم رنجہ گل اندام کرے

نہ روز حشر بھی فریاد ہو سکی مجھ سے
جفائے یار کے آڑے مری وفا آئی

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

رفیق حال برے وقت میں نہیں کوئی
شریک جنگ میں شمشیر کا نیام نہیں

نواب سید محمد خان رند

نبیرۂ نواب نجف خان وزیر اعظم ہند

۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے ۱۸۵۷ء میں انتقال ہوا آتش کے شاگرد تھے
ان کے بہت سے شعر اور مصرعے ضرب المثل بن گئے ہیں۔

حور پہ آنکھ نہ ڈالے کبھی شیدا تیرا
بیٹھے تجھ سے بھی لگا کر نہ کبھی اسد سے
دید لیلیٰ کے لئے دیدہ مجنوں ہے ضرور
آنکھ لاسکتی نہیں تاب تجلائے جمال
چشم و ابرو بھی اگر تیر سے ہوتے اس کے
اختیاری ہی نہیں ہر بار ہے ایسی شکل
آفت شب تنہائی کی ٹل جائے تو اچھا
کئے جو نالے تو نکلا بخار سینے سا
غرض نہ دیر سے مقصد نہ کعبہ سے اے دوست
جنون اب اور بتا کوئی شغل بیکاری
جو جس کے حق میں سمجھا وہ بہتر بنا دیا
غافل مقام رشک نہیں جائے شکر ہے
جام کو منہ سے لگانے کی نہ پہنچی نوبت
پھر وہی کنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر
کیا ملا عرض مدعا کر کے
سانس دیکھی تن بسمل میں جو آتے جاتے
پھینکدو، نگاہیں ابھی جبیں کے پہلو اپنا

سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا
ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا
مہ رو آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا
عالم نور ہے اے نور سراپا تیرا!
ہو چکا تھا اگر رخ خورشید پہ دھوکا تیرا
کھینچ گیا صانع ایجاد سے نقشہ تیرا
گھبرا گئے یہ دم آج نکل جائے تو اچھا
بھروسا تھا ہمارے دل میں یہ دھوکا کس کا
تجھی کو ڈھونڈھ رہا ہوں کہاں کہاں کب کا
اٹھا چاہوں گریباں کی دھجیاں کب کا

مجھ کو فقیر تجھ کو تو نگر بنا دیا
سو سے برا تو ایک سے بہتر بنا دیا

چشم مخمور نے ساقی کی یہ بیہوش کیا

اور دو روز ہوا باغ کی کھالے بلبل
بات بھی کھوئی التجا کر کے
اور جبیں کا دیا جلا دینے جاتے جاتے
تم پہ قابو نہیں دل پہ تو ہے قابو اپنا

وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے
ہے کب تلک شب ہجر تم چھپا سے گی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
نہ تڑپے ترا دل یہ ممکن نہیں
ہجر میں تھی کسے امید سحر
بت کریں آرزو خدائی کی
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
یکساں ہے دم کی آمد و شد بحر یار میں
نہ کھلواؤ میری زباں چپ رہو
بلبل کو رشک رنگین اپنا دکھا کے آئے
طبیعت کو تسکین دم بھر نہیں

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد
دکھایا کنج قفس مجھ کو اب وطن نے
اجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا
خبر نہیں کسے کہتے ہیں گل چمن کیا ہے
اداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
قفس کو شام سے لٹکا کے فرش خواب پہ یار
پروں کو کھول دے ظالم جو بند کرتا ہے
ہو نہ مایوس ریاضت کا صلہ ملتا ہے
کس طرح ڈھونڈھ نکالیں تجھے جویا تیرے
پڑتی ہے آکے جان پر آخر بلائے دل!

کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے
یہ ندی چڑھی ہے اتر جائے گی
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی
محبت ہے کام اپنا کر جائے گی
ہر رات کاٹی خدا خدا کر کے!
شان ہے تیری کبریائی کی
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل
آیا تو کیا ہوا جو نہ آیا تو کیا ہوا
کوئی بات منہ سے نکل جائے گی
تو باغ کو گئے تھے یہ گل کھلا کے آئے
الٰہی یہ کیونکر سنبھل جائے گی

ہیں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
وگرنہ دام کہاں ہیں کہاں کہاں صیاد
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد
قفس کو جانتے ہیں ہم تو آشیاں صیاد
کئی برس میں ہوا ہے مزاج داں صیاد
سنا کیا مری تا صبح داستاں صیاد
قفس کو لے کے میں اڑ جاؤں گا کہاں صیاد
بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے
نہ نشاں ملتا ہے تیرا نہ پتا ملتا ہے
یا رب کسی بشر کا کسی پر نہ آئے دل

دل پہ درد تیر نگہ پھیر گیا تو نے
ہر آنہ ہے سوز جدائی سے سر آیا
دل سینہ میں بیتاب ہے جان آگئی ہے لب پر
دو چار گام یاں سے ہے دولت سرائے دوست
پائی خبر جو آمد فصل بہار کی
شب فراق میں ہم سے تو نالہ کر نہ سکا
پوچھو نہ جلن کا دل کے احوال!
سنا کر یہ آتش گل نے جلا دیا گلشن
گلشن بغیر یار ہے کنج قفس سے تنگ
ناز و انداز و حسن و خوبی میں
خود بخود دل مرا افسردہ ہوا جاتا ہے
دل کو کس کس طرح بہلاتا ہوں میں
ہجر کی شب گردشیں کیونکر نہ لوں
آشیاں کنج قفس میں نہ کبھی یاد آیا
پھر بھی بادیہ پیمائی کی پاؤں کو حسرت باقی ہے
مجنوں ہے کہیں کہیں ہے فرہاد
ناداں ہیں جو رکھتے ہیں امید کسی سے
کبھی خوف خزاں ہے اور کبھی صیاد کا دھڑکا
درد و غم و یاس و داغ حرماں
دو دن کی حیات میں فلک سے
لب خشک ہیں ہمارے منہ زرد ہو گیا ہے۔

اگلے ہی میرے زخم جگر تھم بھی آئے !!
دیکھے تو کلیجے کے دکھاؤں تجھے چھالے
اب جان کو رو کے کوئی یا دل کو سنبھالے
ٹوٹیں یہ پاؤں کچھ تو آ کر کہاں تھکے
کیا پھر پھڑا کے مرغ گرفتار رہ گئے
وہ کون لوگ ہیں جو ضبط آہ کرتے ہیں
اک آگ بڑی دھک رہی ہے !
بچا کر خاک ہوا آشیاں نہیں معلوم
ہم تو بڑے عذاب میں اے ہمصفیر ہیں
کون ہے تم سا اس کا نام تو لو
کچھ سمجھ میں نہیں آتا مرا کیا حال ہے آج
پر تصور یار کا جاتا نہیں
کوئی پہلو دل کو چین آتا نہیں
بند آنکھیں تھیں جو لیکر مجھے صیاد آیا
جنگل جنگل پھر آیا پھر بھی حسرت باقی ہے
الفت کی عجیب صورتیں ہیں
جز ذات خدا کوئی کسی کا نہیں ہوتا
بناؤں کیا سمجھ کر آشیانہ اس گلستاں میں
اک دل ہے ہزار آفتیں ہیں
کیا کیا شکوے شکایتیں ہیں
اب دل نہیں سراپا اک درد ہو گیا ہے

میری طرف سے کوئی صانع ازل سے کہے
کھلکھلا کر نہ ہنسو میں نے کہا تھا تم سے
کیا جانیے کیا گیا دل عاشق سے گر گئی
خیال یار میں جھپکی نہیں پلک تا صبح
مست کیا جانیں کہاں دیر ہے کعبہ ہے کہاں
آج تک سر الفت نہیں سمجھا کوئی
لطف بہار گلستاں ہے مجھے یاد ابھی
المدد جوش جنوں وقت مددگاری ہے
ہر روز ایک وادی نو سیر گاہ ہے
نہ غرض دین سے نہ دنیا سے سروکار مجھے
رقص کے معنی کھلے اس بت کو رقصاں دیکھ کر
کر دیں آئینہ بھی پیدا خواص شیشے کے
دیکھے نہ چل کے ذرا عالم وحشت کی بھی سیر
دن تو عمر کے گذر چکے ہیں اس لئے
روئے رنگین عرق فشاں ہے
فصل گل ہے کہ جو چلا ہے ہیں مے فروش
پوچھے رند سے کیا ہو سبب مدہوشی
رند حاضر ہے شیشہ و ساغر
گل کھلے بادے چھلکنے لگے پیمانوں سے
تو نے کیا آتش حل کردہ پلا دی ساقی
درد دل دور کرے ساغر کی تاثیر

بگاڑتا ہے جو مجھ کو بنائے گا پھر کیا
قہقہہ سیکھ لیا کبک دری نے دیکھو
ہر بار کی شوخی تیرے بے ساختہ پن کی
تمام رات میں جاگا ہوں خواب کے لئے
عمر ساری تری بھی یہ گذاری ساقی
خوب صورت ہے ترا صانع ایجاد ابھی
دل قفس میں نہیں لگتا مرا صیاد ابھی
سلسلہ چھٹتا ہے زنجیر کا دیوانوں سے
وحشت دکھا رہی ہے بیاباں نئے نئے
یاد میں تیری دو عالم کو فراموش کیا
نازکی رفتار کا رکھا ہے اس نے نام رقص
ذرا سی ٹھیس میں بس چور چور ہوتا ہے
بیڑی کٹ جائے اگر پاؤں سے دانائی کی
پھیلتا ہے ابھی آفت شب تنہائی کی
شبنم گل سے ٹپک رہی ہے
بادہ رنگین بیاد ساقی کوثر نوش
چشم مخمور نے اک مست کو بیہوش کیا
مے نہ سمجھو اگر حرام تو لو !!
مست پھر نکلے بہکتے ہوئے میخانوں سے
پھونک ڈالا ہے جگر آگ لگا دی مرا تی
تیرے ہی ہاتھ سے اللہ شفا دے ساقی

میر وزیر علی صبا

تعارف :- ولادت معلوم نہیں ۔ سنہ ۱۲۷۲ھ میں گھوڑے سے گر کے انتقال ہوا ۔ آتش کے مشہور شاگرد تھے ۔ واجد علی شاہ کی سرکار سے دو سو اور محسن الدولہ کے یہاں سے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا ۔ ایک دیوان (غنچۂ آرزو) یادگار چھوڑا ۔ صنعتوں کے استعمال کو اچھا نہیں سمجھتے تھے خود کہتے ہیں :- اے صبا آپ رعایت نہ کریں لفظوں کی ۔ زرِ گل پایا جو گلچیں نے تو کیا مایہ ہوا

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے — بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

اللہ رے ان کا غصہ اتنا نہیں سمجھتے — کیونکر کوئی جئے گا جب یوں عتاب ہوگا

جائے عبرت ہے جہان بے ثبات — دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا!

بلبل کہاں بہار کہاں باغباں کہاں — وہ دن گذر گئے وہ زمانہ گذر گیا

نہ کہئے نالۂ عاشق میں کچھ نہیں تاثیر — سنی ہے تم نے کسی کی ابھی کہاں فریاد

آپ ہی اپنے ذرا جور و ستم کو دیکھیں — ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

آئے ہیں دم نزع وہ اغیار کو لیکر — کیا کہئے کہ کچھ کہنے کا ہنگام نہیں ہے

اک رشتۂ جاں سیکڑوں پھندوں میں پھنسا ہے — دنیا کے بکھیڑوں سے فراغت نہیں ہوتی

آئی بہار ہوتے ہیں دیوانے سنگسار — لڑکوں کی جھولیوں میں ہیں پتھر بھرے ہوئے

وہ زمیں پر قدم نہیں رکھتے — حسن کا کیا غرور ہوتا ہے

اے صبا جب بہار آتی ہے — ہم کو سودا ضرور ہوتا ہے

آغاز عشق ہی میں ہمیں موت آگئی — آگاہ بھی نہ حال سے وہ بے خبر ہوا

یہ جوانی تو عجب سر پہ قیامت لائی — یاد ایام کہ گذرا ہے لڑکپن کیسا

لے اڑا تجھ کو ترا حسن شباب — اب تو عالم ہی نرالا ہو گیا

عازم دشت جنوں ہو کے میں گھر سے نکلا — پھر بہار آئی قدم پھرنے لگے سر سے اٹھا

نادان ہیں جو کہتے ہیں امید کسی سے — جز ذات خدا کوئی کسی کا نہیں ہوتا

اٹھ کے پہلو سے کدھر آپ چلے جانے والے — جگر و دل ہیں تڑپ کر نکل آنے والے

آپ اپنی بے وفائی دیکھئے — ہم سے اور اتنی برائی دیکھئے!

ذکر رقیب عاشق شیدا کے سامنے — اچھی نہیں یہ آپ کی تقریر دیکھئے

دیکھا نہیں ہے طور نگاہ حضور کا — ہو جائیگا کوئی ہدف تیر دیکھئے

پیادہ پا میں رواں سوئے لالہ زار ہوا — بہار آتے ہی سر پر جنوں سوار ہوا

مثل حباب بحر جہاں میں نہ دم لیا — اک موج تھا کہ میں ادھر آیا ادھر گیا

کسی کے وعدے کا رہ رہ کے دھیان آتا ہے — اٹک اٹک کے نکلتی ہے انتظار میں روح

سو بار مجھ پہ ہجر میں صدمہ گذر گیا — اب تک نہ آیا خیر مرا نامہ بر گیا

تو عبرت گہ کروں گا میں نقشہ جہاں کا — اب کی عدم کی سمت سے آنا اگر ہوا

نہ روز حشر بھی جب اپنی داد کو پہنچا — خدا کے سامنے اس بت سے شرمسار ہوا

جنوں کا ولولہ موقوف ہے سیر بیاباں پر — الٰہی پھٹ پڑے یہ سقف فلک دیوار زنداں پر

وہ حال دل کا ہے جو صبا ہم بیاں کریں — اللہ جانتا ہے بتوں کو یقیں نہ ہو

کبھی خزاں کبھی فصل بہار میں گذری — کب ایک سی چمن روزگار میں گذری

بتوں کے عشق میں مجھ کو ہلاک کر ڈالا — یہ کیا مشیت پروردگار میں گذری

جنوں کا داغ لگا گھر چھٹا اسیر ہوئے — ہزار طرح کی آفت بہار میں گذری

مثال دیر بھری ہیں بتوں کی تصویریں — الٰہی قصر دل خانماں خراب گرے

تا روز حشر یاد رہے گا یہ سانحہ — نکلی ہے جان ہجر کی شب کس عذاب سے

کبھی رسائی آہ جگر نہیں ہوتی — ہمارے دل کی انہیں کچھ خبر نہیں ہوتی

درازی شب تار لحد معاذ اللہ — بغیر صبح قیامت سحر نہیں ہوتی

فراق یار میں دیکھے جسے وہ ناصح ہے — تسلی دل غمگیں مگر نہیں ہوتی

عجب نہیں مرے مرنے پہ آپ کا ہنسنا — کسی کے دل کی کسی کو خبر نہیں ہوتی

ہو رہے ہیں ظلم ہفت افلاک کے — امتحاں ہیں ایک مشت خاک کے

آدمی دعوئے انا الحق کا کرے   دل لئے دیکھو تو وحشت خاک کے
توڑ زاہد رشتۂ تسبیح کو   کھول دے پر طائر ادراک کے
مساجد سے زیادہ صفِ جنت کا جو واعظ   اٹھے مسجد سے اور کوئی بت بے پیرہن آئے

نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے   جنوں کا جوش ہے فصلِ بہار باقی ہے
شبِ فراق سے بچ جائینگے تو جائیں گے   کچھ اور زندگیٔ مستعار باقی ہے
ہزار بار قیامت گذر گئی ہم پہ   مگر ہنوز شبِ انتظار باقی ہے
شبِ فراق میں تا صبح دیکھئے کیا ہو   ابھی تو رات دلِ بیقرار باقی ہے
کسی کو دیکھ کے قابو میں جی نہیں رہتا   یہ روگ آج تک اے جان زار باقی ہے

ہرگز نہ کوئی ملک عدم سے پھر آئے گا   عالم اگر یہی ہے جہانِ خراب کا

داغ جسکا جلی نسیم بہار !   یہ ہوا میں چراغ کس کا ہے

کہتے ہیں سب ترے رخ پہ نور کیلئے   زیبا تھا یہ چراغ سرِ طور کے لئے
ہلتا ہے عرش نالۂ بے اختیار سے   اتنی تو بات ہے دلِ رنجور کیلئے
بنت العنب پہ کی تھی توجہ نہ کی مگر   زاہد یہ جن سوار رہا حور کیلئے

ہم عاشقوں کی خوبی تقدیر دیکھئے   آپ اپنی آئینہ میں تو تصویر دیکھئے
تیرے شبِ چہاردہ ہم کے بناؤ سے   دو دن میں ماہتاب کا چہرہ اتر گیا

فکر رکھتے نہیں ہیں دیوانے   باعثِ غم شعور ہوتا ہے
ہم ہیں مجبور آپ ہیں مختار   کہئے کس سے قصور ہوتا ہے

گر محبت کا دل میں داغ نہیں   خانۂ کعبہ ہے چراغ نہیں !

کس دن شبِ غم جان کو آفت نہیں ہوتی   کب شام سے یاں صبح قیامت نہیں ہوتی
اللہ ہمیں عشق کے پھندے سے نکالے   دم توڑ لئے ہیں قطع محبت نہیں ہوتی
خدا کا قہر بتوں کا عتاب سہتا ہے   اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب سہتا ہے

نہیں ہے اہلِ ہوس کیلئے حلاوتِ عشق   نصیبِ مور و مگس نیشکر نہیں ہوتی

کس طرح ہجرِ صنم میں کوئی دل کو سمجھائے   یہ کہاں سے کوئی پتھر کا کلیجہ لائے

دل لگانا عذاب ہوتا ہے   آدمی کیا خراب ہوتا ہے

میخانۂ عالم میں غنیمت ہے مرا دم   اتنا بھی کوئی رند مے آشام نہیں ہے

جو دیکھے گا اس کو وہ اسی کی سی کہے گا   تیرا کوئی اے دل نہ یہاں ہے نہ وہاں ہے

ملا دی خاک میں میری جوانی !   خدا سمجھے بتِ بیداد گر سے

شوقِ دیدار میں طاقت نہیں گویائی کی   حالتِ دل کا اشارہ نہیں بیان ہوتا ہے
مجرمِ عشق ترحم کا سزاوار نہیں   ہائے کس پاس سے ہر سو نگراں ہوتا ہے

اس آفتاب کا جو کبھی سامنا ہوا   مہتاب چھپ گئی رخِ ماہِ تمام پر

دمِ آغاز جنوں طوق گلو گیر ہوا   عقل مجانے بھی نہ پائے تھے کہ صیاد آیا

باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا   پیرہن گل کا نہ اترا ابھی میلا ہو کر

قدِ قیامت کا ملا جیسا بلا کی پائی   آفتیں ڈھائیں نہ یہ فتنۂ دوراں کیونکر
ہم کو تو ملے کے حسینوں سے بہت رنج ہوئے   خوش رہا کرتے تھے پریوں میں سلیماں کیونکر
جا کے مسجد کیطرف اس بتِ غارت گر نے   لوٹ لی زاہد کی دولت ایماں کیونکر

حسیں کوئی نظر آیا ہوا میں آپے سے باہر   دل بیتاب ہے سینہ میں یا پارہ ہے معدن میں

یہ نشاں ہے مزارِ عاشق کا !   چادرِ گل نہیں چراغ نہیں

اٹھے خرام ناز کو وہ دھوم پڑ گئی   فتنہ بپا ہوا ہے قیامت کہیں نہ ہو

چھالا رکھے کسطرح مرہم لگائے کس طرح   کیا کرے وہ جس کے دل میں عشق کا ناسور ہو

کچھ اثر آہ میں جو پیدا ہو !   قہر ہو جائے حشر برپا ہو

خاموشی میں دل سے وہ رہا کرتی ہیں باتیں   گویا کہ زباں سے ہمیں کچھ کام نہیں ہے
واعظوں سے کوئی تعریف سنے حور و پری   مسجدوں میں تو قیامت کا بیاں ہوتا ہے

تیرگی تو تیری آنکھیں دم فنا کی کی روشن ہیں
چاہا جس کو ہے جو چشم بینا ہو
ایک ہی نور کا زمانے میں
اتنی تو دید عشق کی تاثیر دیکھئے
دل کی صفا سے سو طرح یہ دم یقینی ہے
اور ہی حال زمانے کا نظر آئے گا
تجھ کو دیر و حرم گبر و مسلماں سمجھے
تا نہ زمانۂ حال کا فقر سے ہوا
کعبہ کی سمت سجدہ کیا دل کو چھوڑ کر
کہیں معشوق کہیں عاشق کہیں عشق دیکھا
طائر عقل کو مفقود کیا زاہد نے
صبح محشر ترے عشاق تجھے ڈھونڈیں گے
جامۂ یار کی بو پائی صبا نے خوشبو
ساقی کی چشم مست نے ایسے جھومتے لا کر دیے
چھپے کو شیشیش دنیا میں اضطراب ہے
خوف کی جا ہے نہ چھیڑ دل سوزاں کر
خود حقیقت ہے جو واہ ہی
بچ کر کہاں ہی انکی نظر سے نکل گیا
تو جہاں رہ گئے ہم کچھ خبر نہیں
معنی سے بہتر یار میں تسکین ہو گئی
سمجھی دہر ہے کیا خود دل عاشق کو
زخم جو ہو سے ہوئے کیف شراب سے

شعاع مہر سے نور ہر اک چشم روزن ہیں
آئینہ ہے جو دل مصفا ہو
سو طرح سے ظہور ہوتا ہے
جس سمت دیکھئے تری تصویر دیکھئے
آئینہ جمال نمایاں آفریں دہ ہے
آگہی کر تو ذرا فقر و غنا سے پیدا
منزلت ابھی نہ کی ذہن رسا سے جدا
سامان کیا کیا کہ بڑا درد سر گیا
تو کس طرف تھا دھیان ہمارا کدھر گیا
تجھ کو ہر بزم میں اے رونق محفل دیکھا
پر پرواز میں تسبیح کا ڈورا باندھا
ذرے سے خورشید سے ہیں آنکھ لڑانے والے
لپٹ غنچہ و گل باغ میں کھولا باندھا
شعلہ سا ایک آتش تر سے نکل گیا
بہت تمنا دل خانما خراب رہا
آگ سینے میں کسی نے کہیں جگر توڑا
دروازہ کھل گیا تو میں گھر سے نکل گیا
اک تیر تھا کہ صاف جگر سے نکل گیا
آیا کدھر سے یار کدھر سے نکل گیا
دل کا بخار دیدۂ تر سے نکل گیا
یہ وہ شیشہ ہے جو لڑ جا کر پتھر سے
انگڑائی پھوٹ گئے چلتے آفتاب سے

میر دوست علی خلیل

تعارف:- سید جمال علی کے بیٹے دوست علی نام خلیل تخلص۔ واجد علی شاہ کے عہد میں چکلہ دار تھے بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے غدر میں باغیوں کی فوج کے ایک حصہ کے کمانڈر تھے اور بڑی بہادری سے لڑے حضرت محل اور برجیس قدر کے ساتھ نیپال کی ترائی تک گئے کہ انگریزوں کی طرف سے عام معافی کا اعلان سنا بارہ ہزار عالیٰ رتبے والے جوانوں کو ساتھ لے کے معافی کے لئے آئے کہ اگر اس اعلان میں دغا ہو تو بہادروں کی طرح لڑ کے جان دیں مگر انگریزوں نے معاف کر دیا۔ ۱۲۷۹ھ میں نواب نادر مرزا کے ساتھ کلکتہ بھی گئے تھے۔

شاعری میں خواجہ آتش کے رشید شاگرد تھے اور ان کی خیر گیری میں پیش پیش رہتے تھے۔

ایک دیوان گلزار خلیل یادگار چھوڑا ولادت اور وفات کا رتبہ کوئی علم نہیں ہوا غالب خیال یہ ہے کہ جس سال غالب کی وفات ہوئی اسی سال خلیل نے بھی رحلت کی۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

یہ کرم ہے جوش میں رب غفور کا
جلوہ ہے داغ دل میں کسی ماہ نور کا
ہوں وہ آوارہ کہ منزل میں بھی آوارہ گرد
لاکھوں پردوں میں بھی ہو جاتا ہے ساحل حسن و عشق
کم ہوتے ہیں جو شیش وحشت میں ہوا سر اپنا
جنوں کا زور ہوا شوق سیر باغ ہوا
خیال چہرۂ روشن سے داغ دل چمکا

حیلہ ہی چاہتا ہے وہ عفو قصور کا
یہ تو مرے چراغ میں ہے شمع طور کا
چھوڑ قبلہ نما لاکھ مجھے گھر ملت
شمع کی روشن جو جہاں موجود پروانہ ہوا
کیا سمجھا تھا جنوں یوں سر دھر جائے گا
بہار آتے ہی گل عقل کا چراغ ہوا
چراغ طور سے روشن مرا چراغ ہوا

نہ زندگی میں ملا چین صورتِ بسمل
چھٹی جو روح بدن سے تو پھر قرار آیا

رہ اردی میں جوانی کا کچھ مزا نہ ملا
مسافرِ گل کی طرح چار دن شباب رہا

بد رنگ میں اس شوخ کا جلوہ نظر آیا
خورشید کے مانند وہ ہر جا نظر آیا

جب یار کو دیکھا نگہِ دیدۂ دل سے
قطرہ نظر آیا تو وہ دریا نظر آیا

پرتو سے ترے دیکھتا ہوں صورتِ عالم
تو روشنیٔ دیدۂ بینا نظر آیا

وہ رنگ ہے تیرا کہ ترے رنگ کے آگے
جس رنگ کو دیکھا وہ پھیکا نظر آیا

آنسو بھرے ہیں آنکھ میں گرتے نہیں مگر
آخر چھلک چھلک کے یہ پیمانہ رہ گیا

اس بزم سے جو ہوش اڑا دیتے جلوے یار کے
اٹھا جو بزمِ یار سے وہ بے خبر اٹھا

میر ساغر لے کا سبب ہجر میں کیا پوچھتے ہو
غم ہوا درد ہوا درد کا درماں نہ ہوا

منہ تو محشر میں بھی دکھلائے گا
پھر کہیں اور بھی شرمائے گا

فرقت میں اجل کا سا مزا ہے
یہ وقت ہے سخت بے کسی کا!

ہے داغ سے آبروئے عاشق
تمغہ ہے یہ عشق و عاشقی کا

چین دم بھر نہ مجھے صورتِ بسمل آیا
آ گیا منہ کو کلیجہ جو کہیں دل آیا

دل نہ قابو میں رہا متصل پہلوئے یار
ناؤ ڈوبی مرے نزدیک جو ساحل آیا

دل گزرگاہِ خیالِ بتِ ترسا نکلا
کعبہ جسے سمجھتے تھے ہم وہ کلیسا نکلا

نہ مجھ سا بلبلِ شیدا نہ دیدۂ تر پیدا
نہ تجھ سا گل چمنِ روزگار میں آیا

رازِ دل کیا کہوں کاندھے پہ فرشتے ہیں سوار
کہیں موقع مجھے ملتا نہیں تنہائی کا

خطِ تقدیر کا شکوہ ہے عبث
اس نوشتہ کا ہے بیکار جواب

بسر کی عصیاں میں ہوتے پردۂ دل چاک کر
الٰہی توبہ الٰہی توبہ گنہ کیے ہیں چھپا چھپا کر

اللہ رے اضطراب دلِ بیقرار کا
رہ رہ کے صبح کی ہے شبِ انتظار میں

کیا کشمکش میں عشق نے ڈالا ہے کیا کروں
یارا اختیار میں نہ اجل اختیار میں

بزمِ بتاں میں چھوڑ دیا دل کو بے خطر
شیشہ کو ہم نے پھینک دیا کوہسار میں

زندگانی کا سبب عاشق کی ہجرِ یار ہے
زیست پروانے کی وصلِ شمعِ محفل میں نہیں

ہو نہیں سکتا ہے محسوس نظر بوزِ نگاہ
کر دیا ظن میں جو ترے طالبِ دیدار ہیں

جوانی میں بڑھاپے میں دلِ بے غم نہیں ملتا
بہارِ زندگی کا لطف ملتا ہے لڑکپن میں

ہوں بندۂ عشقِ بتاں کچھ دیر و حرم سے کام نہیں
مذہب ہی جدا ہے الفت کا یاں کفر نہیں اسلام نہیں

فصلِ گل آئی ہے معشوق سے توبہ کی ہے
دن خطا ہی میں خجل ہوتا ہوں کیا کیا دل میں

چشمِ دل سے جو یار کو دیکھے
پھر کوئی بیچ میں حجاب نہیں!

خاکسار دل ہی سے منزل کا پتہ ملتا ہے
نقشِ پا رہبرِ دل کو راہ نما ہوتے ہیں

ہر موسمِ گل میں طوق و زنجیر
توبہ کی طرح سے ٹوٹتے ہیں

زباں وا نہ کی محبت بزمِ عالم میں بھی گو
سناتا ورنہ حسن و عشق کی میں داستاں برسوں

ہجر میں موت ہی حیات کے دن
نظر آتے نہیں نجات کے دن

ہم حسن چھپ کے رہیں طور نہ تجلی کی داستاں
اے بت نقابِ رخ نہ اٹھانا جلال میں

روزِ الست سے ہے وہ میرے خیال میں
اللہ کب سے محو ہوں شوقِ جمال میں

عقدہ نیاز و ناز کا ہرگز نہ حل ہوا
آیا نہ حسن و عشق کا قصہ خیال میں

پھر وہی طولِ شبِ ہجر نظر آتا ہے
پھر دمی ہے مجھے حشر کا کہ سحر ہو کہ نہ ہو

تم سنو یا نہ سنو نالے کیے جاؤ نکال
دردِ دل کہنے سے مطلب ہی تو ہو گو نہ ہو

جمالِ حور کا مٹی کی مورتوں کو دیا
کمالِ صنعتِ پروردگار کو دیکھو

جگر شق ہو گیا داغِ جگر سے
یہ ٹہنی پھٹ پڑی بارِ ثمر سے

نہ دیکھا ایک دن بھی پھر کے دن کو
رہا دس روز ہم اپنے بھی نظر سے

الٰہی روز کا رونا کہاں تک
کلیجہ منہ کو آیا چشمِ تر سے

نہ موافق کبھی طبع بت بے پیر ہوئی
یہ بھی میرے لیے گویا مری تقدیر ہوئی

شب تو مر مر کے سحر کی غم تنہائی سے
دیکھیے ہجر کا دن کیا مجھے دکھلاتا ہے

اپنے نالوں سے گلستاں میں ہوا بدنام ہم
ایک دن جو صف مرغ چمن دیکھیں گے

دیں گے ہم عشق جوانی کو بڑھاپے میں فروغ
جو ہر تشنۂ صہبا کے کہن دیکھیں گے

ہوتے ہیں ہشیار جو حیراں ہیں ازل سے
آئینہ کی حیرت کسی صورت میں نہیں جاتی

بدلے یہ گلستاں جہاں رنگ ہزاروں
خوشبو ہے گل داغ محبت نہیں جاتی

معلوم ہوا جامہ صد چاک سے گل کے
کپڑے بھی پھٹے ہوں تو شرافت نہیں جاتی

پیدا ہزار رنگ ہیں نیرنگ حسن سے
گلدستہ بہار ہے تصویر یار کی

کچھ رنگ ڈھنگ جوش جنوں کے ہیں بے طرح
گذرے الٰہی خیر سے مدت بہار کی

ڈر سے کہہ سکتے نہیں جس دن سے آئی ہے بہار
منہ کو تکتے ہیں اسیران قفس صیاد کے

ہو اشباب مرا شب کیا قیامت ہے
تری بہار کو دیکھیں مری خزاں دیکھیں

یہ رہائی سے گرفتاری میں پایا ہے مزا
پڑھتے نہیں کلمہ اسیران قفس صبا کا

رہائی محبس گردوں سے پائی قبر میں جا کر
نکالا ہے زمیں کو کھود کے دروازہ زنداں کا

کیا بتاؤں میں تجلی گاہ کہیں شوخ کی
ہوش آئے کس طرح سے بے خبر کیوں ہو

کچھ نہ پوچھو بتا نہیں سکتا
کس سے چھوٹا ہوں کیا نہیں ملتا

آسمان و زمین شکنجہ ہے
چین اس میں ذرا نہیں ملتا

دل ہی دل میں گفتگو رہتی ہے باہم روز و شب
میرے اس کے درمیاں تقریر کی حاجت نہیں

جوانی میں بڑھاپے میں دل ہے غم نہیں ملتا
بہار زندگی کا لطف ملتا ہے لڑکپن میں

مسلماں جانتے ہیں شمع قندیل حرم تجھ کو
چراغ دیر ہے تو اے صنم چشم برہمن میں

اڑیاں ہجر کی ایذائیں یہاں تک رگڑوں
یاالٰہی مری مشکل کبھی ہو آساں کہیں

زاہد ہم ڈر سے نہیں دیکھتے اب اس کی حیا
کہ تلف منت میں ہو جائے نہ ایماں کہیں

میر سیادت حسین عرف آغا حجو تخلص شرف

آتش کے شاگرد واجد علی شاہ کے مصاحب اور ہمدم تھے ان پڑھ تھے مگر کلام اغلاط سے پاک اور پختہ ہے ان کا ایک خاص رنگ ہے دیر و بتکدہ، صنم و برہمن، ناقوس و قشقہ، زنار و تسبیح، زاہد و مصلی، سو، ذن و واعظ، شیخ و میخانہ، شیشہ، ساغر، ساقی و پیر مغاں، جام و صراحی کا ذکر نہیں آنے پاتا تھا کہتے تھے کہ جن شعروں میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں ان سے مجھے نفرت ہو جاتی ہے راجہ امیر حسن خان صاحب محمود آباد نے ان کا دیوان چھپوا دیا ہے مجھے دیوان نہیں ملا تذکروں سے اشعار نقل کئے ہیں اگر دیوان مل جاتا تو انتخاب کچھ اور ہوتا۔

جھٹپٹا وقت ہے بہتا ہوا دریا ٹھہرا
صبح سے شام ہوئی دل نہ ہمارا ٹھہرا

منزل عشق کا حال آپ ہیں آگاہ تو کہیں
دم ذرا لینے دو میں دل کو سنبھالوں تو کہوں

کون ہے جس سے فسانہ کہوں دل تیرا
سننے والا کوئی پہلو میں بٹھالوں تو کہوں

پوچھتے کیا ہو حقیقت مری بیتابی کی
آؤ میں تم کو کلیجہ سے لگا لوں تو کہوں

پھڑک کے جان نہ دیتا تو آہ کیا کرتا
قفس سے اور نکلنے کی راہ کیا کرتا

چہار سمت مجھے تو ہی تو نظر آیا
اٹھا کے آنکھ جدھر انتظار میں تکتا

اے سرو حسن پرستی کا مزا اچھا ہے تجھ کو
دل دیا اس کو جسے پیار کے قابل سمجھا

شاخ گل جھوم کے گلزار میں سیدھی ہو گئی
پھر گیا آنکھ میں نقشہ تری انگڑائی کا

واہ رے تقدیر ہم جب پہنچے بزم یار میں
شمعیں سب گل ہو چکی تھیں ختم تھا پروانوں میں

دے گا خاک بھی اک دن تو قسم دنیا کا
یہ کارخانہ ہے مشت غبار سے پیدا

بے نیازی یہ انھیں ناز مرے دم تک تھا
سن ترانی کی نہ پھر آئی صدا میرے بعد

داغ ہجراں جگر و دل میں نہاں رکھتے ہیں
آپ کا حسن نہیں ہے جو چھپا ہی دکھیں

کام عمر نہ بیٹھے کہیں ٹھکانے سے
لیے پھرتی ہیں دن رات جستجو تری

پنڈت دیا شنکر نسیم!

تعارف:۔ لکھنؤ کے کشمیری برہمن علم و فضل میں مشہور ہیں۔ بڑے بڑے شاعر اور انشا پرداز ان میں پیدا ہوئے۔ کول۔ چکبست۔ سرشار وغیرہ ان کے مشہور خاندان میں نسیم کو ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ بیس برس کی عمر میں آتش کے شاگرد ہوئے۔ ۱۸۵۴ء میں مثنوی گلزار نسیم لکھی ہے اس سے ایکا ایکی ان کی شہرت ہو گئی۔

۱۸۶۰ء میں یعنی تصنیف کے چار برس بعد یہ مثنوی چھپی اسی سال لکھنؤ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۳۲ سال کی تھی۔

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

جب ہو چکی شراب تو میں مست مر گیا
سمجھا ہے حق کو اپنے ہی جانب ہر ایک شخص
جنوں کی چاک زنی نے اثر کیا وال بھی
بہار رفتہ پھری اب ترے تماشا کو
اشک ٹپکے حال دل کا کھل گیا
کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ
بجز گور غریباں نقش پا ملتے نہیں آگے
بت خانہ کا پابند نہ کعبہ سے تعلق
شب فراق میں آنکھیں لگی ہیں جب دم
دل بدلی آئینہ ہے دیر و حرم!
بے حجابی پردہ در پردہ حجاب آتے ہیں

شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا
یہ چاند اس کے ساتھ چلا جو جدھر گیا
جو خط میں حال لکھا تھا وہ خط کا حال ہوا
چمن کو میں قدم نے ترے نہال کیا
دیدۂ گریاں سے پردہ کھل گیا
بند کیں آنکھیں تو رستہ مل گیا
یہیں تک ہر مسافر نے پتا پایا ہے منزل کا
آزاد ہے قیدی سے گرفتار تمہارا
لبوں پہ آہ ہے دل میں خیال آہٹ کا
حق جو پوچھا یک دو ہے دو طرف
شرم رکھ لیتی ہے آنکھوں پہ نظر کا آس

چمن میں رنگ نے لالہ یا مرا لہو کیا کیا
جو لطف زندگی تھا وہ حاصل نہ کر سکا
کہ عمر بھر اسے پہلوئے یار میں دیکھا
غرض یہ چلتی پھرتی چھاؤں ہے عالم جوانی کا
بہار آتے ہی ہم کو اسیرا ہوتا تھا
پہلو تہی کی دل میں قضا و قدر نے کیا
نہ بھیجو سا ہے جگر کا نہ کبھی دسا دل کا
جگر میں لاکھ لاکھ طرح آسماں رہا
نہ کوئی آشنا نکلا نہ کبھی نا خدا نکلا
یہ واں ہول میں انجمن کائنات کا
آج شیرازہ ہستی ہے پریشاں اپنا
بہار دل اٹھ گیا ہے گماں قفس کا ہے آشیانہ
ہم نے بھی اپنی جان لٹا دی قضا کے ساتھ
یہ بے شمار ہیں ان کا شمار کیا ہو گا!
دل جب الجھے گا تو کوئی نہیں سلجھانے کا
کیا جانے اس نے میری طرف کیا گمان کیا
محشر میں اس کو ڈھونڈھنے کی راہ کیا کرو
دیکھے کسی نے ہاتھ اس کا دست قدرت میں
حقیقت میں یہ سب نقش و تصویر ہے بھی
کلیم طور پہ جائیں میں عرش پر جاؤ
یاد تصویر ہے آئینہ دیوار ہوں میں
جان کا کا ہے جو ہے یہی کچھ نہ رہنے یاد نہیں ہو

ٹیک ٹیک کے کہیں گل بنا کہیں لالہ
اندیشۂ اجل سے نہ مہلت کبھی ملی
کمال ربط دل بے قرار میں دیکھا
دو روزہ ہے بہار عمر انساں یعنی عالم
گلوں کی شکل بھی ہم نے نہ آنکھ سے دیکھی
دل کو بچا کے یار کی تیر نظر سے کیا
پانی ہو جائے گا وہ ہے یہ لہو ٹھنڈے کو
کچھ بس نہ میری گردش قسمت سے چل سکا
لی ہا جب مجھے دریا ہم ہی یاس سے سرت
موجود جو نہ ہو سکا ہے وہ میرا چراغ ہے
روح وحشت ہے جگر خون ہے دل ہے
من مجھ سا یہ بھٹکا گیا ہوا سے بھی جیتا جاتا ہوں
اک بار ہمیں پائی جو شوخی یار کی
شمار کون کرے گا تمہارے کشتوں کا
زلف سلجھے گی تو شانے سے الجھ جائے گی
ستو وہ جو گر کے مجھے بے نشان کیا
ستے ہیں بند پھر سی ہے پھر ہر طرف
جہاں تک جس قدر عالم ہوا اس پر اسقدر کم ہے
سینوں کو خدا نے حسن کے سانچے میں ڈھالا ہے
کسی کے عشق میں یارب آنکھ ہو نہیں
اس کو حیرت ہے ادھر پھر کر ادھر سکتا ہے
اس کے بعد کا تو دنیا میں ٹھکانا ہی نہیں

تجھے دل دیکے میں نے آزمایا !
وہ سیکھا جس نے کچھ کھویا ہے پیارے

جنبش ہوئی مژہ کو تو برہم ہوئے دو کون
آہو سے چشم یار کی یہ ایک جہت ہے

تجھے بھولے تو لطف دیدہ تر دل بھی آ پھنسا
مچھلی کو کیا خبر تھی کہ پانی میں شست ہے

شاگرد خواجہ آتش ہندی جو ہے نسیم
کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

جوہر تیغ نگہ کھل جائے گا
منہ نہ میرے زخم کا کھلوا دیجئے

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی

گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا
شاخ گل اک دن جھونکا کھائے گی

کچھ تو ہوگا ہجر میں انجام کار
بیقراری کچھ نہ کچھ ٹھہرائے گی

دل سے ہر دم ہوا آواز کا ہی
بتکدے کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے

دوزخ وحشت ہے اب مرنے کی لذت کے سامنے
گھر رقیبوں نے بنایا اس کے گھر کے سامنے

خواب میں شب کو خیال آیا تھا جنت کا ہمیں
صبح دیکھا تو پڑے ہیں تیرے در کے سامنے

نظارہ بازی سے آنکھیں تو پا گئیں تسکین
تسلی دل امیدوار باقی ہے !

نام پہ حرف نہ آنے دیجئے
جان اگر جائے تو جانے دیجئے

کیوں خفا رشک حور ہوتا ہے
آدمی سے قصور ہوتا ہے

ایک اقلیم میں دو شاہ نہیں رہ سکتے
عشق جب آیا تو آرام کہاں رہتا ہے

جو چپ ہوں تو جنوں دل ہی پیچ و تاب کھاتا ہے
فغاں کروں تو گریباں گلا دباتا ہے

سیر بیاباں چاک گریباں !
وہ پائے خردی یہ دسترس ہے

صبر رخصت ہو تو جانے دیجئے
بیقراری آئے تو ٹھہرا لیجئے !

نام پر حرف نہ آنے دیجئے
جان اگر جائے تو جانے دیجئے

ٹکڑے جگر کے آنکھ سے باہر نکل گئے
ارمان آج دل کے ہمارے نکل گئے

بیدار ہیں بخت خفتہ ہجر
یارب آنکھوں کو خواب دیدے

مجھ سے پہلے کوئی اس شوخ پہ کب مرتا تھا
ملک الموت ہوا میری قضا سے پیدا

بتوں کی گلی چھوڑ کر کون جائے
یہیں سے ہے کعبہ کو سجدہ ہمارا

شب جو آیا بزم میں وہ شعلہ رو
شمع گل کرنے کو پروانہ جلا

صہبا کشوں کی خاک ہے ہر اک قدم پہ
ساقی اللہ تھا شراب کے مستوں کے نام پہ

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند
واللہ ہوشیار ہے وہ جو کہ مست ہے

کچھ خبر ہے شب دراز فراق
چاک پیراہن سحر کیوں ہے

عشق کے زینے پہ ہم آگے آسمان بھی پست ہے
سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

خم نہ بن کر خود غرض بن جائیے
مثل ساغر اوروں کے کام آئیے

ابر رحمت سنتے ہیں نام آپ کا
خاکساروں پر کرم فرمائیے

اب آپ چشم میں آہو نہیں
ہم سے وحشت کی سیکھئے آئیے

دل لگا کر اس سے کھٹائی ہی میں دشمنی
بڑھ کے ہو جاتی ہے آخر دل لگی میں دشمنی

طوفان نوح اس میں ہو یا شور حشر ہو
ہونا جو ہے وہ ہوگا جو گزرا گزر گیا

بے دل جو مجھ کو پایا تو بولا خیال یار
مہماں بلا کے صاحب خانہ کدھر گیا

کس سوچ میں ہو نسیم بولو !
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

زنجیر جنوں کڑی پڑے لو !
دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے

آتا ہو تو اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے

گل ہو گئی چراغ سحری اے بلبل
ہاتھ ملتی ہوئی پتوں سے صدا آتی ہے

آغا حسن امانت
شاگرد دلگیر

تعارف:۔ سنہ ۱۲۳۱ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۲۷۵ھ میں انتقال ہوا۔ لفظی رعایت میں مشہور ہیں اور اکثر بے ڈھنگا پن پیدا ہو گیا لوگ اسی کو انکا امتیاز سمجھتے ہیں اور ایسے ہی اشعار پیش کرتے ہیں حالانکہ ان کے یہاں اچھے شعر بھی ہیں آج ہم آپ کو ان کے اچھے شعر سناتے ہیں ؎

روح کو راہِ عدم میں مرا تن یاد آیا — دشتِ غربت میں مسافر کو وطن یاد آیا
جیسے بھولے گئے رنج و محن یاد آیا — رو دیا میں نے قفس میں جو چمن یاد آیا
برگِ گل دیکھ کے آنکھوں میں ترے بھر گئے لب — غنچہ چٹکا تو ترا لطفِ سخن یاد آیا
آہ کیوں کھینچ کے آنکھوں میں بھر آئے آنسو — کیا قفس میں تجھے اے مرغِ چمن یاد آیا

بتوں کے عشق میں کیا جی کو اضطراب دیا — یہ دل دیا کہ خدا نے مجھے عذاب دیا

گلشنِ دہر میں آئی برس دن میں بہار — اس سبکروح کو بھاری ہوئی منزل کیسی

وہ بت مجھ سے ناحق خفا ہو گیا — خداوند عالم یہ کیا ہو گیا!

نکالی غنچہ نے بات اس کے مسکرانے کی — ہنسی ہنسی میں یہ مجھ کو رلائے گا پھر کیا

ہے فصلِ بہاری میں یہ صیاد کا دھڑکا — دل اڑ گیا بلبل کا جو پتہ کہیں کھڑکا

روشن دلوں کو بادِ حوادث سے کیا گزند — صرصر سے گل ہوا نہ چراغ آفتاب کا

کون تھا بارِ غمِ عشق اٹھانے والا — مجھ کو پیدا جو نہ کرتا تو خدا کیا کرتا

لطف اب زیست کا اے گردشِ ایام نہیں — مے نہیں یار نہیں شیشہ نہیں جام نہیں

فریاد ہجر میں نہ کبھی عمر بھر کریں — مر جائیں بھی تو ہم نہ کسی کو خبر کریں

فصلِ گل میں رات دن بس ہم ہوں اور میخانہ ہو — ساقیِ مہوش ہو مے ہو شیشہ ہو پیمانہ ہو

بزمِ عالم کے حسینوں میں عجب اندھیر ہے — جان لیں پروانہ سے اور شمع کو پروانہ ہو

یک بیک شب کو جو وہ رشکِ قمر آ نکلا — چاندنی کھل گئی فوراً مرے سارے گھر میں

کر سبک تن کو مرے مثلِ حباب اے غمِ یار — روح کہتی ہے کہ پوشاک بہت بھاری ہے

بچا لیجئے گا بات مری مان لیجئے — میں جان دوں گا آپ پہ یہ جان لیجئے
لب خشک چشم تر ہے زباں لال چہرہ زرد — عاشق کو شکل دیکھ کے پہچان لیجئے
ہرگز لگائیے نہ امانت بتوں سے دل — کہنا مرا خدا کے لئے مان لیجئے

کس کے نالوں نے کیا بزم کو روشن مطرب — آج کیوں شعلۂ آوازِ ترا مدھم ہے
دورِ ساغر میں نظر آتی ہے ساری دنیا — جم گیا جام کا جب رنگ تو ساقی جم ہے

بہار آئی ہے گلشن میں گھٹا جاتا ہے دم اپنا — قفس کے در کو وا کرتا نہیں صیاد کیا کیجے

دل مرا اسیرِ چمن سے نہ ہوا شاد کبھی — لے گیا باغ میں پنجرے سے نہ صیاد کبھی
بلبلو کس کو دکھاتی ہو عروجِ پرواز — ہم بھی اس باغ میں تھے قید سے آزاد کبھی

وہ دم حسینوں کا بھرتا ہے ہو چکی مری زیست — جو خود مریگا کسی کو جلائیگا پھر کیا

خط اُن کا دیکھئے مجھ کو نامہ بر نے بیٹھا اک گلی — کہا میں نے یہ کیا بولا کہ پیغام زبانی ہے

تاج اپنے بنا کے سر پہ رکھے آسماں نے — ذرے کچھ آ گئے جو ترے نقشِ پا کے ساتھ

آئی بہار ساقیا جام شراب دے پلا — پھول کھلنے لگے شجر ابر اٹھا چلی ہوا

انگیا بہار کے لئے اے بخیہ گر جنوں — دو چار تار ہم نے گریباں میں کر لئے

جو غرق ہوا پھر نہ لگا اس کا ٹھکانا — ساحل کا پتہ عشق کے دریا میں نہیں ہے

مرتا ہوں ترے ہجر میں اے یار خبر لے — اب جان لئے جاتا ہے یہ بیمار خبر لے

کس غم کو ہم اس دل پہ گوارا نہیں کرتے — شکوہ ترا پر اے ستم آرا نہیں کرتے

لطفِ یار ایک گھڑی ہجر کا برسوں ستم ہے — فرصتِ عیش زمانے میں نہایت کم ہے

اللہ رے ہجومِ گل و جوشِ بہار — ملتا نہیں ہے بیچ مرا آشیاں مجھے

تری بھووں میں بل پڑا قتل ہو ابھی تیغ سے — تری ادھر پلک جھپی چھپ ادھر چلی چھری

عریاں رہا جنوں میں مرا ہر طرح بدن
دامن رفو ہوا تو گریباں نکل گیا

ڈھونڈھتا ہے رخ جاناں کو مرا دل کیا کیا
داغ دیتا ہے فروغ مہ کامل کیا کیا

کسی کے غم نے رلایا مگر امانت کو
کہ آج گھر سے چشم پر آب نکلا ہے

جو غرق ہوا پھر نہ لگا اس کا ٹھکانا
ساحل کا پتہ عشق کے دریا میں نہیں ہے

کہدو ظالم سے کہ عاشق کو گوارا ہے ستم
میرے ہوتے نہ کسی اور پہ بیداد کیجے

جس نے نظارہ کیا اصل علی یاد آیا
تیرے حصہ میں صنم حسن خداداد آیا

بن میں جو آیا وہ رشک بہار
تو رنگ رخ گل ہوا ہو گیا

مرا وصال صنم کا اٹھا بیٹھا پھر گیا
ذرا جو ہجر ہے وہ دل لگا بیٹھا پھر گیا

رخ جاناں پہ نظر کرکے بندھا گل کا خیال
قد کو دیکھا تو مجھے سرو چمن یاد آیا

زمزمہ کس کی زباں پہ بدل شاد آیا
منہ نہ کھولا تھا کہ پر باندھنے صیاد آیا

ہو گیا قطع اسیری میں امید پرواز
اڑ گئے ہوش جو پر باندھنے صیاد آیا

چھپ جائے محتسب کی جو شمع حیا تگل
میخانہ میں چراغ جلاؤں شراب کا

شعلہ ہے یا شرر ہے چھلاوہ ہے یار کا
بجلی چمک گئی وہ جدھر سے نکلے

دل حشر بپا کرتا ہے سر پٹکے کیا کیا
جو ٹھیر کی صدا ہے قیامت کی گھڑی ہے

بھلا قفس میں پہ صیاد آشنائے سراج
کہ عندلیب کو پانی کی جا گلاب دیا

فصل گل آئی چمن میں کہ قیامت آئی
عندلیبوں نے اٹھایا ہے گلستاں سر پر

دم خفا ہوتا ہے کیا کیا قفس ہوتی ہیں
دیکھیں اس قید سے کس روز رہا ہوتے ہیں

ہجر میں دل پہ آ کے ہوتا ہے وہ غم کا دریا
شب کو نالے مرے سوتوں کو جگا دیتے ہیں

رنگ جتنا ہمیں لالے کا پھرائے غیرت گل
ہوا چمن میں جو تیرے منہ قبا ہوتے ہیں

وطن آواروں کی آنکھوں میں بھر آئے آنسو
میرے کسی پاس نہ تھا وقت سفر کی

سید مظفر علی اسیر

تعارف:۔ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۲ء میں انتقال ہوا مصحفی کے شاگرد تھے مگر ۲۴ برس کا سن تھا کہ مصحفی کا انتقال ہو گیا اس عمر میں انہوں نے کیا حاصل کیا ہوگا۔ ان کے کلام میں جو پختگی ہے وہ ان کی ذاتی صلاحیت کا نتیجہ ہے ان کا کلام ناسخ سے متاثر ہے۔

نبض بیمار جو اے رشک مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

مسجد سے نکل کر ہیں رہ بیت کدہ کھولا
تقدیر نے ہمری مجھے رکھا نہ کہیں کا

اٹھتا نہیں منظور ہے پہلو سے ہمارے
حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تپش دل

ہیں اور زیست بھر میں قدرت خدا کی ہے
انسان کے اختیار میں ہی اجل نہیں

باقی رہی ہے ترک تمنا کی آرزو
کیونکر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

وہ نہ آیا تھا اگر موت ہی آتی شب ہجر
اے فلک کوئی تو امید بر آئی ہوتی

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہ ناز ہے دنیا
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

دیکھئے اسیل مکان پھر نہ ملے کھلا لیا
قدم آگے نہ بڑھا ٹھہرا ویرانے سے

وہ صنم تو ہے کہ نکلا جو کبھی جانب دیر
بت نکل آئے تماشے کو صنم خانے سے

نہ بیاں ہے نہ وہاں پوچھنے والا کوئی
کون ہشیار ہے بڑھکر ترے دیوانے سے

شباب تھا کہ الٰہی نسیم کا جھونکا
کہ دفعتاً ادھر آیا ادھر روانہ ہوا

سن کے باتیں اس کی پردے سے مجھے غش آگیا
شعلہ آواز برق لن ترانی ہو گیا

کچھ تو الفت کی ترے کوچے میں بو آتی ہے
گرد اٹھ کر مرے دامن سے لپٹ جاتی ہے

لوٹ جائے نہ دریا نہ کہیں تو یہ رے
موجیں اٹھتی ہیں طبیعت مری لہراتی ہے

نیند آئی کے وقت عزیزوں کو صحبت کبھی
ہو چکی ختم کہانی ہمیں نیند آتی ہے

ہر خاکسار صاحب توقیر ہو گیا ! — پارہ ہوا جو خاک تو اکسیر ہو گیا
سیر چمن نہ کی تھی کہ نخچیر ہو گیا — نکلے جو بال و پر ہدف تیر ہو گیا
حیرت ہوئی یہ اس کے نظارے سے خلق کو — عالم تمام عالم تصویر ہو گیا
رہا ہے یاد ابرو میں مجھے شغل فغاں برسوں — وہ مومن ہوں کہ سجدے کی ہیں کعبے میں اذاں برسوں
صبا واقف ہوئیں کب یہ پتے پتے بوٹے بوٹے سے — ہمارا بھی رہا ہے اس چمن میں آشیاں برسوں
مرا عشق جوانی کا کوئی جاتا ہے پیری میں — جو زخم اچھا کبھی ہوتا ہے تو رہتا ہے نشاں برسوں
نہ کعبہ کا نہ ہم سے دیر کا ہے حال پوشیدہ — یہاں ہم نے بھی عمر کاٹی ہے یہاں برسوں
تدبیر جب کوئی نہ چلی وصل یار کی — انجام کار قائل تقدیر ہو گیا
کی یار نے جو غیر کی جانب نگاہ لطف — اپنے جگر سے پار میاں تیر ہو گیا
قاصد لکھے کا تو تھا اس کو ہمارے پاس — چار آنکھیں ہوتے ہی نامہ بدل کر رہ گیا
کیسے کیسے گل خزاں کے جور سے مرجھا گئے — پتہ پتہ اس چمن کا ہاتھ مل کر رہ گیا
نہ کیوں کر اپنی تنہا ہو طبیعت نفس امارہ — لباس دوستاں جو نہ تھا مشکل ہوا [illegible]
اللہ رے شوق خط بھی نہ ہم نے کیا تمام — قاصد کمر کو باندھ کے تیار ہو گیا
الٹے وطن سے شوق ملاقات رہ گیا — موت آئی جب قریب ہوا وطن رہا
ہوں کہ شوق سے کعبے چلا ہے تجھے — یہی جو بچ ہے تو حال اللہ ہی کیا ہو گا
گھڑی گھڑی کی خبر ہم کو دل کو ملتی تھی — جو خط کا وہ نہ لکھیں گے جواب کیا ہو گا
شب وصلت لگا کو تاب کے دل کو سخت ایذا — یہ بڑھ جاتی جو روز ہجر کچھ کو تباہ ہو جاتا
گھٹا تھا بدر کو ہر ماہ میں ہلال گیا — تمہارے چاند سے چہرے نے بھی کمال کیا
گدا ہوئے تو گدائے در کرم ہو گئے — کیا سوال تو اللہ سے سوال کیا
سجدے بھی وحشت دربان نے کرنے نہ دیے — لے چلے داغ ترے در سے جبیں سائی کا
ہوں وہ عاشق مجھے سوز غم وقت ہے پسند — دل ہے پروانہ چراغ شب تنہائی کا

دل مضطر کہیں عاشق کا ٹھہر سکتا ہے — ماہی نام ہے بس صبر و شکیبائی کا
واہ رے دور فلک خانہ احسان آباد — چرخ کج تاب سر مخمور کو انگڑائی کا
کب ملی فرصت تڑپنے کی ترے بیمار کو — کچھ کمی درد جگر نے کی تو درد دل اٹھا
جب تک جیے جہاں میں مر مر کے ہم جیے — جس خوبرو پہ آنکھ پڑی دم نکل گیا
وصل معشوق میں پھر ہستی عاشق کیسی — قطرہ کل جائے گا دریا میں تو دریا ہو گا
بتکدے کی میں سیر کو آیا ! — واں خدا ہی خدا نظر آیا
ہوں وہ بسمل کہ ہوں میں عاشق درد — دل گھبرا گیا جو کوئی زخم جگر بھر گیا
ذرا سی بات میں ہوتے ہیں اپنے بیگانے — بڑا کمال کسی کو ہے اپنا کر لینا
گردش بخت زبوں جور فلک رنجش یار — درد لاکھوں ہیں کس کس کا مداوا کرتا
مطلب اب بے طلب ہو جائے گا — جب خدا چاہے گا سب ہو جائے گا
تو جو خورشید ہے تو میں شبنم — میں کہاں جب ترا ظہور ہوا
طائر بے بال و پر ہوں کیسی پرواز چمن — نام ہے بے تابی دل شوخی پرواز کا
بخشا مجھے خالق نے فرشتوں سے یہ کہہ کر — جرم اس نے کیے ہیں مجھے غفار سمجھ کر
مرتبہ حسن کا تکلیف میں گھٹتا ہے کہیں — خوشنما لگتی وہ زلفیں ہیں پریشانی پر
روشن اسی سے محفل آفاق ہے تمام — رکھتا ہے مثل شمع جو سوز و گداز عشق
مزاج وہ نہ رہا وصل یار کے نزدیک — جنوں ہوا جو دوا ہے بہار کے نزدیک
ابھی ہے اتنی محبت کہ راہ چلتے ہیں — ٹھہر ٹھہر کے ہمارے مزار کے نزدیک
فرقت میں شوق وصل تو وصلت میں خوف ہجر — راحت فراق میں ہے نہ ہم کو وصال میں
تمام سال ہوا دشوار ترک مے ہے امیر — ہر ایک ماہ کو گھول کر رہے قیام کریں
گلو ایسے کہتے ہیں گل نام ہے کس کا — صیاد بہار آئی تو کھلی آنکھ قفس میں
پوچھا جب کسی نے نہیں دور قسمت — دوزخ بھی تمہی ہاتھ ہے جنت کی [illegible]

نظر آتا ہے ترا چہرۂ زیبا کس کو
حسن بے پردہ ہے پرتاب تماشا کس کو

ہو نہیں بیمار محبت مگر اتنا نہیں ہوش
درد کیا چیز ہے کہتے ہیں مداوا کس کو

وہ دل ہی کیا کہ جو ہو داغ عشق سے خالی
اسیر خانہ دشمن بھی بے چراغ نہ ہو

حال دل قابلِ تماشا ہے !
تم جو دیکھو تماشا ہو

عشاق اور تاب تماشائے روئے یار
چمکی جو برق طور غش آیا کلیم کو

کہتی ہے قیامت میں یہ وحشت دل مجھے
دوزخ میں چلو جب تک آراستہ جنت ہو

چھپتی نہیں ہے اس سے کبھی پیار کی نگاہ
پہچانتا ہے طالب دیدار کی نگاہ

حسن کے طالب نہیں رکھتے تمیز کفر و دیں
ایک پروانہ کو شمع کعبہ و میخانہ ہے

دیکھی ہے وقت زیب جو اپنی سی اور شکل
آئینہ کی طرف نظر اشتیاق ہے

کعبہ چلتا ہوں پر اتنا تو بتا
میکدہ ہے کوئی زاہد واں نہیں

بک رہا ہے تو منہ بیٹھا ہو خموش
تجھ کو اے ناصح ہے یا سودا مجھے

موجود ہم ہیں خاک میں ملنے کو اے اجل
لیکن یہ شرط ہے کہ وہاں آسماں نہ ہو

ثابت اپنا نہ ہوا خون کسی پر دم حشر
ناز نے غمزے پہ غمزے نے ادا پر رکھا

بیٹھے ہیں جا کے پہلو قاضی میں تیرے مست
مسجد کے پاس میکدہ تعمیر ہو گیا

پھولتا پھلتا مرا نخلِ تمنا کس طرح
بچ رہا بجلی سے تو پانی جبل کر رہ گیا

پیام مرگ تماشائے روئے یار ہوا
چمک کے برق چراغ سر مزار ہوا

تھوڑی سی عمر اور سو یاد مجھے عطا
رہ جائے آسماں کو نہ بیداد کی ہوس

محشر میں کریں گے دعوئے عفو
تحریر خط جبیں سند ہے

جوانی دی اگر تو نے تو یہ بھی اے خدا ہیں
شباب اتنا ہو جائے کہ دل کا حوصلہ نکلے

دھوم محشر میں ہوئی جب کہ یہی آمرِ عشق
بے گنہ مل گئے مجھ چھپ چھپ کے گنہگاروں میں

بے ہوش میں آیا تھا گیا دہر سے بے ہوش
آنے کی خبر ہے کو نہ جانے کی خبر ہے !

لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا دور

اس دور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آتش کے تلامذہ کا سلسلہ ختم ہو گیا جس کی وجہ یہ ہے کہ خود آتش عروض و قافیہ سے گہری واقفیت نہیں رکھتے زبان کے بارے میں بھی کچھ ایسے ہی تھے اس وجہ سے ان کا کلام مستند نہیں سمجھا جاتا تھا مگر طرز پسندیدہ تھا۔

ان کے شاگرد بھی ایسے ہی تھے جو عروض و قافیہ سے ربط نہیں رکھتے تھے سوائے نواب سید محمد خان رند کے اور اس زمانہ میں شاعری کے لئے عروض و قافیہ میں مہارت ضروری سمجھی جاتی تھی اس وجہ سے پڑھے لکھے لوگوں نے ناسخ کے سلسلہ کو اختیار کیا جس میں کا ہر ایک عروض و قافیہ معانی بیان اور تحقیق زبان میں مسلّم تھا۔

آتش زبان اور حسن بیان میں ناسخ سے متاثر تھے مگر اپنا رنگ الگ بھی رکھتے تھے۔ اس دور کے شعراء آتش سے بھی متاثر تھے اس وجہ سے لکھنؤ کی شاعری کا دوسرا دور ناسخ و آتش کے رنگ کا گہرا امتزاج ہے۔

یہ خیال ہو سکتا ہے کہ اسیر کی وجہ سے مصحفی کا سلسلہ قائم رہا مگر یہ صحیح نہیں اول تو خود مصحفی ناسخ سے متاثر تھے دوسرے اسیر نے کے دن مصحفی سے فیض حاصل کیا اس لئے مصحفی کا سلسلہ بھی ناسخ ہی کا سلسلہ سمجھنا چاہیئے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مصحفی کا خود کوئی رنگ نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری کہیں کی بھی ہو ناسخ سے متاثر ہے اور اب تک انھیں کی تقلید پاکیزگی کلام کی ضمانت ہے۔

سیّد مرزا تعشق

تعارف:- سید محمد مرزا اُنس شاگرد ناسخ کے بیٹے میر عشق کے چھوٹے بھائی اور شاگرد ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۰۹ھ میں انتقال ہوا۔

شعلۂ حسن سے تھا دود دل اپنا اول
آگ دنیا میں تو آئی تھی کہ سوزاں ہم تھے

برق رہ رہ کے چمکتی ہے تو میں کہتا ہوں
ہو غنیمت اگر اتنا بھی مرا دل ٹھہرے

دل حزیں پہ خدا جانے کیا بلا آئی
عجیب درد سے روتا ہے کوئے دلبر میں

وہ چشم مست ہے ایسی خمار آلودہ
بھری ہو جیسے لبالب شراب ساغر میں

دوستو میں نگہ ناز کے روزن دل میں
ورنہ برچھی سے ہیں زخمی نہ کسی تیر سے ہم

وہ تڑپنا دیکھتا ہے کس طرح بسمل ہو سرد
رشتۂ نظارۂ قاتل رگ جاں ہو گیا

خوشا دل منعکس ہے جس میں صورت عرش اعظم کی
مرے گھر سے فضا معلوم ہوتی ہے ترے گھر کی

پڑھا جو نزع میں قرآں رہی نہ چشم مری
زباں بند ہوئی سن کے گفتگو تیری

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا
کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری

یہ اتفاق کبھی دنیا میں کم سنا ہوگا
ہمارے ساتھ ہوئی دفن آرزو تیری

مری لحد کو نہیں احتیاج چادر گل
دماغ جاں میں ابھی تک بسی ہے بو تیری

یہ کس نے وعدہ کیا ہے تعشق آنے کا
ہر ایک وقت جو آنکھیں ہیں چار سو تیری

عشق کی وہ شورشیں وہ ولولے جاتا رہا
اک جوانی کیا گئی سب حوصلہ جاتا رہا

خاک ہو کر شمع و پروانہ ہوئے آپس میں ایک
عشق کامل کے سبب سے فاصلہ جاتا رہا

حال تغیر کیا زلف کے سودائی کا
اب خدا منہ نہ دکھائے شب تنہائی کا

یوں تو حرف غلط تقدیر نہیں مٹنے کا
آپ کے در پہ ارادہ ہے جبیں سائی کا

دل پرداغ کا کیا حال کہیں ہم تم سے
پھول دیکھا ہے کہیں لالۂ صحرائی کا

دل جو مر جائے ہمارا تو کرے کون انیس
سو گیا جاگنے والا شب تنہائی کا

خموشی ہو گئی طوق گلو آج
کسی کی یاد آئی گفتگو آج

سر محفل بھر آئے ہوتے آنسو
گئی ہوتی ہماری آبرو آج

ہوا ترک محبت پہ نہ راضی
رہی تا دیر دل سے گفتگو آج

یہ ہیں نالوں سے کتنی تنگ ہجر یار میں روح
کہ بعد مرگ نہ آئی مرے مزار میں آج

ہم اس چمن میں وہ بلبل ہیں حسب الفت
وداع تن سے ہوئی رخصت بہار میں روح

قدم قدم پہ جنازہ نہ کیوں ٹھہر جائے
کہ میرے جسم سے نکلی ہے انتظار میں روح

ہے اختصار مجھے دوستو تڑپنے دو
اسی طرح سے نکلتی ہے انتظار میں روح

نہ ترک ہوتی ہے الفت تری نہ مرتا ہوں
نہ اختیار میں دل ہے نہ اختیار میں روح

حیات کا ہے تعشق بھلا بھروسہ کیا
ہوا حباب میں ہے یا ہے جسم زار میں روح

ہر طرف شور ہے جھنکار ہے زنجیروں کی
ان کی زلفوں کے گرفتار چلے آتے ہیں

پڑ گئی کیا نگہ مست تری اے ساقی
لڑکھڑاتے ہوئے میخوار چلے آتے ہیں

کبھی نہ ہوش میں ہم اے خیال یار آئے
کسی کے در پہ گئے جب اسے پکار آئے

ہماری خاک پڑی ہے تمہارے کوچہ میں
ذرا نسیم سے کہہ دو نہ بار بار آئے

ہمارے بعد یہ ہے حال ہمسفروں کا
اس آشیاں میں صدا دی اسے پکار آئے

میں باغ میں ہوں طالب دیدار کسی کا
گل پہ ہے نظر دھیان ہے رخسار کسی کا

گر پڑے آنسو عروج ماہ کامل دیکھ کر
میری نظروں میں ترا عہد جوانی پھر گیا

دل ہے مردہ خلد میں جانے سے کیا ہو جائے گا
ہم جہاں ہوں گے وہ گھر ماتم سرا ہو جائے گا

تجربہ ہے جراحت دل نازک مزاج کا
موقوف ہے حضور کے تار نگاہ پر

تلاش شب وصل میں پھر رہا ہوں
مرا آپ دیوانہ پن دیکھیے حسین

یاد غم دل سے کبھی جاتی نہیں
اب تو بھولے سے ہنسی آتی نہیں

کچھ خبر ملتی نہیں دل کی مجھے
آج نالوں کی صدا آتی نہیں

نہیں تسکیں ہوتی ایک جا پر کوئے جاناں میں — سحر سے شام تک ہم سو جگہ بستر لگاتے ہیں
عجب اندھیر کر رکھا ہے آج ان کی نگاہوں نے — جو کل کہتے تھے سرمہ آنکھ میں کیونکر لگاتے ہیں
دوستوں کو ملے ہیں وہ مرے اعضا جو بیچے ہیں — دل بیتاب کا دیکھوں پتہ کیونکر لگاتے ہیں

یہ باغ گیا جہاں میں راحت کہیں نہیں — دل مضطرب ہے اس کا ٹھکانا کہیں نہیں
میں زاہدوں کے سامنے ہو لوں نمازِ قبل الصلوٰۃ — کس سے کہوں کہ لائق سجدہ جبیں نہیں
مشقِ تصورِ دلِ صد پارہ دیکھیے — اتنے حسیں ایک جگہ پر کہیں نہیں

بھرے ہیں آنکھوں میں آنسو دامن بھیگا ہو — یہ کس غریب کی تربت کے پاس بیٹھے ہو

طوقِ منت کے گلے میں تھے وہ دن یاد کرو — ہم تیرا اس عہد میں بھی چاک گریباں سمجھے

منہ جو فرقت میں زرد رہتا ہے — کچھ کلیجے میں درد رہتا ہے

نجد سے جانب لیلیٰ جو ہوا آتی ہے — دل مجنوں کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
ہم کو مل جاتی ہے اپنے دل وحشی کی خبر — ٹوٹتا ہے کوئی ٹانکا تو صدا آتی ہے

یاد آیا میکہ تھا زور و شبہ جذب حسن و عشق — وہ میرے دل کا تڑپنا بے قراری آپ کی

لیجیے روح بھی تڑپنے لگی — دل تو مدت سے اضطراب میں ہے

بیٹھے بیٹھے اپنے دل کی غیر حالت ہو گئی — دوستو جلدی خبر لینا قیامت ہو گئی
اب اگر تخفیف ہوتی ہے تو گھبراتا ہوں میں — دردِ دل اتنے دنوں سے تھا کہ عادت ہو گئی
کرتے کرتے آہیں روتے روتے آخر مر گیا — آج مجھ کو آپ کے کاموں سے فرصت ہو گئی

پوچھتے کیا ہو شبِ فرقت کی بیداری کا حال — آنکھ کیونکر بند ہوتی ہے یہ حسرت لے گئے

جب اسیرانِ گذشتہ کی حکایت یاد کی — رات بھر بیٹھا رہا نیند اڑ گئی صیاد کی
باغ کے حسن گذشتہ کا اسیروں سے ہے ذکر — یا الٰہی بند ہو جائے زباں صیاد کی
دیر تک روئی خوشی حسرت سے مجھ کو دیکھ کر — جب بنا ڈالی گئی میرے دلِ ناشاد کی
وحشیوں میں آمدِ فصلِ بہاری کی ہے دھوم — بیڑیاں آواز دیتی ہیں مبارکباد کی

دم نکلنا کوئے جاناں سے نکلنا یاد ہے — ہم یہ دو باتیں نہ بھولے عالم ایجاد کی

ہم خونِ آرزو کا جو محضر بنائیں گے — تجھ کو گواہ لے دل مضطر بنائیں گے
خلخال ان کے پاؤں بھی زرگر بنائیں گے — طوق گلوئے فتنۂ محشر بنائیں گے
افتادہ رہنے دی تھی زمیں دل کی اس لیے — امید تھی کہ آپ یہاں گھر بنائیں گے
بنتی ہے روز زلف مشوش کے سامنے — دیوانہ آپ اس کو مقرر بنائیں گے

کسی سے دشت نوردی کی وجہ کیا کہیے — شکایت دل خانہ خراب ہوتی ہے
نہ گھر میں اور نہ آتا ہے اس گلی میں قرار — عجیب مشکل دم اضطراب ہوتی ہے
ایسی دلدوز حسینوں کی پلک ہوتی ہے — سانس لینے سے کلیجے میں کھٹک ہوتی ہے
ہے یہ نزدیک قدم رنجہ کرے فصل بہار — سر آمادہ سودا میں دھمک ہوتی ہے

بجھ رہے ہیں چراغِ دل تربت میں جانے کے لیے — روشنی کم ہو رہی ہے نیند آنے کے لیے

گیا شباب مگر رہ گیا تعلقِ عشق — دل و جگر میں چمک گاہ گاہ ہوتی ہے

عدم سے دہر میں آنا کسے گوارا تھا — کشاں کشاں مجھے لائی ہے آرزو تیری
یہ اتفاق کبھی دنیا میں کم سنا ہوگا — ہمارے ساتھ ہوئی دفن آرزو تیری
طبیعت سے یہ کہتا ہوں جنوں کی فصل آپہنچی — کئی دن سے رگِ جاں میں کھٹک ہوتی ہے نشتر کی

بے وفائی آپ کی غفلت شعاری آپ کی — میرے دل نے عادتیں سیکھیں ہیں ساری آپ کی

یادِ رخ دیدۂ پر آب میں ہے — بوئے گل جامۂ حباب میں ہے
پاؤں آہستہ سے رکھ لے غافل — دیکھ تو کون کون خواب میں ہے
ہاں اترتا ہے داغ سے سایا — تھرتھری جسمِ آفتاب میں ہے

جب جھلا کے باغباں نے مجھے ذبح تو کیا — اب رو رہا ہے منہ کو قفس پر دھر دھر کے
سمجھا دلِ وحشی جو قیامت ہوئی برپا — اٹھا کوئی دیوانہ رفتار کسی کا
دیکھ آؤ کہ بیمار تمہارا تو نہیں ہے — رکھا ہے جنازہ پسِ دیوار کسی کا

حکیم ضامن علی جلال

تعارف:- ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے ۱۹۰۹ء میں انتقال ہوا آبائی پیشہ طبابت اور داستان گوئی تھا شاعری میں نام پیدا کیا۔ رشک و برق کے شاگرد تھے۔ انداز بیان کی ندرت میں ان کا جواب نہیں۔ ساری عمر تحقیق زبان میں صرف کی۔

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا   ملا وہ غمکدہ جس کو چراغ بھی نہ ملا

ہم اور جاتے نہ پیرِ مغاں کی صحبت میں   بہت اچھالنے والے تھے اک شباب نہ تھا

کسی نے دیے تسلی نہیں قیامت کی   کہ آج ہے جو تڑپ کل یہ اضطراب نہ تھا

تغافل کے گلے سن کر چھپا لیں ہم نے کیوں آنکھیں   میرے شرمندہ کرنے کو ذرا بے باک ہونا تھا

تڑپ دل کی دکھانا تھا جلال ان شوخ چشموں کو   وہیں کی بخت نے سستی جہاں چالاک ہونا تھا

کہا ان سے کہیے قصۂ شبِ تنہائی کا !   شمع خاموش کو یارا نہیں گویائی کا

تو یا رب ہم خدا سے کریں بھی تو کیا کریں !   مارے ہوئے تغافلِ جورِ بتاں کے ہیں

آنسو نکلے تو کیا نہیں چھپنے کا رازِ عشق   حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

عشقِ بتاں کا جرم نہ بخشا خدا نے بھی !   ان کا گناہگار گناہگار ہی رہا

الٰہی دل کے لیے راحت نہیں اس سے بڑھ کر   جس کو سمجھا ہے وہ بے درد دکھا دل

میری قبر کے فرشتے یہ نہ پوچھیں کیوں ہو چکے   کہ جواب ہی نہ سنتے جو بجا سوال ہوتا

نجات مل گئی ناصح سے عمر بھر کے لیے !   اسی کو بھیجدیا یار کی خبر کے لیے

لچک کے زلفیں جو آپڑی ہیں کمر کسی کی لچک رہی ہے   بلا کی آئی ہیں دو گھٹائیں غضب کی بجلی چمک رہی ہے

مجھے مرنے کے بجائے اتنی بخدا خوشی نہ ہوتی   مرے مرنے کا ذرا بھی جو تمہیں ملال ہوتا

دل کسی کے عشق میں اچھا ہوا جاتا رہا   داغ تھا اک مٹ گیا اک درد تھا جاتا رہا

دل ہمارا اور یوں ہو جائے ہم سے منحرف   آج اس کج ادائی کا گلا جاتا رہا

دل ہو وہ چشم مست ہو دورِ شراب ہو   کوئی خراب ہو تو بلا سے خراب ہو

تم تسلی میں نہ کرنا اپنی جانب سے کمی   گو تڑپ اس سے مرے دل کو سوا ہونے لگے

بند ہو کر جلوہ گاہِ یار میں آنکھیں کھلیں   ہوش جاتے ہی حواس اپنے بجا ہونے لگے

اکیلے کا کہیں دو سرکشوں سے زور چلتا ہے   دوپٹہ لاکھ سینہ پر سنبھالو کب سنبھلتا ہے

ہم بھی قدر اپنی وفا کی نہیں کھونے والے   او جفا کر کے پشیماں بھی نہ ہونے والے

دے چکا ساتھ ہمارا شبِ تنہائی میں   بے مروت ہے یہ دل میں کا [illegible]

بن سنور لیجئے تو دیکھیں گے وہ انداز اپنے   تو لے آئینہ حیراں ابھی کیا کیا ہے

یاد ہے اتنا وہ آئے کر کہیں کہ جانا   اور وہ پوچھنا گھبرا کے کسی کا کیا ہے

جھک کے شرمائی نگاہیں کبھی اٹھتیں تو سہی   آپ کو کیا جو زمانہ تہ و بالا ہوتا

غیر کے سامنے ہنستے نہ مرے رونے پر   ہم نے گرتی ہوئی بجلی کو سنبھالا ہوتا

یاس نے ساری امیدوں کو مٹایا دل کی   ورنہ اس گھر میں بہت کچھ سر و ساماں ہوتا

بیٹھو نا وہیں دور سے آنکھ ملاؤ تو سہی   یوں جفا کر کے نہیں کوئی پشیماں ہوتا

دیتا جو تسلی وہ ہمیں اور تڑپتے   اس شوخ کو بیتاب بھی کرنا نہیں آتا

شبِ فراق تڑپ کر ہمیں تو گذری تھی   سنا ہے تم نے بھی آرام رات بھر نہ کیا

کلیجہ کوئی تھام کر رہ گیا ہے   ادھر جانے والے ادھر دیکھ لینا

گذرتی ہے شب اپنی تیرے منتظر کی   ادھر دیکھ لینا ادھر دیکھ لینا

کبھی اس نے جو کہا او مرے مرنے والے   ہو گیا اور بھی جینا ہمیں دو بھر اپنا

آنکھ ملتے ہی یہاں قابو نہ جس دل پر رہا   آپ کے بس میں نہیں معلوم وہ کیونکر رہا

کہتی ہے تڑپ ضبطِ فغاں ہو نہیں سکتا   اب عذرِ نہاں مجھ سے نہاں ہو نہیں سکتا

بت جنگجو کیوں عشق میں ہم سے بت کے نہ پوچھو   اس چپ کا سبب ہم سے بیاں ہو نہیں سکتا

بتوں کے عشق میں انجام کار کیا ہوگا   مآل کے مرے پروردگار کیا ہوگا

تمہارے غم عاشق کامل نہیں ہوتا
تم دل کی جگہ ہوتے ہو جب دل نہیں ہوتا

دیکھتے دیکھتے وہ میں تڑپتا تھا
قابلِ دید یہ تماشا تھا

سن کے نام اس کا دل کو تھام لیا
نامہ بر سچ بتا کہ یہ کیا تھا

کیا دکھے دل کو پھر دکھاؤ گے
تم نے کس دن مزاج پوچھا تھا

وہ آبدیدہ جو سن کر مرا افسانہ ہوا
مجھے بھی اشک بہانے کا اک بہانہ ہوا

دلِ ناکام کو ہم کھو کے بہت پچھتائے
کام اس سے بھی نکل جاتے تھے بیکار نہ تھا

عشق میں دل جو مرا ہمدم و ہمراز بھی تھا
وہی کم بخت تو رسوا کنِ غماز بھی تھا

یوں مری رات تری منتظری میں گزری
چشم بر راہ بھی تھا گوش بر آواز بھی تھا

اگر عشق میں سب ان کی ہشیاری کی باتیں تھیں
مگر قسمت میں تھا دیوانہ ہی مشہور ہو جانا

وفا مانع ہے ذکر اس کی جفا کا ہو نہیں سکتا
شکایت کا محل ہے اور شکوہ ہو نہیں سکتا

قضا کہتی ہے زندہ کشتہ اس کا ہو نہیں سکتا
ادا کہتی ہے کیا قاتل مسیحا ہو نہیں سکتا

جانے کیا بے اختیاری ہے جلال
دل مرے بس میں نہ تھا لو یار پر

کیا لطف دے رہا ہے بگڑنا عتاب میں
لاکھوں بناؤ ہیں تمہارے اک پیچ و تاب میں

کیوں آکے دے گئے وہ تسلی ستم کیا
اب تو بہت کمی تھی مرے اضطراب میں

جفا کر کے وہ کیوں پچھتا رہے ہیں
وفاداری سے خود شرما رہے ہیں

غضب کا سامنا ہے حشر میں بھی
نقاب الٹی نہیں شرما رہے ہیں

خدا سمجھے جلال ان ناصحو سے
نہیں معلوم کیا سمجھا رہے ہیں!

مجنوں کے غل نہ شور وہ اب کوہکن کے ہیں
ڈنکے بجے ہوئے مرے دیوانہ پن کے ہیں

چلا ہوں لے کے میں فریاد ان کی وہ میری
اب اس میں دیکھیے پہلے سنے خدا کس کی

نظر فریب اداؤں پہ آ ہی جاتا ہے
ہزار روکتے سنتا ہے دل بھلا کس کی

تڑپ میں ہے جو مزہ وہ سکونِ دل میں کہاں
ہم اپنے درد کی خود ہی دوا نہیں کرتے

اثر کچھ ان کے دل میں کر گئی آہ و فغاں میری
کہ خود وہ چھیڑ کر سنتے ہیں مجھ سے داستاں میری

زاہد تو ہے دیوانہ حور کا وہ کیا جانے
عالم کو ترا سودا اے رشکِ پری کیوں ہے

منہ سے کچھ حشر میں بھی کہہ نہ سکوں
بت بنا دے خدا اگر کوئی

اس صنم کو جو ہم خدا سمجھے
لوگ کیا جانے ہم کو کیا سمجھے

کسی بے درد کی دل آزاری!
درد کی اپنے ہم دوا سمجھے

کٹ گئی پاؤں کی بیڑی جو پہن لی زنجیر
ہوشیاری کوئی سیکھے ترے دیوانے سے

شغل ہیں لیتے یہ صبح و شام کے
چند آہیں کھینچنا دل تھام کے

اٹھ کے اس محفل سے اٹھتا ہے وہ درد
بیٹھ جاتا ہوں کلیجہ تھام کے

اپنی بگڑی ہوئی تقدیر کے ہم شاکی ہیں
کیوں بگڑتے ہیں کیا شکوہ تمہارا کس نے

مذہبِ عشق ازل ہی سے نہیں آیا ہے پسند
وہ کوئی اور ہیں حضرت انساں ہوں گے

دم بھرے جائیں گے اس سفاک کا
جائے اس میں یا ہمارا دم رہے

کچھ زیادہ ہو چلا شوقِ وصال
زندگی کے دن بہت اب کم رہے

سجدہ کوئی قبول ہمارا ہو یا نہ ہو
لیکن جبیں ہو اپنی ترا آستانہ ہو

ابھار دیتی ہے اس کی جفا کو میری دعا
غرض کہ نوبتِ ترکِ جفا نہیں آتی

بتوں کو دیکھ ہماری نگاہ سے اے شیخ
نظر ان آنکھوں کو شانِ خدا نہیں آتی

جلوہ کسی کا دیکھ کے آنکھیں سی کھل گئیں
پردے جو غفلتوں کے پڑے تھے الٹ گئے

چٹکیاں لیتی ہیں مرے لیتے ہو چپکے چپکے
اور پھر دل میں شکایت مری فریاد کی ہے

چھپا لاکھ رازِ عشق افشا ہو ہی جاتا ہے
اگر چپ بھی رہے عاشق تو رسوا ہو ہی جاتا ہے

نہ ہو برہم جو بوسہ بے اجازت لے لیا ہم نے
چلو جانے دو بیتابی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے

رہے گی رحمتِ حق دور زاہد تم سے
گناہ ہے یہ تمہارا کہ بے گناہ رہے

خدا سے کہتے ہیں بت بھی کہ رحم کر اس پر
نہ ہوگا عاشقوں میں ہم سا کوئی مضطر بھی

کہیں سمجھے ہیں دیوانے یہ ہر عاقل سمجھتا ہے
جو سمجھاتا ہے ناصح کب ہمارا دل سمجھتا ہے

سنگِ در اس کا ہے پیشانی میری
پھر رہے ہیں میری نظروں میں وہ جب

بعد ترکِ عشق کے کیسی پشیمانی ہوئی
توفیق انھیں رنج ہی دینے کی خدا دے

اک مسیحا سے جو اُلفت ہو گئی!
اٹھکھیلیوں کے ساتھ ہے مستانہ ادا بھی

آفت تھی کسی کی نگہِ ہوش ربا بھی
جلالؔ آنکھ کہتی ہے ہشیار رہنا

اٹھ گئیں تھیں کہیں اس شوخ کی نیچی نظریں
ہم نہ کہتے تھے کہ تم اس کو نہ دینا تسکین

دل کو کب تک دردِ دل تڑپائیگا
ہوشِ رفتہ دیکھیے جب آئیگا

سمجھے تھے کہ فرقت میں مر جائیں گے ہم جلدی
حسرت جو مری دیکھی حیران سے ہیں وہ بھی

وہ ترچھی نگاہوں سے محفل میں ادھر دیکھیں
گذرتی ہے محبت میں جو ہم پر

تم لگا دو آگ ٹھوکر ناز سے
خود پکار اٹھا جو دل میں راز ہے

مہرباں کو دیجیے دل نامہرباں دیکھا کئے
اللہ رے عاشق کی زخود رفتگیٔ شوق

محبت میں کسے سمجھائیے کب دل سمجھتا ہے
نہ یہ ناداں سمجھتا ہے نہ وہ جاہل سمجھتا ہے

اب نہ سر پھوڑوں تو نادانی مری
پھر کوئی دیکھے پریشانی مری

عقل کا کہنا کیا ہم سے یہ نادانی ہوئی
خوش جس میں ہوں وہ ہم کو گوارا ہے خوشی سے

بے اجل مرنے کی عادت ہو گئی
پامال کئے دیتی ہے دل لغزشِ پا بھی

یوں ہوش اڑ گئے ہیں کہ نہیں جن کا پتا بھی
نقاب اٹھتی ہے سامنا ہے کسی کا

دیکھ لیتے ہم نے دو عالم تہ و بالا دیکھا
اور دل نے تپش دل کو اچھالا دیکھا

صبر ہی انجام کار آ جائے گا
تیرے بے خود کو کدھر لے جائیگا

اس میں تو قیامت کی تاخیر نظر آئی
تصویر کے پہلو میں تصویر نظر آئی

سیدھی ہیں کچھ اپنی تقدیر نظر آئی
وہ حالت دوسرا کیا جانے کیا ہے

کون اٹھے حشر کی آواز سے
تو بھی خاموشی بڑی غماز ہے

جو دکھایا تو نے ہم اے آسماں دیکھا کئے
یوں ہے تری محفل میں کہ محفل میں نہیں ہے

نجم الدین علی عرف علی میاں کاملؔ

تعارف:- مولانا احمد علی صاحب مجتہد کے بیٹے ہیں۔ ولادت معلوم نہیں غدر میں جوان تھے ۱۹۰۶ء میں انتقال ہوا۔ مشرقی علوم میں صاحب استعداد ممتاز! علامہ سید محمد تقی صاحب کے شاگرد۔ شاعری میں ہر صنف پہ قادر تھے ان کے کمال کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا انھوں نے امیر مینائی۔ جلالؔ، ماہرؔ اور منیرؔ سے غزلوں میں مقابلہ کیا اور مرثیہ میں میر نفیس کے مد مقابل ہے اور برابر کی ٹکر لی! اپنا کلام خود کبھی نہیں پڑھا لوگوں کو کہہ کے دیدیا۔

دولت کے معاملہ میں بھی یہی حال تھا لاکھوں ملے اور دو دن میں خالی کر دیئے ان کی پہلی شادی حکیم باقر حسین کی صاحبزادی سے ہوئی جو شاہی اطباء میں تھے اور دولت کے لحاظ سے لاکھوں کے پیٹے میں تھے ایک ہی لڑکی تھی جو ان کی وارث ہوئی محبوب گنج میں ایک شاندار حویلی اور باغ تھا سب کاملؔ صاحب کی داد و دہش کی نذر ہو گیا اور فاقوں کی نوبت آ گئی تو نواب سردار بہادر اور نواب نادر صاحب نے تنخواہ مقرر کر دی جو آخر دم تک بسر اوقات کا ذریعہ رہی ان کے بے شمار شاگرد لکھنؤ میں تھے باہر کے شاگردوں میں میر مصحف حسین رئیس مصطفیٰ آباد ضلع پرتاب گڈھ اور رستم علیخاں رئیس دھولپور (جوشؔ صاحب کے نانا) تھے۔

مولانا صفیؔ کو ان کی سوتیلی بہن بیاہی تھیں جو ان کے والد کی تیسری بیوی سے تھیں اب ان کا کلام سنئے۔

نہاں ہونے پہ تیرا نور ہر شے سے نمایاں ہے
جو تو اے شاہدِ معنی عیاں ہوتا تو کیا ہوتا

یہ کرشمے دیکھتے ہر وقت کا یہ ناز نہ تھا
آپ کی آنکھوں کا آگے تو یہ انداز نہ تھا

جا کے دیکھ آئیے مرقع میں شبیہ یوسف
ہم جس انداز کے خواہاں تھے وہ انداز نہ تھا

ہم نے مانا کہ قیامت کی تڑپ تیری تھی
آپ کے جلوہ جاناں کا انداز نہ تھا

جاکے دیکھا تو عجب دامن کا گوشہ تھا مرا
غم نہ تھا عیش نہ تھا سوز نہ تھا ساز نہ تھا

شرم کے پردے میں اب کرنے لگیں کام اپنا
آگے ان نیچی نگاہوں کا یہ انداز نہ تھا

میں نہ مانوں گا کہیں میرے جلانے کو رقیب
برق کے جلوہ میں اس شوخ کا انداز نہ تھا

جان پہ آ تو بنی جاتی ہے کچھ اے کامل
آگے افسردگی دل کا یہ انداز نہ تھا

صنعت عشوۂ جاناں نہ بھی تھا ناز بھی تھا
سحر بھی آنکھ میں اس شوخ کی اعجاز بھی تھا

ایک خنجر ہی نہیں قتل کا میرے مجرم
ذبح کرنے میں شریک آپ کا انداز بھی تھا

قید سے ہو کے رہا مرغ چمن کیا کرتا
دل کے ہمراہ شکستہ پر پرواز بھی تھا

یکساں ہے ہم شکستہ دلوں کو حیات و موت
شادی نہ زیست کی ہے نہ غم انتقال کا

پوشیدہ راز ہائے جوانی نہ رہ سکے
پیری نے حال کھول دیا بال بال کا !!

کہنے میں آپ آ گئے لوگوں کے اے کلیم
کوئی محل نہ تھا ارنی کے سوال کا

اب رہائی کی تمنا نہ کر اے مرغ قفس
سوئے گلشن تو اگر بے بال و پر آیا تو کیا

ناوک مژگاں سلامت اس ستمگر کا رہے
زخم اے کامل ہمارے دل کا بھر آیا تو کیا

نیند میں ان کی مژہ کھلتی کبھی ہوتی تھی بند
مرتعش کے ہاتھ میں جام شراب ناز تھا

بام پر گل جو نکا یک وہ پری زاد آیا
شیخ کو شیخ برہمن کو خدا یاد آیا

گل و بلبل کے مقدر پہ ہنسی آتی ہے
باغباں جانے نہ پایا تھا کہ صیاد آیا

کام سیکھا بھی تو وہ جس سے کلیجہ ہو لہو
دل کو آیا بھی تو کیا شیوہ فریاد آیا

دیکھ کر گلشن فردوس میں حوروں کا جمال
یاد اے ست دو ترا حسن خداداد آیا

اب مجھے ضبط فغاں کی نہیں طاقت باقی
کیوں قفس لے کے مرا باغ میں صیاد آیا

حسین کا عشق کہ سودا کہ زلف یار نہ تھا
ازل میں کیا دل غمدیدہ داغدار نہ تھا

جگر کو خون کیا تھا سحر کے دھڑکوں نے
شب وصال میں بھی قلب کو قرار نہ تھا

فغاں کو ضبط کیا پر تھمے نہ ہجر میں اشک
کہ دل پہ زور تھا آنکھوں پہ اختیار نہ تھا

مآل آمد فصل بہار کیا ہوگا
کسے خبر ہے کہ انجام کار کیا ہوگا

شب فراق میں ہے شام ہی سے نزع کا حال
سحر جو ہوگی تو پروردگار کیا ہوگا

خوش ہوں بے ساقی کے ہم رندوں نے اتمام کیا
مے نہ ہو تو شیشہ کیا سبو کیا جام کیا

جب ہوا میں تلاطم درد کا ہونے لگے
کوئی یہ بارش نہیں اس کے لئے ہنگام

عیش و عشرت اہل دولت کو مبارک روز و شب
ہم سے بختوں کے لئے کامل سحر کیا شام کیا

ابتدائے عشق ہے اس پر نہیں دل کو قرار
دیکھئے ہوتا ہے اس آغاز کا انجام کیا

بادشاہوں کو مبارک تخت و فر اور سلطنت
مرد مفلس ہوں مجھے طبل و علم سے کام کیا

کیوں دعا ہوتی نہیں یا رب ہماری مستجاب
عرش سے بھی مرتفع ہے ان ہوں کا بام کیا

بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے
غربت میں جب دیار وطن یاد آ گیا

نفس امارہ نے کیا سخت اذیت دی مجھے
ساتھ ہو سایہ کے مانند یہ رہزن کیا

فنا ہو روح تو آزاد ہوں عناصر بھی
ورق بھی قید میں شیرازہ کتاب کے ساتھ

تجھے منعم نہیں معلوم رتبہ خاکساری کا
یہ وہ مٹی ہے جو روشن گر آئینہ دل ہے

ہمارا ہوش میں آنا نہ آنا ایک ہے کامل
کہ ہم ہیں دل کے بس میں اور وہ دیوانہ [illegible]

حکم سجدہ کا ہوا اس کو خدائے پاک کا
اور آگے کیا کہوں کیا ہے یہ پتلا خاک کا

سمجھ میں زردی رخسار سے آ جاتا
بیان غم نہیں محتاج ترجمانوں کا

اے دل بتوں کے تیر نظر سے خدا بچائے
چھوٹا کماں سے اور کلیجہ کے پار تھا

ہوس میں نسخہ اکسیر کا یہ جزو اعظم ہے
غبار راہ پیدا کر جہاں میں اہل ہمت کا

کتاب ہستی دل میں کہیں تو یاد آتا ہے
دیا تھا ایک نقطہ ہم نے صحرائے قیامت کا

اپنا ہی اگر حسن دل آرا نہیں دیکھا
اس شوخ نے قدرت کا تماشا نہیں دیکھا

دل پاک کدورت سے کسی کا نہیں دیکھا
اس آئینہ کو ہم نے مصفیٰ نہیں دیکھا

عبرت کے سوا کوئی تماشا نہیں دیکھا
کچھ ہم نے بجز گنبد مینا نہیں دیکھا

کھلتا نہیں کس کرب میں ہے آج دل زار
یوں سینہ میں اس کو تہ و بالا نہیں دیکھا

دیا تھا جو لطف و مرحمت سے آپ نے آج تازیانہ آگہی
خدا میں بندہ میں لے فرشتو حساب کیا کتاب

کبھی وہ آئے تھے ایک شب کو تو فرقت جدائی کا آج تک ہے
لگی نہ پھر آنکھ زندگی بھر ہم نے دیکھا تھا کیسا خواب

غور کر دل کی حقیقت میں خدا مل جائیگا
دیکھ آئینہ کو جوہر کا پتہ مل جائے گا

پیری میں بھی سینے کی جلن داغ عشق کی
دن کو بھی یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

چشم مردم میں کھٹکنے کے سوا صورت خار
فائدہ کوئی مجھے نشو و نما سے نہ ہوا

خدا کسی کی محبت کا داغ دل کو نہ دے
یہ زخم وہ ہے کہ جو مندمل نہیں ہوتا

نمود حسن میں اے جان اگر شک ہے ابھی ہم کو
تجھے کا کرا نہ کر دیکھو آئینہ چاک گریباں کا

سرکشی پھر تو فرشتوں سے بھی انساں کرتا
سجدہ اس خاک کے پتلے کو جو شیطاں کرتا

یار کے حسن سے آنکھوں نے کیا سیر ہمیں
کام اس مائدہ پر سے لب و دنداں نکلا

ہوش میں آئے جو موسیٰ تو یہ پوچھے کوئی
ابتو اللہ کے دیدار کا ارماں نکلا!

مٹ گئے بات سے تمہاری ہم
شکر ہے نقش بند امکاں کا

عاشقوں کے دلوں کا نام نہ لو
ذکر کیا خانہ ہائے ویراں کا

غم دوست ہے اس قید سے آزاد نہ ہوگا
ہم خوش بھی کریں دل کو تو یہ شاد نہ ہوگا

کفر و اسلام کے یارب ہیں یہ جھگڑے کیسے
ایک ہی رشتہ اگر سبحہ و زنار میں ہے

شام ہی سے نہ گلا گھونٹ مرا اے شب ہجر
صبح تک دیکھ تو لینے دے کہ ہوتا کیا ہے

قفس کی قید سے آزادی مرغ!
نہ ہو جب قوت پرواز پہ سیر

نہیں سرمہ کا چشم یار میں خط
کمند ناز ہے دست نظر میں

چشم رحمت سے نظر کر ذرۂ خاک پہ
ہمت عالی سے پیدا کر دماغ آفتاب

الامکاں تھک کے آخر کو پھرے گا شام تک
طائر اندیشہ پہنچے گا نہ اس کے بام تک

پاؤں پر میں نے جو شوق ذبح میں سر رکھ دیا
مسکرا کر ہاتھ سے قاتل نے خنجر رکھ دیا

یاد پینے میں جو آئی نرگس مخمور یار
ہاتھ سے میں نے گلگوں کا ساغر رکھ دیا

کم نہیں طاعت میں ہے ذرہ تیرے دیکھنا
کون گزرا تھا ابھی اس رہگذر سے دیکھنا

قصہ فراق یار کا دوستو ایک رات میں
ہم نے سنا تو کیا سنا میں نے کہا تو کیا کہا

محتاج عشوہ کب ہیں جوانی میں خوشجمال
دل خود بخود بہار میں کھنچتے ہیں سوئے گل

بلبل کی طرح کیا ہے کہ ہوتا ہیں نالہ کش
دیتا اگر خدا دل بے آرزوئے گل!

داغ الفت سے جلے جاتے ہیں میرے استخواں
دل کے پہلو میں اپنی کس نے اخگر رکھ دیا

بہتر نہ تشنگی دل آ کے جو دیکھی یار نے
چاک سے زخم تمنا کے پرافشاں نکلا

فغاں کو ضبط کیا پر نہ تھم سکے اشک
کہ دل پہ زور تھا آنکھوں پہ اختیار نہ تھا

رات کچھ ایسی ادا سے وہ پریزاد آیا
دیکھنے والوں کو محفل میں خدا یاد آیا

خاموش نہ کیوں ذکر جوانی میں رہیں ہم
آنکھوں نے ہماری یہ تماشا نہیں دیکھا

منشی اسمٰعیل حسین منیر

تعارف:- منشی احمد حسین شاد کے بیٹے شکوہ آباد کے رہنے والے سنہ ۱۲۳۶ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ابتدائے عمر میں لکھنؤ چلے آئے وہیں نشو ونما پائی اور اس پر ان کو ناز تھا وہ خود کہتے ہیں ؎

سنبھالا ہوش جا کر لکھنؤ میں ہوا گلچیں ریاض گفتگو میں

لکھنؤ سے اپنے انس کی یہ کیفیت بیان کرتے ہیں ؎

لکھنؤ کا مجھ کو سودا ہے منیر دل حسین آباد کا پروانہ ہے!

اس شیفتگی کی وجہ بھی انہوں بتائی ہے۔

تا دام لکھنؤ رہے آباد اے منیر مجمع ہے اس دیار میں اہل کمال کا

یہ شیفتگی اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کے شاعرانہ کمال تک پہنچنے میں لکھنؤ کو بڑا دخل ہے ؎

منیر اس شہر میں اوج کمال نظم تک پہنچا الٰہی لکھنؤ بھی عرش ہے مضمون عالی کا

منیر اگر باہر ہوتے تھے جب بھی لکھنؤ کا ذکر کرتے رہتے تھے اور اس سے ان کی طبیعت میں جولانی آجاتی تھی ؎

آ گئی پھر شعر گوئی پر طبیعت اے منیر لکھنؤ کا ذکر رخش فکر کا کوڑا ہوا

شاعری میں رشک کے شاگرد تھے ۵ رمضان سنہ ۱۲۹۷ھ کو ہیضہ میں انتقال ہوا مادہ تاریخ "منیر عالی قدر ہے۔"

ؔلہ اس زمانہ میں حسین آباد سے رومی دروازے آصف الدولہ کی مسجد کی پشت گول دروازے فرنگی محل چوک اور یاٹا نالہ تک شہر کا سب سے زیادہ بارونق حصہ تھا۔

بخت خفتہ کا ٹھکانا کوئے جاناں میں نہ تھا
خواب غفلت کا محذر چشم نگہباں میں نہ تھا

تھے سب ہی دنیا میں مشتاق عروسان بہشت
اس کے سر سہرا رہا جو فکر سلطان میں نہ تھا

ہو گئے مجوب تم کو دیکھ کر خوبان دہر
کون سا سر تھا جو آغوش گریباں میں نہ تھا

ہر گھڑی کے ریخ سے اک بار تو ملتی نجات
زہر بھی میرے لئے تلخی دوران میں نہ تھا

راہ و رسم خانۂ زنجیر کس سے پوچھتے
کوئی اگلے وقت کا دیوانہ زنداں میں نہ تھا

بحر غم میں طالب راحت کی مٹی تھی خراب
ننگ کشتی تھا جو تختہ عین طوفاں میں نہ تھا

کہئے کس پتھر سے جا کر کعبہ میں سر پھوڑتے
ایک بت بھی قبلہ ارباب ایماں میں نہ تھا

کعبہ کے سامنے دل خانہ خراب تھا
یہ مجھ پہ بڑا حضور خدا کا جواب تھا

کھولی جو چشم دل تو بدن نقش آب تھا
جب تک کہ آنکھ بند رہی میں حباب تھا

دنیا کو دیں سے جس نے نکالا کھڑے کھڑے
یادش بخیر وہ دل خانہ خراب تھا

لو پوش فور دنار تھے ان کے شباب میں
بادل میں چاند زیر زمیں آفتاب تھا

جب خاک میں شباب ملا ہوش آ گئے
ہم چونک اٹھے تو زیر زمیں آفتاب تھا

افسانۂ شباب خدارا نہ پوچھئے!
دیکھا ہے جاگتے ہیں جسے یہ وہ خواب تھا

کیا کہتے مفلسی کی جوانی میں دعوتیں
مہماں اجڑے گھر میں ہمارا شباب تھا

بل تھا بھوؤں میں سامنے جاتا میں کس طرح
تلوار کھینچے ہر پہ اول عتاب تھا

کم مایہ کے بھی حصہ میں تھا فیض عام دوست
شبنم کے قطرہ قطرہ میں اک آفتاب کا

اس انجمن میں کوئی دل شاد ماں نہ تھا
بستی اجڑ گئی گھر کی رات سواد بیابانہ تھا

جنس شباب کا یہ کبھی قدرداں نہ تھا
گردوں کی سا سے پشت مری کب جواں نہ تھا

تعظیم بیخودی کی بدولت نہ دے سکا
صاحب معاف کیجئے بندہ یہاں نہ تھا

جن روز دل تک نہ پہنچی تھی انگلیا حضور
واقف جناب عشق سے اب تک زباں نہ تھا

پھرتے ہیں ہزاروں پوچھتے ہیں آنکھوں کے کیا ہوئی
جب تک تمہیں نہ دیکھیں رنج انکا بیاں نہ تھا

میکدہ میں جو ہیں غمدیدہ و مضطر آیا
چشم ساغر ہوئی تر دیدۂ دل بھر آیا

نیند کو راہ میری آنکھوں کی معلوم نہ تھی
اے خدا خواب اجل ہجر میں کیوں کر آیا

شش جہت میں تری رحمت سے الٰہی معمور
کونسی راہ سے گردش میں مقدر آیا

ساقیا گریۂ بے ساختہ کی کیا تقصیر
چشم نمناک ابل آئی جو دل بھر آیا

سن کے شہرہ تری رفتار کا آگے نہ بڑھا
جب دبے پاؤں کہیں فتنۂ محشر آیا

آجاتی قیامت کبھی تو فریاد نہ کرتے
نا محرموں کے آگے ترا نام نہ لیتے

کرتی جو مہ مصر کی تعریف زلیخا
تصویر دکھا دیتے ترا نام نہ لیتے

کب سے دل بچھڑے ہوئے پھرتے ہیں مشتاق لحد
پردۂ ساز میں پوشیدہ صدا کس کی ہے

خود بخود دامن دلدار کدھر کھینچتا ہے
ہاتھ پھیلائے ہوئے آج دعا کس کی ہے

یہی انصاف ہے اے فصل بہاری تیرا
جال میں مرغ چمن باغ میں صیاد رہے

بادشاہ ہیں نہ ہوں محبوب نہ درویش ہیں
یا الٰہی تری دنیا ہیں کیا یاد رہے

کوئی دے حشر میں کس طرح حساب دنیا
برسوں کے خواب کی روئیداد کسے یاد رہے

پنہاں نہیں ہے کوئی جگہ تجھ سے اے صنم
روپوش ہو کے بندۂ عاصی کدھر چھپے

حیرت سے سب نگوں ہیں اشاروں کی انگلیاں
ہم شش جہت میں چھپتے الٰہی کدھر چھپے

نام اس شوخ کا سن کر یہ ملک کہتے ہیں
یہ ستمگر دیکھیے کیونکر گل آدم ہی سے ہے

بال بکھرائے ہوئے آتے سوئے مقتل ہیں
اللہ کے نیک ہیں نہ بلائیں کہیں مرنے والے

اے گنہ گار کاتب اعمال اور ٹھہر
افسانہ بڑھ گیا ہے بہت میرے دل کا

بگڑی ہوئی ہے صاف حسینوں کی بناوٹ
اللہ رے عالم کہ ہے بے ساختہ پن کا

آئینہ میں عکس کا بھی اب پتہ ملتا نہیں
آشنا کیسا کہ صورت آشنا ملتا نہیں

آئینہ کو اس پری کا عکس اڑا کر لے گیا
جب سے وہ دل میں ہے دل کا پتا ملتا نہیں

کیا جانئے کیا لطف ہے عالم کے اوپر آج
جاتی ہے آنکھ پھر کر نہیں آتی ہے نظر

دنیا سے ہے باہر دل دیوانہ کسی کا
بستی میں سماتا نہیں ویرانہ کسی کا

ناحق دل نافہم ہے دیوانہ کسی کا
ہم سے بھی تھا یونہی یارانہ کسی کا

ساقی نگہ مست تری لوٹتی ہے دل سے
کیوں چور نہ ہو نشہ میں پیمانہ کسی کا

پڑ گیا جیسے تری شوخیوں کا پرچھاواں
کبھی مچلا کبھی بیٹھا دل بیتاب اپنا

نشہ جو عین جوانی سے ہیں بد مست حسین
غیر کی آنکھوں میں ہم دیکھتے ہیں خواب اپنا

ساری خرابیاں رہیں غربت میں اپنے ساتھ
پھر کس طرح خراب ہمارا وطن ہوا !

جس دل میں تیرے وصل کا ارماں رہ گیا
حسرت کا دین یاس کا ارمان رہ گیا

ہمصورتی کے رشک سے دیکھا نہ آئینہ
ان کو کبھی اپنی دید کا ارماں رہ گیا

پوچھا گیا یہ حشر میں تصویر جان کر
اچھا رہا جو عشق میں حیران رہ گیا

ابروے یار دیکھ کے اب بھولنا محال
بالائے طاق آج سے نسیاں رہ گیا

طائر جان ہو سوئے گلشن ایجاد آیا
بے نوائی کے لئے دوڑ کے صیاد آیا

شاخ گل صحبت مرغان چمن فصل بہار
ہائے کس وقت مری تاک میں صیاد آیا

بتوں کے قدر آسکت بہ عشق ہے ناصح
یہ بیچارہ سیدھا مسلمان نکلا !!

دلفریبی کی ادائیں ابھی آجاتی ہیں
سامنا چاہئے پر چشم تماشائی کا

تھا وہ کعبہ ہی جو قبضہ میں بتوں کے آیا
پاؤں رکھے تو دل دوست میں دشمن تیرا

قبر شہید چھوڑ کے سہرے میں جو گندھا
وہ پھول چشم عشق میں سنگ چمن ہوا

کعبہ تک یارب پہنچ سکتا نہیں ترا خیال
ان بتوں نے طاق نسیاں پر اگر رکھ دیا

شوق ایماں سے دل دنیا طلب کو کیا غرض
کیوں نجس شیشہ میں بھر کر آب کوثر رکھ دیا

جب کہا میں نے نقاب اٹھو خدا کے واسطے
آئینہ اس شوخ نے مجھ کو دکھا کر رکھ دیا

فائز کا دعوی مسلم پر یہ سوچو تو سہی
حسن نے قرآن و عالم کس کے اوپر رکھ دیا

رہنے دے خواب عدم انکھوں لے شور حشر
یادگار ایک یہ ہے عالم تنہائی کا

لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا رنگ

محمد جعفر امید

ناسخ کے بعد غزل میں اصلاحی تحریک محمد جعفر صاحب امید نے پیش کی وہ معشوق مجازی اس کے حسن ظاہری اور سامان آرائش کا ذکر نہیں کرتے تھے محبوب کو حالت اطلاق میں رکھتے تھے اس کا مرد یا عورت ہونا ظاہر نہیں ہوتا تھا لفظ یار کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ شراب کباب کا ذکر زاہد و ناصح پر پھبتیاں حضرت خضر کی عمر یوسف کے حسن موسیٰ کے طلب دید کا مذاق اڑانا یا اس کی تحقیق کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔[1]

یہ تحریک ان کی زندگی تک تو باقی رہی ان کے کچھ شاگردوں نے بھی ان کی تقلید کی مگر ان کے بعد مر گئی اور اس کو مرنا بھی چاہیے تھا اس سے غزل کی ساری دلکشی ختم ہو جاتی۔

---

[1] مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل کے لئے یہی اصلاحیں تجویز کی ہیں مگر کہیں امید صاحب کا ذکر نہیں کیا جو کھلا ہوا سرقہ ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ یہ توارد ہے سرقہ نہیں ہے مگر یہ صحیح نہیں مولانا حالی جس زمانہ کے آدمی ہیں اس زمانہ میں دہلی اور لکھنؤ کو زبان کا مرکز سمجھا جاتا تھا عام طور پر لوگ لکھنؤ کی اصلاحیں جاننے کے خواہشمند رہتے تھے اسی ضرورت سے خورشید صاحب نے افادات لکھی تھی جس میں امید کا ذکر بھی ہے سنہ ۱۸۹۰ء میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی خورشید صاحب لکھنؤ کے مسلم اساتذہ میں تھے دور دور ان کی شہرت تھی شاد ان بلگرامی وغیرہ ان کے شاگرد تھے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ مولانا حالی ان سے بے خبر ہوں خاص طور پر ان کی کتاب سے جس کا موضوع فن شاعری اور لکھنؤ کے اس وقت کی زبان و شاعری میں اصلاحیں ہیں۔

امید صاحب مولانا سید محمد باقر شریف الملک منصف الدولہ (متوفی سنہ ۱۲۵۸ھ) کے بیٹے اور سلطان العلماء سید محمد مجتہد العصر متوفی سنہ ۱۲۸۴ھ کے پوتے سنہ ۱۲۴۵ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۲۹۳ھ میں انتقال ہوا۔ [illegible] معالی خاں میں مکان اور امام باڑہ تھا وہیں سکونت تھی۔

غدر کے بعد انگریزوں نے سلطان العلماء کی دو ہزار روپیہ ماہوار پولیٹیکل پنشن پشت در پشت کے لیے مقرر کی تھی مگر ان کی اولادیں بہت تھیں اور اکثر ان کے ساتھ مر گئی تھیں بہت سے پوتے پوتیاں نواسے نواسیاں محجوب ہو گئیں ان کے لیے گورنمنٹ نے جیبن حیاتی پنشن مقرر کی تھی امید صاحب بھی انھیں میں سے تھے جن کو سو روپیہ ماہوار جیبن حیاتی پنشن ملتی تھی وہی ذریعہ معاش تھا۔

تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ دبلے پتلے متوسط قد کے آدمی تھے چوگوشیہ ٹوپی اور انگرکھا پہنتے تھے جو اس زمانے کے شرفاء کی وضع تھی۔

اولاد میں صرف ایک بیٹے محمد کاظم عرف بندہ کاظم جاوید (اپنے زمانہ کے مشہور شاعر) تھے دو مرثیے اور ایک دیوان یادگار چھوڑا مرثیے عام طور پر لکھنؤ میں سنے تھے دیوان جاوید صاحب کے پاس تھا ان کے بعد ان کے بھتیجے مجاور حسین صاحب تمنا کے ہاتھ لگا وہ اسے چھپائے رکھنے اور کسی کو نہ دکھانے میں اس کی حفاظت سمجھتے تھے بڑی مشکل سے چند غزلیں مجھے دی تھیں یہ ان کی بڑی عنایت میرے حال پر تھی اب ان کے انتقال کے بعد اس کا کیا حشر ہوا نہیں معلوم۔

امید صاحب کی اہمیت کا جب مجھے علم ہوا تو ان کے حالات معلوم کرنے کی فکر ہوئی مگر کوئی بتانے والا نہ ملا۔

خمخانہ جاوید اور آب بقا میں ان کا ذکر ہے مگر کوئی کارآمد بات نہیں۔

شاد عظیم آبادی نے ذکر شعراء میں ان کی نفاست و پاکیزگی ذوق

یہ واقعہ لکھا ہے کہ میر انیس کے ایک بند میں تار بار قافیہ اور "پہ دوڑے" ردیف نظم ہو گئی جس مجلس میں انھوں نے وہ مرثیہ پڑھا اس میں امید صاحب بھی شریک تھے جب انھوں نے وہ بند پڑھا جس کے دو مصرعے ہیں ؎

اس طرح ارگ ابر گہربار پہ دوڑے   جس طرح سے بجلی کی صدا تار پہ دوڑے

امید صاحب نے کہا واہ کیا ردیف ہے تعریف نہیں ہو سکتی برسوں اس کے چرچے رہے۔

مشہور ہے کہ انھوں نے بجلی کی صدا اور اس کے تار پر دوڑنے کو بھی غلط کہا تھا۔

میر انیس نے ردیف کے بھونڈے پن پر تو خاموشی اختیار کر لی مگر بجلی کی آواز اور اس کا تار پر دوڑنا کسی اور مجلس میں ثابت کیا۔

افادات مصنف مولانا سید محمد مصطفےٰ صاحب خورشید (متوفی سنہ ۱۳۱۸ھ) سے معلوم ہوا کہ علم قیافہ میں بڑی مہارت بہم پہنچائی تھی نہایت شگفتہ مزاج تھے بچوں میں بچے اور بوڑھوں میں بوڑھے جس محفل میں بیٹھ جاتے تھے اپنی شگفتہ بیانی سے لوگوں کو متوجہ کر لیتے تھے لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے پرانے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ مسالمہ کے موجد وہی تھے

شاعری میں نواب عاشور علی خاں تلمیذ ناسخ کے شاگرد تھے جو نواب صاحب سعادت علی خاں کے پوتے صاحب علم اور مقدس آدمی تھے اپنے دور کے مسلم اساتذہ میں شمار تھا بڑے بڑے نامی شاعر شاگرد تھے جان صاحب ریختی گو اور چرکین مزاحیہ گو بھی شاگرد تھے اور ہر ایک کو اس کے رنگ میں اصلاح دیتے تھے مگر خود صرف نعت و منقبت کہتے تھے ان کا سارا کلام مفقود ہو گیا صرف ایک منقبت تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے

قلمی نسخہ میں ملتا ہے جس سے ان کی استادی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اب امید صاحب مرحوم کا کلام ملاحظہ فرمایئے ؎

کیا ہے لن ترانی نے قوی دعوئ بصیرت کا   وہی بینا ہے جو قائل ہوا ہے نفی رویت کا
جو آتا ہے تصور وسعت دامان رحمت کا   نسیم لطف پردہ کھول دیتی ہے عدالت کا
بڑھے تھے جو حجاب قدس رحمت سے بھی آگے کچھ   نہ ان پر بھی کھلا پردہ تری کنہ حقیقت کا

کچھ رفتگان ملک عدم کا نشاں ملا   ذروں سے خاک کے جو کوئی استخواں ملا
پہلے قلم اسی کو کیا باغبان نے   جس شاخ پر چمن میں ہمیں آشیاں ملا

امن انساں شماتت سے کہاں گھٹتے ہیں   دھر میں آتے ہی نام اہل جہاں لکھتے ہیں
ساتھ آہوں کے جو آنسو بھی ٹپک جائیں گے   شعلے اور آہوں کے پانی سے بھڑک جائیں گے
پختہ کاروں کے مضامیں نہ رہیں گے محفوظ   وہ ثمر نخل سے ٹوٹیں گے جو پک جائیں گے
عہد پیری میں بھی سرگشتہ ہوس رکھے گی   سر کو ہو گی حرکت پاؤں جو تھک جائیں گے
بار عصیاں سے ہمیں جادہ میں سبکی ہو گی   جو اٹھائیں گے جنازہ تو وہ تھک جائیں گے

روشنی داغ دل بزم دل مضطر میں ہے   یا چراغ طور کا جلوہ خدا کے گھر میں ہے
ملتا نہیں پتہ در و دیوار و سقف کا   تصویر لامکاں کی ہمارے مکاں میں ہے

با حشم راہ رو ملک عدم رہتے ہیں   دوش احباب پہ چلنے میں قدم رہتے ہیں
منتظر ہم سفروں کے یہیں بیٹھے جانے سے   اشک اس واسطے رخسار پہ تھم رہتے ہیں

شاکی ہے عبث رزق جو گردوں نہیں دیتا   کوئی تجھے تقدیر سے افزوں نہیں دیتا
جھک گئے ملنے کو ترقی میں نہ چھوڑا   دیکھ اس رفعت پہ گردوں خم رہا

سودا ازل سے عشق حقیقی کا سر میں ہے   جس جا نظر کا کام نہیں وہ نظر میں ہے
امراض دنیوی سے نجات اپنی ہے محال   داخل دوا کی فکر بھی جب درد سر میں ہے
رکتا نہیں ہے توسن عمر رواں کبھی   گھر میں بھی بیٹھنا مرا داخل سفر میں ہے

نالۂ درد ہو تعریف کے قابل میرا
ناوک آہ میں کھنچ لے اگر دل میرا

ہر قدم اٹھتی ہے تعظیم کو جب چلتا ہوں
پاس کرتی ہے یہ گرد رہ منزل میرا

جو مقدر کا ہے دیدے مجھے بے منت غیر
حصۂ غیر میں حصہ نہ ہو شامل میرا

بیٹھتا اٹھتا میری طرح رواں ہے یہ بھی
ساتھ دیتا ہے غبار رہ منزل میرا

سانس چلتی نہیں یہ عمر رواں جاتی ہے
ہے ہر اک تار نفس جادۂ منزل میرا

وہ موحد ہوں کہ شرکت سے ہے تنفر مجھے
رنگ ہوگا نہ کسی رنگ میں شامل میرا

عیش دنیا کے مزے ساتھ جوانی کے گئے
اب تو امید ہے وہ میں ہوں نہ وہ دل میرا

[illegible] دوش صبا پر نہ اعتبار رہا
ہوا نہ خاک کبھی تو آسماں پہ قادر رہا

گدا جہاں کے نہ کس طرح شاہ کہلائیں
بنے جو فقر کی دولت پہ افتخار رہا

ہوا بندگی جو ہماری سیاہ کاری کی
کبھی چراغ نہ روشن سر مزار رہا

نظر گئی سوئے صانع ہر ایک صنعت سے
ہزار پردوں میں نور اس کا آشکار رہا

جب آیا سامنے محشر میں نامۂ اعمال
امید تم سے کرم کا امیدوار رہا

چشم نے آنسو کا عقدہ وا کیا
تھا جو اک قطرہ اسے دریا کیا

آنکھ دی تو نے تو نظارہ کیا
تیری آنکھوں سے تجھے دیکھا کیا

اہل مسند خاک میں آخر ملے
دولت دنیا پہ کیوں تکیہ کیا

خامشی سے بڑھ گئی مشق سخن
چپکے رہنے نے مجھے گویا کیا

مے ہے مہمان کی رسائی دیکھیے
دل میں آکر غم نے گھر پیدا کیا

ظالموں سے خلق کو پہنچا نہ فیض
خون ابر تیغ سے برسا کیا

نام سید صاحب سے میری اٹھا
انقلاب دہر نے یہ کیا کیا

اٹھے عصا بھی نہیں اتنے بار کے قابل
عصائے آہ ہے اس جسم زار کے قابل

گھٹا دیئے میرے تھوڑے قمر نے گھٹ گھٹ کے
کمال بھی نہ رہا اعتبار کے قابل

بس فنا اثر ضعف مرے کام آیا
زمیں رہی نہ لحد کی فشار کے قابل

بس فنا دل احباب صاف ہیں مجھ سے
میں خاک ہو کے نہیں ہوں غبار کے قابل

گئے گزرے سے ہاتھ کے ہم رزق پا نہیں سکتے
خط جبیں سے خط اپنا ملا نہیں سکتے

مکان اوج نہ کیوں گر ہو خاکساروں کا
زمیں سے نقش قدم کو اٹھا نہیں سکتے

ہے نعمتوں کی حلاوت بند کر دیئے لب
زباں پہ شکر کے کلمے کبھی لا نہیں سکتے

روا ہو دل شکنی کیا ہمارے مذہب میں
خدا کے گھر کو مسلماں ڈھا نہیں سکتے

وہ دوست خاک ہماری لحد پہ بیٹھے ہیں
جو فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا نہیں سکتے

تمھیں چلو تو چلو دوستوں کے پاس امید
گئے جو ملک عدم کو وہ آ نہیں سکتے

شوق یہ سیر عدم کا کم نہیں
وہ چلے جاتے ہیں جن میں دم نہیں

ہر گل خنداں گریباں چاک ہے
واہ رونے سے یہ ہنسنا کم نہیں

ٹوٹتے دیکھا ہے لاکھوں ہی کو دم
کچھ نفس کا تار مستحکم نہیں

فکر ... کس لئے تم ہے اے امید
پاؤں پھیلانے کو تربت کم نہیں

گوارا اپنا نقصان ہو تو نفع غیر ہے
جہاں میں زخم نے گھٹ گھٹ کر [illegible]

سحر کو پھول ہنستے ہیں شبنم شب کو روتی ہے
چمن کا رنگ بھی تصویر ہے نیرنگ عالم کا

دور سے دیکھنے والے جسے سمجھے غبار
شاہانہ وہ سر گور غریباں نکلا

شاگردانِ اسیر

مہدی حسین ماہر

تعارف :- خاندان اجتہاد کے رکن رکین شہر کے بڑے روساء میں تھے بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے عربی گھوڑوں سے اصطبل بھرا تھا چار گھوڑوں کی گاڑی پر نکلتے تھے مشاعرے اور مجلسیں بڑی دھوم سے کرتے تھے ان کے تکلفات مشہور رہے ہیں سنہ ولادت معلوم نہیں ۱۳۴۰ھ میں انتقال ہوا شاعری میں اسیر کے شاگرد تھے خلاق معانی کہے جاتے تھے۔ مولوی علی میاں کامل کا دعویٰ ہے کہ ؎

سرزمین ہند میں ابتک نہیں پیدا ہوا
آپ کا ایسا بلیغ نکتہ دان نازک خیال

چاہیے صاحب رشید کا قول مشہور ہے کہ ان کے ایسے شعر کوئی کہہ نہیں سکتا۔ مرزا محمد ہادی صاحب عزیز نے لکھا ہے کہ ان کا مرتبہ انہیں سے کم نہیں ان کا خاص رنگ یہ ہے ؎

رگوں سے سرخی مے تشنہ شراب آیا
طنابیں کھنچ گئیں گرد دیدۂ آفتاب آیا

مگر میں تسبیح کا ہوں دانہ جو اس کو کھونا تو اس کو پانا
ہزار پھیرتا رہے زمانہ فراق دیکھا نہ ہمنشیں کا

آوارگی کے لطف کو سوزن سے پوچھیے
لاکھوں بنائے گھر مگر اک میں مکیں نہیں

زباں سے کام کم لے گر بقائے دم کا خواہاں ہے
کہ عمر رشتہ گھٹتی جاتی ہے رفتار سوزن میں

حیرت مجھے روانی عمر بشر میں ہے
لنگر پڑا ہوا ہے سفینہ سفر میں ہے

کریں کس وقت کار دین و دنیا اہل عالم
نہیں ملتی ہے فرصت سانس لینے سے کوئی دم بھی

تاثیر ضعف عالم پیری میں دیکھنا
سایہ بھی بے عصا نہ چلا ہم جہاں چلے

اس طرح کے اشعار کے علاوہ ایسے شعر بھی بہت ہیں جیسے آجکل پسند کیے جاتے ہیں ؎

اے شوق تو ہی بتا ہے کوئی منزل ایسی
داغ پہلے کا بانگ درا سے نہ جدا

خاک آگاہ شکست دل نازک سے وہ ہوں
آشنا ٹوٹ کے شیشہ یہ صدا سے نہ ہوا

کیوں نہ تڑپائیں مجھے سوز الم میں آہیں
کون شعلہ ہے جو بیتاب ہوا سے نہ ہوا

ہوں وہ بے خود ہنس کے شیشہ کو ٹکتے دیکھا
جان کر اپنا دل نازک میں نالاں ہو گیا

تھی یہ صورت تو اثر کا میں گلہ کیا کرتا
ہاتھ مطلب سے اٹھاتا تو دعا کیا کرتا

وہیں ہم زباں عجب ہو رہا ہے کچھ بیاں میرا
چمن میں جسطرف اجڑا پڑا ہے آشیاں میرا

نہ دیکھیں کو دیکھنے والے بھی اے زہے جلوہ
کھلے یہ حسن کہ آخر حجاب ہو جائے

ملتے ہیں ہاتھ جس سے کاغذ کو وہ یوں
چپ رہا جاتا نہیں تصویر سے

لن ترانی سے کھلا ناز کا بھی راز مجھے
پردہ ہوتا تو سناتے نہ وہ آواز مجھے

مرض موت ہوا دہر میں آغاز مجھے
میں تو کہتا تھا ہوا یاں کی ہے ناساز مجھے

تن خاک ہے تو زیست کا کیا اعتبار ہے
جو عضو ہے غبار کا نقش و نگار ہے

رحمت سے دور ہوں تو کروں ترک معصیت
یوں بھی تو مشکل اے مرے پروردگار ہے

رحمت کے اعتماد پہ جو ہر کیے گناہ
اب عفو وہ کرے نہ کرے اختیار ہے

اللہ رے شرم آئی جو تصویر بھی مری
آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دیے فرط حجاب میں

کشتہ ہوئی ہے کوئی تو ایسی ہی آرزو
آنسو تڑپتے آتے ہیں چشم پرآب میں

شاخیں بلائیں لیتی ہیں جھک جھک کے بار بار
عالم ہے کس کی نیند کا سبزے کے خواب میں

راضی ہوں دیکھ میرا تڑپنا جحیم میں
رحمت جو تیری دیکھ سکے اضطراب میں

رحمت کو اضطراب ہے نالہ میں اہل حشر
یوں سر کو خم کیے میں کھڑا ہوں حجاب میں

لاکھ کوئی کچھ بجلی کی ادائیں بھی کرے آہ
فتنہ آنکھوں میں جوانی کا ہے مخمور نہیں

کوئی ہے لیں مگر آگ لگانے والا
آپ سے آپ جلے شمع یہ دستور نہیں

جس سے دن وصل کا بنجائے مری ہجر کی
سحر وہ نرگس جادو کو بھی منظور نہیں

حشر میں ہوتا ہے جو کچھ وہ بجا ہوتا ہے
آپ آجائیں تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

غیر ممکن ہے کہ یوں جائے مرا سوزِ الم
شمع کو شعلہ فنا کر کے فنا ہوتا ہے

بلا کی ہو جو منافی وہ التجا نہ کرے
طلب سے ہاتھ اٹھائے مگر دعا نہ کرے

صدا جو سنتا ہے منہ پھیر کر وہ روتا ہے
کسی سے حال اسیرِ قفس کہا نہ کرے

بچپن کی ہے جو چال ادا پر نظر نہیں
کس کی خبر انہیں ہو جب اپنی خبر نہیں

پھیلائے پاؤں سوتے ہیں تکیہ پہ سر نہیں
کیا کر رہی ہے کس کی نظر کچھ خبر نہیں

کچھ حال دل چھپائے تو ہیں اتنے زعم میں
ترچھی نگہ جو کہتی ہے اس کی خبر نہیں

قیامت دیکھتے آئینے میں نظر آتی ہے دیر آنکھ
زمیں سے چلنے میں کھنچتا ہوا دامن اٹھاتے ہیں

خیال خاطر نازک نہ تھا عفو ہو تقصیر
جگر کو تھام کے اب عرض حال کرتے ہیں

بندھیں بندھے سے کسی اہل وحشت عمر قفس
ہوا کیا گر پڑی زنجیر رشتہ پائے سودا میں

ہوا کے دم سے اتنا بھی اگر ہے تو غنیمت ہے
ہرے ٹیلے مرے برآئے جاتے ہیں نشیمن میں

یہی تو ہیں ادائیں قتل کرتی ہیں جو محفل کو
کہ خود بیٹھے ہیں اور تصویر پوشیدہ ہے دامن میں

نظر میں کیوں نہ ان کی نشہ آتا آنکھ سے نکلا
کرے مستوں کے ہاتھوں سے بھی گر جاتی ہے دامن میں

داغ دل وقت جوانی جلوہ گر کیوں کر نہ ہو
ضو فشاں ہنگام شب نورِ قمر کیوں کر نہ ہو

کہاں وہ چال کہاں خفتگی خاک کے دل
خدا کسی کو تمہاری طرح جوان نہ کرے

زیست کے دن کر کے پورے نکلی ہے تن سے روح
جس کو بھرنے نے کیا خالی ہیں وہ پیمانہ ہوں

ہیں جو کچھ اور دیکھتے نہیں خار کو بھی خار
ڈر یہ رہتا ہے کہ وہ بھی تو زباں رکھتے ہیں

فصل بہار آئی ہے صیاد رحم کر
قیدی کوئی قفس میں ہمارے سوا نہیں

جان ڈالے قالبِ بے جان میں گر قدرت تری
رنگ دوڑے خون بن کر پیکر تصویر میں

داغِ دل میں کیوں مرے ضیا دیتے ہیں
نیند کے وقت تو شمعوں کو بجھا دیتے ہیں

بجلیاں شمع پہ آتی ہیں تصور ہے ترا
تو سنے یا نہ سنے ہم تو صدا دیتے ہیں

اللہ خیر کیجیو دل کی شتاب میں
تاریک شب ہے اور کوئی پاسباں نہیں

جاگے ہیں رات بھر وہ اسی اضطراب میں
وہ دیکھتا نہ ہو مری صورت کو خواب میں

قاصد کے انتظار میں آخر ہوا یہ تنگ
لکھنے لگا میں آپ خط اپنے جواب میں

محجوب کس گناہ سے یارب ہوں اے حضور
رحمت کو دیکھتا ہوں تری اضطراب میں

رکھے رہیں نہ ہاتھ وہ چہرے پہ کس طرح
عادت ہے بیمار کی کھیلے نہ خواب میں

بے خوف اسی میں چلا ہوں سوئے جحیم
رحمت نہ تیری دیکھ سکے گی عذاب میں

پوچھی جو مجھ سے قیس نے سختی راہ عشق
پاؤں کے خار رکھ دیئے سر نکال کے

اک عاشقوں کی بات تھی اسکو بھی کھو دیا
موسیٰ نے جواب ارنی کے سوال کے

جنبش دو دل سے اگر آہ رسا آتی ہے
ٹوٹتا ہے کوئی شیشہ تو صدا آتی ہے

گوش دل سے مری آواز کو سنتے ہیں ملک
ہیر پردے میں کسی کی جو صدا آتی ہے

مجھ سے کھلتا نہیں لے قافلہ اشک رواں
دل دھڑکتا ہے کہ آواز درا آتی ہے

کان آواز کہ وحدت سے بھرے ہیں لبریز
کوئی بولے مجھے تیری ہی صدا آتی ہے

پردہ دید میں کیا کام نکالا موسیٰ
اب تو کانوں میں وہ مطلب صدا آتی ہے

جلوہ گر ہو کے نگاہوں سے جو چھپ جاتا ہے
مجھے شعر میں نظر آتی ہو شرارت تیری

حشر میں آتے ہو اس شان سے تیغ و خنجر
قہر آ گئے ہے لپیٹے ہے رحمت تیری

عکس آئینہ میں جس طرح نظر آتا ہے
یوں مرے دل میں اتر آئی ہے صورت تیری

گر نہ سمجھے تو ہر سو نا تو زیبائی آپ کی
ہر ادا ہے ناز پروردہ جوانی آپ کی

دو ہی چیزیں ہیں نہیں جن کا زمانے میں نظیر
موسم گل باغ کا فصل جوانی آپ کی

کونسا انصاف ہے آئینہ رکھنا ہاتھ سے
اپنی صورت نہ دیکھیے تو جوانی آپ کی

کانوں میں مردوں کے بھی جانے لگی آواز پا
رو کے نظر سے گذرتی ہے جوانی آپ کی

سبب یہ تھا کہ جو مستوں میں انقلاب آیا
جدھر وہ آنکھ پھری دور شراب آیا

خدا کی شان کہ شرم آ گئی عکس آئینہ سے
وہ اجنبی ہوئے خود سے بھی جب شباب آیا

ہر طرح ہوا عاشقوں ہی کا مطلب
وہ سو گئے چین سے مجھ کو اگر نہ خواب آیا

دھمک نے پاؤں کی تربت میں یہ کہا مجھ سے
خبر تجھے نہیں ہاں عالم شباب آیا

جہاں میں ہم سے زیادہ حسین ہے نہ شاید
پسینہ آگیا تم کو بھی جب حجاب آیا

جب سے آئی ہے جوانی ہی دیکھا ہم نے
جاگ کر رات کٹی صبح کو آرام کیا

شوق کی نظروں نے کام اپنا جو کرنا تھا کیا
بے خبر کیوں ان سے اتنا انکا خواب ناز تھا

رہ گیا تھا کیا یونہی خالی پھڑک کر قید میں
تیلیوں کی جا قفس میں کچھ پر پرواز تھا

حسن کی نیرنگیاں دیکھیں مگر سمجھے نہ یہ
شعبدہ تھا سحر تھا جادو تھا یا اعجاز تھا

زخم اپنے دل کے بھی تو دیکھ لے ناوک فگن
میں بھی اپنی جا پہ ان کی نظروں سے تیر انداز تھا

میں تو کروں نہ درد دل اپنا کبھی بیان
ہر آہ کو مگر طولِ سخن میں ہے

روح کو تن میں نہ کیوں سمجھو الم ہوتا ہر
شمع ہر بزم میں جلنے کے لیے آئی ہے

پیری میں بھی چمک ہے داغ جگر میں ہے
خیر اللہ پھول کہ شب کی طرح ضو قمر میں ہے

روح اپنے جسم میں کیوں مضطرب ہے بعد شباب
شمع کو دیکھا تو شب بھر کیلئے محفل میں ہے

فلک سمجھا نہ مجھے برہم جو دم میں صحبت غم کی
اداسی ہی تو رونق تھی ہماری بزم ماتم کی

کون بڑھ سکتا قیامت تھا قد دلجوئے دوست
دیر تو اور تک کے آخر رک گئے گیسوئے دوست

آ گئے جذب دل اثر آئی شبیہ لب سے دوست
میری نظروں سے جو آئینہ نے دیکھا سوئے دوست

ہوتی زباں اگر تو یہی کہتا دم ازل
دل تو نہ لوں گا لے سے پر درد پگھلا دل

بے خودی سا بھی کوئی دہر میں ہمساز نہیں
غم نہیں عشق نہیں سوز نہیں ساز نہیں

گرد وحشی چشم یہ کہتی ہے کہ جا کے ہو گئے
سوئے ہوا اب کی تو آنکھوں کھلے دیدہ قاتل نہیں

ہے یہی تازہ اسیری میں پھڑکنا جو مرا
یا قفس آج نہیں یا پر پرواز نہیں

عدو سے جان بچے کوئی یہ کہدے اے قاتل
قضا سے کام وہ لے جو ترا ادا نہ کرے

ہم تو واقف بھی نہ تھے حشر سے اس سرو قد کی
آپ آئے تو یہ سمجھے کہ قیامت آئی !

کس کے مرنے کو سنا ہے دل ماہر نہ سنا
اک یہی تھی خبر ایسی جو سنائی نہ گئی

تجلی میں دکھایا اپنا پر تو یار جانی نے
کیا کچھ اور سنایا کچھ صدائے لن ترانی نے

قبا اسکی پسینہ آ گیا گرمی سے اف اف کہہ
لگایا جب گلے اچھی طرح ان کو جوانی نے

ردا سینہ سے سرکی خبر کچھ بھی ہے سونے میں
انھیں بیہوشیوں سے سر اٹھایا تھا جوانی نے

وہ ہوا جو روشنی شمع پردۂ فانوس
تو کیوں نہ حسن کلیجے کے پار ہو جائے

دیوانے بیخودی میں پہنتے ہیں بیڑیاں
غل ہو رہے ہیں آمد فصل بہار کے

صیاد قید زیست سے مجھ میں تو چھٹ گیا
اب کیا تو دیکھتا ہے قفس کو اتار کے

مجرم بھرے بخیر تو مرسل یہ بول اٹھے
ہم بھی گناہگار ہیں پروردگار کے

کیا یونہی مر گئے سمجھے جوانان عشق باز
دم توڑنے کے خاک یہ برسوں نشاں رہے

یہ حد مجھی سے پھڑکنے کی بوستاں کیلئے
قفس کی تیلیاں لایا ہوں آشیاں کیلئے

اسی کو ہوش میں دیکھا اجڑتے آنکھوں سے
جہاں میں تنکے چنے تھے جس آشیاں کیلئے

اسی سے کھل گیا حال قفس مرا سارا !
پروں میں تیلیاں اٹکی تھیں جو نشاں کیلئے

نگاہ شوخ موسیٰ نے تو کب دیکھا تھا
فروغ حسن گر پردہ نہ رکھے لن ترانی

خدا بخشے بہت سا ادا دل کا اپنے خاتمہ سمجھے
لہو سا کچھ نظر آیا جو نامہ بر مجھ کو آلود میں

میں جو آیا تو زمانہ میں بلا بھی آئی
بزم میں شمع کے آتے ہی ہوا بھی آئی

اب ٹوٹے بازوؤں کی ہیں تدبیر کیا کرو
توڑا قفس کے در کو تو سر مار مار کے

شمع وحدت کا میں بزم دہر میں پروانہ ہوں
ہے جنوں میں خرد جس کا میں وہ دیوانہ ہوں

روح باعث ہے سیہ کاری کا میری ہر نفس
شمع جس گھر میں ہے اندھیر میں وہ خانہ ہوں

جو آئینہ ہے وہ ترا صورت نما نہیں
یکتا تو وہ ہے جس کا کوئی دوسرا نہیں

فصل بہار آئی ہے صیاد رحم کر
قیدی قفس میں کوئی ہمارے سوا نہیں

منشی امیر احمد امیر مینائی

تعارف سنہ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۳۱۸ھ میں انتقال ہوا۔ لکھنؤ کے مشہور اساتذہ میں تھے اور اسیر کے شاگرد تھے۔

ترے بندوں سے کرتے ہیں یہ بت دعویٰ خدائی کا
تماشا دیکھتا ہوں تیری شان کبریائی کا

مرے ہی سامنے دامن اٹھا کر ناز سے چلنا
تجھی سے پھر گلا الٹا مرے چاک گریباں کا

امیر آئیں گے گویا شمع اور داغوں کو چھپ چھپ کے
نیا انداز ہوگا تیرے مدفن پر چراغاں کا

چھپاتے ہیں خون مرا کھا کے کیوں حضور
اب اس پہ خاک ڈالیے جو کچھ ہوا ہوا

کیا باغ میں دیکھتی ہے شبنم
جو گل کی ہنسی پہ رو رہی ہے

شیخ کو تھوڑا نہ جانو یہ بڑا مکار ہے
ساری دنیا چھوڑ بیٹھا ہے تلاش حور میں

داور محشر کو بھائی میری ان کی چھیڑ چھاڑ
چھیڑ کر پوچھا مکرر کیا ہوا کیوں کر ہوا

چالاکیاں تو دیکھو مجھے قتل کرکے خود
اوروں سے پوچھتے ہیں یہ کیا ماجرا ہوا

آہ کرنے پہ کیوں بگڑتے ہو
تم تو صاحب ہوا سے لڑتے ہو

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ
مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے!

گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر
ادا کسی کی دم پردہ اٹھا کے آنے کی

راتوں کو مثل شبنم چھپ چھپ کے باغباں سے
ہر پھول سے لپٹ کر روتا ہوں میں چمن میں

بڑھ جاتی ہے چمن میں اور آرزو تمہاری
جس گل کو سونگھتا ہوں آتی ہے بو تمہاری

خزاں تم خیر سے گزری چمن میں بلبلو
بہار آئی ہے اب آشیاں لٹنے نہ دے

شوخی بھی قیامت تری مستانہ ادا میں
شگوفوں نے قدم چوم لیے لغزش پا میں

امیر ایسی کہاں قسمت کہ پہنچیں اڑ کے پھولوں تک
کبھی چاک قفس سے جھانک [illegible]

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

اے موت تجھ کو کیا ہوا ہم تو بلا رہے تھے
اک لحظہ آتے آتے بڑی دیر ہو گئی

غنچہ و گل کو تو سو بار شگفتہ دیکھا
غنچۂ دل بھی الٰہی کبھی خنداں ہوگا!

ایک اپنی اس نے بنائی ہے ہماری صورت
سیکڑوں ہو گئے کیا حال سلیماں ہوگا

دست وحشت تو سلامت ہے رفو ہونے دو
ایک جھٹکے میں نہ دامن نہ گریباں ہوگا

خواہش وصل تو کیونکر کہوں لیکن ناصح
دیکھ لینے کا تو حضرت کو بھی ارماں ہوگا

مرے لبوں پہ ہی [illegible] شعلہ ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یا رب
مرے دونوں پہلوؤں میں دل بے قرار ہوتا

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

میں زباں سے تم کو سچا کہوں لاکھ بار کہہ دوں
اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا

جمال یار کو کہتے ہو تم کہاں دیکھا
کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا

وہی چراغ وہی گل وہی قمر وہی برق
نئے لباس میں دیکھا اسے جہاں دیکھا

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا

آنکھ کیا ہے موہنی ہے سحر ہے اعجاز ہے
اک نگاہ لطف میں سارا گلہ جاتا رہا

شکوہ کسی سے دل کی شکستگی کا کروں میں کیا
یہ شیشہ چوٹ کھانے سے پہلے ہی چور تھا

آفت کی شوخیاں ہیں تمہاری نگاہ میں
محشر کے فتنے کھیلتے ہیں جلوہ گاہ میں

صورت تری دکھا کے کہوں گا بروز حشر
آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

گڑا کر زمیں میں ظلم سے مجھ کو دفنا دیا
دیکھا تو زیر خاک وہی آسماں تھا

بیداد تھی شوخی تھی جفا تھی کہ ستم تھا
ہوتی جو وفا آپ میں جو کچھ تھا وہ کم تھا

دھیان کیونکر لفت میں باندھا [illegible]
وائے قسمت دم نکلے [illegible] ابھی گیا

امیر کس سے کہوں کوئی اس پاس نہیں
شریک غم جو تھا اک دل اسے حواس نہیں

کسی رئیس کی محفل کا ذکر کیا ہے امیر
خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے

ناز ہے تم کو بہت حسن کی یکتائی پر!
اک ذرا آئینہ خانہ میں تو چل کے دیکھو!

عشق سے پیری میں بھی کچھ لاگ باقی رہ گئی
کارواں عمر گذرا آگ باقی رہ گئی!

لکھنؤ کی شاعری کا تیسرا دور

مولانا علی حیدر نظم طباطبائی

تعارف: سنہ ۱۲۷۰ھ میں پیدا ہوئے سنہ ۱۹۳۳ء میں انتقال ہوا ان کی ادبی و شاعرانہ عظمت مسلم ہے۔

ادا میں سادگی میں کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا — شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا
کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں — ستم کیسا کیا شرمائے ہاتھوں سے جو مل ڈالا
شکن ماتھے پہ آئی اب بھلا کیوں رخ لگے کرنے — تعلی بڑھ گئی ہو بات جو پہلے پہل ٹالا

خوشبو سے یوں ہی ہوش ربا وصل کی شب تھی — گیسو ہوئے برہم تو کھلا نافۂ چیں اور
اللہ رے ساقی کا بصد ہو کے بلانا ! — کہتا ہوں میں بس بس تو وہ کہتا ہے نہیں اور

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ — تو مجھے دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا

اڑ کے جاتی ہے مری خاک اِدھر گاہ اُدھر — کچھ پتہ دے نہ گئی عمر گریزاں اپنا

اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کرلیں — نفس کو خوں فشاں کرلیں قفس کو بوستاں کرلیں

دل اس طرح ہوائے محبت میں جل گیا — بھڑکی کہیں نہ آگ نہ اٹھا دھواں کہیں

مجھے پیری اور شباب میں جو ہے امتیاز تو اس قدر — کوئی جھونکا بادِ سحر کا تھا مرے پاس سے جو گزر گیا

ہنسی ہنسی میں وہ بات کہہ دی کہ رہ گئے آپ دنگ ہو کے — چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرے کا رنگ ہو کے
شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پُر درد ہے فسانہ — یہ رہ گئی بن کے گرد حسرت وہ اڑ گیا رنگ ہو کے

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دیے دیتے ہیں پروانے — انھوں نے شمع کے شعلے کو شاید تاج زر جانا
ذرا سی آبرو جو قطرۂ شبنم سے بھی کم تھی — سنا جوہر شناسوں نے اُسے آبِ گہر جانا

سارے عالم کو بنایا ہدفِ تیر اجل — قادر انداز نے یہ فعل حکیمانہ کیا
آج گم ردوں میں کیا شہرۂ آفاق جسے — کل اُسے محفلِ احباب کا افسانہ کیا
الحذر نظم بہت جھک کے فلک ملتا ہے — خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

ادھر جوانی کی شام آئی۔ ادھر ہوئی صبح عہد پیری — یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں شب درمیاں نہیں ہے
اگرچہ ہے بے ثبات عالم ٹھہر کوئی دم تو [illegible] — ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگ گل پر گراں نہیں ہے

ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا — مجھ کو خبر کسی کی اُڑائی ہوئی سی ہے
منزل اسے سمجھ کے گھر کر لیتے ہیں ہم — بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے

مجھے دھڑکا ہے شوقِ منزل کا یہ کہہ کہہ کر — کہ گرنا بار بار اچھا نہیں اے نقش قدم اچھا

مرزا محمد ہادی مرزا رسوا

تعارف: ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۱ء میں انتقال ہوا۔

حسن شاہد ہے مری نیرنگیٔ تحریر کا
اک ادا نے شوخ ہے جو رنگ ہی تصویر کا

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی

تم کو الفت نہ ادا یاد آئی
یاد آئی تو جفا یاد آئی

ہجر کی رات گزر ہی جاتی
کیوں تری زلف رسا یاد آئی

لذت معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا
لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

کیا غزل کوئی کہی ہے مرزا
آج کیوں باد صبا یاد آئی

وہ بھی دن ہونگے کہ ہم ناخن سے سینے جائیں گے
دیکھیے فصل خزاں آئے کب سیئے جائیں گے

حضرت ناصح نہیں ممکن مری وحشت کا علاج
دشت میں جا کے گریباں آپ سینے جائیں گے

زندگی، دولت، جوانی، بے خودی، شوق وصال
پھر ملیں گے بھی جو یہ سامان چھینے جائیں گے

موت ہی کو زندگی کہنا اگر ہے رسم عشق
مرنے والے آپ کے قبروں میں جیتے جائیں گے

اپنی قسمت راہ پر آئے تو مرزا دیکھنا
کربلا ہوتے ہوئے اس کے مدینے جائیں گے

مشکل ہے ضبط گریۂ بے اختیار کا
کب تک نگاہ پاسِ دریا کرے کوئی

گو ادعائے شوق کے بالکل خلاف ہو
لیکن یہ مصلحت ہے کہ پردہ کرے کوئی

ہاں اے نگاہ شوق مناسب ہے احتیاط
ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

ہاں دیکھنا ہے اس کے جنوں کا بھی امتیاز
مجنوں سے جا کے شکوۂ لیلیٰ کرے کوئی

دل بے نیاز اور طبیعت حیا پسند
وہ کیا کریں جو خواہش بے جا کرے کوئی

درد دل کی لذتیں صرف شب غم ہو گئیں
طول فرقت سے بہت بے تابیاں کم ہو گئیں

ہم نشیں دیکھی نحوست داستان ہجر کی
محفلیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہو گئیں

ہم کو بھی کیا کیا نشے کی داستانیں یاد تھیں
لیکن اب تمہید ذکر درد و ماتم ہو گئیں

دل یہ کہتا ہے فراق ماہ و انجم دیکھ کر
ہائے کیا کیا صحبتیں ان کو برہم ہو گئیں

آئینے سے ہے ان کا رد و بدل
تنگ ہیں شوخی، مقابل سے

شمع فانوس اس کی محفل میں
جھینپتی کیوں ہے اہل محفل سے

اور تو سب تری محفل میں جمے بیٹھے ہیں
بار بار اٹھنے کو کہتا ہے جسے بیٹھے کوئی

سائلوں کے لیے اب کوئی سزا ہو تجویز
جانتے ہو کہ نہ مانے گا نہیں سے کوئی

بے خودی میں بھی ہر ایک سے کہے دیتا ہوں
پوچھ لے جا کے مرا حال انھیں سے کوئی

خاک میں تم نے ملایا ہے کہاں مرزا کو
حیف اتنا بھی نہ پوچھے گا زمیں سے کوئی

حضرت ناصح نہیں ممکن مری وحشت کا علاج
دشت میں چاک گریباں آپ سینے جائیں گے

سمجھا ہوں جو مراد ہے اس پیچ پیچ سے
ناصح کو بھی ہوس ہے کہ رسوا کرے کوئی

کیا ہنسی کھیل دل لگانا ہے
دل کا آنا قضا کا آنا ہے

دل ناداں سے کیا فریب کرو
اس کے پہلو سے اٹھ کے آنا ہے

دشت میں بھی تو دل نہیں لگتا
اس جنوں کا کہیں ٹھکانا ہے

شعر گوئی فقط بہانا تھا
حال دل کا انھیں سنانا تھا

تجھ سے کیا چوک ہو گئی قاصد
ساتھ ہی اس کو لیکے آنا تھا

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم
کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا

کچھ دنوں ہم سے دوستی کرکے
دشمنوں کو بھی آزمانا تھا

چھٹ کے پابند ہم دیوانگی چھٹ بند
پھر لگایا جائے لو یا قیس کی زنجیر کا

شور فریاد تا فلک پہنچا
مگر اس کو خبر نہیں ہوتی

تیرے کوچے کے بے نواؤں کو
ہوس مال و زر نہیں ہوتی

جان دینا کسی پہ لازم تھا
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

کسی امید پہ نظر میری — شکوہ سنج اثر نہیں ہوتی
ہم اسیران عشق کو صیاد — ہوس بال و پر نہیں ہوتی
غلط انداز ہی سہی وہ نظر — کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی
اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے — دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی
سر سے ٹلتی ہیں شب غم کی بلائیں کیونکر — یا خدا ہوتی ہیں مقبول دعائیں کیونکر
دیکھو دیکھو مرے لٹنے کا تماشا دیکھو — ابر ساون میں برستے ہیں گھٹائیں کیونکر
نہ سہی عشق و محبت بھی ہے آخر کوئی شے — رسم بڑھ جائے کسی سے تو گھٹائیں کیونکر
وصل کی رات ہے پہلے سے بتا دو ہم کو — تم کسی بات پہ روٹھو تو منائیں کیونکر
عین وحدت خلاف کثرت ہے — لطف خلوت جدا ہے محفل سے

کس قدر معتقد حسن مکافات ہوں میں — دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے
شوق اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ — اسی آئینے میں تو جلوہ نما ہوتا ہے
نہ ہم ہستی سے گزر جانا تھا — موت کے قبل ہی مر جانا تھا
موت کیا چیز ہے ترک لذات — ہے اسی موت سے مقصود حیات

رنگ و بو سے نہ رکھو کچھ مطلب — جز خدا اور نہ ہو کچھ مطلب
اک مرے یار مہرباں رسوا — وحشی، آوارہ، خانماں رسوا
مست، آشفتہ حال و آوارہ — بے دل و بے قرار و بے چارہ
ہرزہ گرد طریق گم نامی! — رہرو شاہ راہ ناکامی
دل پریشان و مضطر و بے تاب — زار، بے حال، بے خود و بے خواب
کشتۂ تیغ الفت جلاد — بسمل تیر حسرت بے داد
چشم بے خواب خواب سے محروم — دل بے تاب تاب سے محروم
قطرۂ اشک ارغوانی رنگ — چہرۂ زرد زعفرانی رنگ

خشک ہونٹوں پہ آہ شعلہ مثال — اک پری وش کا نام ورد زباں
حیا کی شوخیوں سے اٹھتے اٹھتے جھک گئی نظر — مری قسمت سے ان کے تیر بھی آئے کماں ہو کر
غضب اس محفل میں ایسا ادب بھی لکھنا بھی ہنر — نہیں آئی کبھی طبیعت اہل معنی کی رواں ہو کر
ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گی ادائیں ان کے جوبن کی — دوپٹہ اوڑھ کر آتا جو چلنے میں ابھرتے ہیں
تماشا ہو جوان تم بوسہ لے کر ہم مکر جائیں — بہت جو چاہنے والوں کا دل لیکر مکرتے ہیں
جوان ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے دل — کہاں کی پاک بازی ہم بھی اب تو ...

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے — دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہوتا ہے
نالہ رکتا ہے تو سر گرم جفا ہوتا ہے — درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے
پھر نظر چھپتی ہے آنکھ جھپکی جاتی ہے — دیکھئے دیکھئے پھر تیر خطا ہوتا ہے
بت پرستی میں نہ ہوگا کوئی مجھ سا بدنام — چھپتا ہوں جو کہیں ذکر خدا ہوتا ہے
حال دل اس سے نہ کہتا تھا جو بہک گئے — اب کہے کی بات بیاں کیجیے بھی تو کیا ہوتا ہے
غالب گو پہنچ جاتے ہیں مرنے والے — وہ بھی اس وقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے

ہوا ہو الہی گلزار بھی شراب بھی ہو — یہ سب بھی ہو مگر اک سادہ شباب بھی ہے

بعد توبہ کے بھی دل میں یہ ہے حسرت باقی — دے کے قسمیں کوئی اک جام پلا دے ہم کو

ذرا پوچھو ہم سے کیونکر زندگی کے دن گزرتے ہیں — کسی بیرے مردہ کی فرقت میں جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

کل رات کو انہیں جو کہیں دیر ہو گئی — دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی
مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات — تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی
پہرہ خواہشوں نے نہ جینے دیا ہمیں — ان موذیوں سے عقل مری زیر ہو گئی
اے موت تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا آ — ان کو تو آتے آتے بڑی دیر ہو گئی
میری تباہیوں کی انہیں اب خبر ہوئی — کیا پوچھتے ہو عمر تو ہی تیر ہو گئی
آج اس نے ملنے کا وعدہ کیا تو ہے — دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہو گئی

پیارے صاحب رشید

تعارف:- سید مصطفی مرزا نام پیارے صاحب عرف رشید تخلص میر انیس کے نواسے سید مرزا انس شاگرد ناسخ کے پوتے احمد مرزا صابر کے بیٹے عشق اور تعشق کے بھتیجے ١٢٦٢ھ / ١٨٤٦ میں ولادت اور ١٣٣٦ھ / ١٩١٧ میں وفات ہوئی۔

سید اصغر شاہ صاحب نے صرف و نحو اور مرزا محمد اعجاز سے فقہ اور مولوی انور علی حنفی سے معقولات کی تحصیل کی شوق مطالعہ نے استعداد علمی بڑھائی شاعری میں اپنے چچا میر عشق اور تعشق کے شاگرد تھے دبلے پتلے میانہ قد لکھنؤ کی تہذیب و شرافت کا پتلا خوددار نازک مزاج کم سخن مرنجان مرنج انسان تھے معاصرین میں کبھی کسی سے سخن گسترانہ چشمک کبھی نہیں ہوئی غزل اور مرثیہ میں اپنے وقت کے مسلم اساتذہ میں تھے دور دور شہرت تھی شاگرد آغا شیر نے ان کے حالات میں ایک مستقل کتاب حیات رشید کے نام سے لکھی ہے:- ع

شروع عشق میں صبر اس دل مضطر سے کیا ہوگا — ابھی نا آشنا ہے رفتہ رفتہ آشنا ہوگا
ہے بے خود وصل میں دل ہجر میں مضطر سوا ہوگا — خوشی جس گھر کی ایسی ہے وہاں کا رنج کیا ہوگا
ابھی تو یاد ہے کہنے کی باتیں دل میں لاکھوں ہیں — نہ کچھ یاد آئیگا اس وقت جس دم سامنا ہوگا
انھیں عشاق کی گستاخیوں کا خوف رہتا ہے — کبھی غافل نہیں سوتے کہ کوئی جاگتا ہوگا
وہ گیسو بڑھتے جاتے ہیں بلائیں کی ہیں نازل — قدم تک آ گئے جب حشر عالم میں بپا ہوگا
غضب کرتے ہو میرے دل کو ابرو سے چھڑاتے — بھلا سوچو تو کیونکر گوشت ناخن سے جدا ہوگا
عدم میں کیسا کیسا دم رکے گا ایک مدت تک — نئی بستی نئی پوشاک ہوگی گھر نیا ہوگا
رقیبوں کی امیدوں کو جگہ دیتے ہیں ہم دل میں — کہاں ہیں کوئی آخر ہمارا مدعا ہوگا
بیاں ہوتا ہے دل کا راز جب ایسی ہو بیتابی — ترا شکوہ کروں گا میں فقط جب دل خفا ہوگا

نہیں ہے حسینو ترا عشق وہ دل ہے تباہی میں — وہ کشتی ڈوب جائیگی کہ جس کا نا خدا ہوگا

اپنے گناہ دیکھ کے دفتر میں روز حشر — ہنگامہ ہجر اور ہوس یاد آگیا

صد پارہ ہو کے پھیل گیا ہے ہمارا دل — شیرازہ کھل گیا ہے وفا کی کتاب کا
تنگ آ کے کی یہ تیغ حوالے نکال کر پردہ کیا قبول — انجام یہ ہوا ہے تمہارے حجاب کا

مہر لازم تھا مجھے ظلم کرنا تھا تمہیں — یہ لباس عشق تھا وہ حسن کی پوشاک تھا

محشر میں ہے سوال گناہ و ثواب کا — یہ ذکر ہو رہا ہے ہمارے شباب کا
مانگی اجازت اور تری آنکھوں سے لی مدد — عالم نے جب ارادہ کیا انقلاب کا

نیند بھر کے بھی نہ پائی تھی کہ آیا وقت کوچ — کھول کر آنکھیں جو دیکھا قافلہ تیار تھا

دکھ دیا جو اس ستم ایجاد آگیا — بھولے ہوئے تھے قصہ غم یاد آگیا
رستہ گیا ہے سوئے حقیقت مجاز سے — بت یاد آگیا تو خدا یاد آگیا
دنیا کے سب امور فراموش ہو گئے — کیا جانے دفعتہً ہمیں کیا یاد آگیا

ہم زمانے سے گئے ہجر تن تو جان ہو گیا — آج با حکم فیصلہ شام ہجراں ہو گیا
غش پڑے تھے ساکن بستر خوش حال تم جو آ گئے — تب تو آنکھیں کھول دیں گویا چراغاں ہو گیا
اب ہوا ثابت کہ شہر نگی ہے حسن و عشق میں — آپ کا گیسو ہمارا دل پریشاں ہو گیا
دست وحشت نے بڑھائی اور بھی دیوانگی — جادہ دشت جنوں ہر تار داماں ہو گیا
مجموعہ زلفیں بنانے میں ہیں پروا بھی نہیں — کس کا بگڑا حال کس کا دل پریشاں ہو گیا

لائے ہمراہ پھر کہاں دوسری قاتل میرا — خون اغیار میں ہو جائے نہ شامل میرا
گو برا ہے دل مگر رہنے دیا ہے اسلیے — عشق کی خو گر طبیعت ہے کبھی کام آئے گا
قاصد مرگ آئے یا آئے تمہارا نامہ بر — کہہ رکھا ہے دل کو کوئی آج پیغام آئیگا
روح کا تن سے نکلنا آنکھ جانا ہے ایک — کچھ عجب ہنگام ہوگا جب وہ ہنگام آئیگا
دونوں آنکھیں دل جگر میں عشق ہوں میں شریک — یہ تو سب اچھے رہیں گے مجھ پہ الزام آئیگا

ترا وحشی فقط ہے منتظر اک خندۂ گل کا — نظر سوئے چمن ہے ہاتھ رکھا ہے گریباں پر

ہاتھ کھینچے ہوئے بیٹھے ہیں اسیران قفس — کہ نہ داماں قفس ہے نہ گریباں قفس
کب رہا ہو گئے اسیری کا مزا دل سمجھا — آشیاں بھی جو بنایا تو بعنوان قفس

جدھر دیکھئے صحرا میں بھی دیوانوں کی — وضع اک نئی طرز بدلتے ہیں گریبانوں کی
کیجئے سال گرہ فصل بہار آ پہنچی — بیڑیاں پھر سے بدلوائیے دیوانوں کی
آج ہم روئے بہت دیکھ کے تصویر شباب — یاد تازہ ہوئی بھولے ہوئے افسانوں کی
منع کرتے تھے کبھی اشک نہ آنکھوں سے رکیں — ابر و کھوئی جھلکتے ہوئے پیمانوں کی

دل ہی ڈوبے بھی ڈبوئے گا [illegible] — یہی کشتی یہی دریا ہے یہی لنگر ہے
منتقل ہوا ہے وطن سے میں پریشاں نکلا — جامۂ تن کو وہیں چھوڑ کے عریاں نکلا
کس قدر جلد ہمیں بھول گئے اہل وطن — کوئی پوچھے نہ سوئے گور غریباں نکلا
دل کی بستی کا بہت ہم نے سنا تھا شہرا — شہر سمجھے تھے جسے ہم وہ بیاباں نکلا
تجھ سے اے جسم جو کی روح جدا اسیری میں — ہو گئے بے قدر [illegible] کہ یہ مہماں نکلا
کہتے ہیں شبنم و گل عالم نیرنگ کا حال — کوئی ہنستا ہوا نکلا کوئی گریاں نکلا
بام پر شب کو جو سرکی رخ روشن سے نقاب — کاٹ کر راہ ادھر سے مہ تاباں نکلا

بجلی تڑپ تڑپ کے گر گئی کہاں کہاں — [illegible] تو باغ بھر میں مرے آشیاں کے ہیں
کیا آپ جوڑتے ہیں دل پارہ پارہ کو — معلوم بھی ہے کون سے ٹکڑے کہاں کے ہیں

خدا وحشت میں برکت دے سلامت رکھے ہاتھوں کو — کہ بسم اللہ کہہ کر چاک کرتا ہوں گریباں کو
مدد دینے لگی ہے ہر قیامت خیز طوفاں کو — غضب ہو جائیگا کیا ہو گیا ہے چشم گریاں کو

سید کاظم جاوید

محمد کاظم نام بندہ کاظم عرف جاوید تخلص محمد جعفر صاحب امید کے (م سنہ ۱۲۹۳ھ) بیٹے مولانا محمد باقر صاحب منصف الدولہ بہادر (م سنہ ۱۲۷۶ھ) کے پوتے سلطان العلماء مولانا سید محمد صاحب (م سنہ ۱۲۸۴ھ) مجتہد العصر کے پروتے۔

زین العلماء عضد الدین مولانا علی حسین (م) خلف سید العلماء سید حسین (م سنہ ۱۲۷۳ھ) کے نواسے سنہ ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی کہاں تک ہوئی یہ نہیں معلوم۔

گیارہ برس کے سن میں والد کا انتقال ہو گیا ماموں (مہدی حسین ماہر م سنہ ۱۳۲۰ھ) نے پرورش کی ملاذ العلماء مولانا ابو الحسن عرف بچن صاحب نے (م سنہ ۱۳۰۹ھ) وظیفہ معین کیا اس طرح جاوید کی ابتدائی زندگی خوشحالی میں بسر ہوئی۔

شادی خاندان ہی میں صادق علی عرف چھنگا صاحب (م سنہ ۱۳۵۱ھ) کی بہن سے ہوئی جو سید صادق صاحب (م سنہ ۱۲۵۸ھ) پسر سلطان العلماء کے نواسے تھے۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ جب بیوی کا انتقال ہو گیا تو دوسری شادی نہیں کی۔ کتابی چہرہ۔ میانہ قد۔ گدبدا جسم وجاہت اور شان چہرے سے نمایاں تھی چوگوشیہ ٹوپی انگرکھا اس پر تکونا رومال مشرد یا چھالٹین کا پیجامہ اور ڈربی کا پمپ پہنتے تھے ایک ہاتھ میں تسبیح رہتی تھی خشخشی داڑھی تھی جب سے بال سفید ہونے لگے تھے خضاب پابندی سے لگاتے تھے۔

اختلاجی مزاج تھا ہیضہ سے بہت ڈرتے تھے گرمیوں میں اور خاص طور پر فصل کی خرابی کے زمانہ میں استخارہ دیکھ کے کھانا کھاتے تھے۔ اکثر فاقہ کرتے تھے۔

سفر سے بھی بہت گھبراتے تھے جب بضرورت کہیں جانے لگتے تو کوئی شاگرد قرآن کے نیچے سے نکالتا اور وہ دعائیں پڑھتے دونوں بازوؤں پر دم کرتے گھر سے نکلتے تھے۔

خلیق متواضع منکسر مزاج اور صاف دل آدمی تھے سیکڑوں لطیفہ یاد تھے جہاں بیٹھ جاتے تھے محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ شیرازی کبوتروں کا شوق تھا نہایت عمدہ قسم کے رنگ برنگی کبوتر پلے تھے جب ان کی ڈھابلیاں کھلتی تھیں تو ایک چلتا پھرتا باغ نظر آتا تھا۔ دنگل کے بہت شوقین تھے پان کثرت سے کھاتے تھے۔ شاعری کا بچپن سے شوق تھا محمد مصطفیٰ عرف لڈن صاحب خورشید کے شاگرد تھے۔

شاعری میں ان کی شہرت غزل گوئی سے ہوئی اور اپنے زمانہ میں لکھنؤ کے سب سے بڑے غزل گو کی حیثیت سے مشہور ہوئے ان کا مزاج عاشقانہ تھا غزل سے فطری مناسبت تھی اوائل عمر ہی سے انہوں نے شہرت حاصل کر لی۔

مہدی حسین صاحب ماہر کے انتقال کے بعد وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے اور غالباً اسی زمانہ سے مرثیہ کہنا شروع کیا جو اس زمانے میں باعزت ذریعہ معاش تھا اس میں بھی انھوں نے بڑی شہرت حاصل کی اور لکھنؤ کے چوٹی کے مرثیہ گویوں میں شمار کئے گئے۔ حضرت انجم لکھنوی نے اس زمانے کے اکابر مرثیہ گویوں کا ذکر ایک رباعی میں اس طرح کیا ہے۔

اس عہد کے بس یہی ہیں پانچ شاہان سخن — حقا کہ انھیں کے دم سے ہے شان سخن
جاوید عروج و عارف و انجم و رشید — یہ پنجتن پاک ہیں ایمان سخن

وہ مرثیے پڑھنے کے لئے دور دور بلائے جاتے تھے دو مرتبہ نواب علی محمد خان کی دعوت پر حیدرآباد گئے۔ اصغر آباد ہنڈرا ول جانسٹھ ضلع مظفر نگر ہر سال بلائے جاتے تھے اور ہر جگہ سے معقول رقم ملتی تھی جب واپس آتے تھے تو خوشحال ہو جاتے تھے مرغ تیتر بٹیر دونوں وقت پکتے دھیوڑی پردوں سے بھری رہتی تھی کھانے میں اکثر شاگرد بھی شریک رہتے تھے۔ جب پیسہ ختم ہو جاتا تو وہی عسرت کا عالم ہو جاتا لیکن غیور اتنے تھے کہ کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے نہ کسی شاگرد سے کبھی طالب ہوئے کبھی کوئی چیز گروی رکھ دی یا بیچ ڈالی اسی سلسلہ میں اپنا آبائی مکان جو سرائے معالی خاں میں تھا بیچ ڈالا اور تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے کرایہ کے مکان میں اٹھ آئے جہاں مرتے دم تک رہے کسی حال میں ہوں فکر سخن سے غافل نہیں رہتے تھے اور مشق سخن جاری رہتی تھی۔ پیتل کا جالی دار قلمدان سامنے رہتا تھا جس میں قلم دوات رکھی جاتی تو الائچیاں اور عطر کی شیشی ہوتی تھی۔

برجستہ گوئی۔ وہ بڑے برجستہ گو تھے شعر کہنے میں ان کو فکر کی ضرورت نہ تھی غزلوں کی غزلیں اس طرح کہہ ڈالتے تھے جیسے باتیں کر رہے ہیں انھوں نے اپنی بعض غزلوں کے مقطع میں اس کا ذکر بھی کیا ہے صفدر مرزا پوری ان کے تلامذہ میں تھے انھوں نے ایک کتاب بزم خیال لکھی ہے جس میں ان شعراء کا ذکر ہے جن کو انھوں نے دیکھا ہے جاوید صاحب کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے کمال فن سادگی مزاج اور برجستہ گوئی کا اندازہ ہو سکتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"جب میں لکھنؤ میں آیا یہاں کے اکثر شعراء کاملین فن سے ملتا رہا جس وقت میں بندہ کاظم صاحب جاوید سے ملا تو جس قدر میں نے شہرت سنی تھی اس کا کوئی اثر طریقہ بسر سے نہیں پایا۔

اتفاق سے ایک دن ساتھ سبزے کی سیر ہو رہی تھی کہ ایک صنا

سیاہ شیروانی پہنے ہوئے نمودار ہوئے آپ نے کہا ــــ صبح سے شام تک اصلاحیں دے کے یہاں آیا تھا یہ بھی مرے ماتم میں سیاہ پوش ہیں انھوں نے قریب پہنچ کر فراشی سلام کیا اور شعر اصلاح کے لیے سنایا۔ جاوید صاحب سنتے جاتے تھے اور اصلاح دیتے جاتے تھے۔

اتنے میں ایک دوسرے صاحب نازل ہوئے انھوں نے ایک شعر اور ایک مطلع اصلاح کے لیے پیش کیا مطلع تو مجھے یاد نہیں رہا شعر یہ تھا۔ ؎

نہیں ہے اب کوئی جو ان کو دیکھے حسیں اب کیا کریں سرمہ لگا کے

اصلاح

دمِ زینت خیال آتا ہے کس کا حسیں رو دیتے ہیں سرمہ لگا کے

ایک دن جاوید صاحب میرے گھر سے جا رہے تھے پانی برس کے نکل گیا تھا راستے میں کیچڑ بہت تھی پاؤں کیچڑ میں پڑا اور چھینٹیں اڑیں مولانا عشقی اور عزیزی طرب ساتھ تھے آپ نے برجستہ کہا ؎

جو چھینٹ پاؤں سے اڑتی ہے سر پہ آتی ہے فلک کی طرح زمیں بھی ہمیں ستاتی ہے

۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق پندرہ نومبر ۱۹۲۱ء کو انسٹھ برس کی عمر میں دو دن سانجر کے مرض میں مبتلا رہ کے انتقال فرمایا۔ جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا شہر کے تمام روساء، علماء اور شعراء شریک تھے غفران مآب کے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔

ہندوستان کے تقریباً تمام شعراء نے وفات کی تاریخیں کہیں کسمنڈی نے "آوازِ طبتم فادخلوھا خالدین" سے مادہ تاریخ نکالا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔

احباب و معاصرین:- ان کے احباب میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے جو

۱؎ بزم خیال مطبوعہ صدیق بکڈپو امین آباد لکھنؤ ص ۱۲۵ تا ص ۱۲۷

ان کے بڑے قدردانوں میں تھے جب لکھنؤ آتے تھے تو ان سے ضرور ملتے تھے اور اکثر مصرع طرح بھیج کے غزلیں بھی منگواتے تھے ایک غزل کے مقطع میں جاوید صاحب نے اس کا ذکر بھی کیا ہے ؎

ایک ہی دن میں غزل بھیج دی کہہ کر جاوید پاس تھا حضرت آزاد کے فرمانے کا

امیر مینائی ان کے اساتذہ کے ہمعصر تھے مگر ان سے برابر کا برتاؤ کرتے تھے اور اکثر غزلوں کی طرح بھیج کے ان سے غزلیں کہلواتے تھے اس کا ذکر بھی جاوید صاحب نے ایک غزل میں کیا ہے ؎

آپ جاوید بجا لا چکے ارشادِ امیر طرح گر خوب ہو تو فکر بھی بیکار نہ ہو

ریاض خیرآبادی ان کے معاصرین میں تھے ان سے بھی عزیزانہ تعلقات تھے ایک مقطع میں اس کا ذکر بھی ہے ؎

یہ کہہ ریاض سے جاوید ہو جو ملیں کہیں کہاں وہ جائیں جو دوست لکھنؤ آ کے رہ گئے

عمل ملا نہ مجھے حشر میں جو نالوں کا! کمال ہو گیا چہرہ ستانے والوں کا

کہیں کے بھی نہ رہیں گے جو لوگ جیتے ہیں حضور غم نہ کریں آپ مرنے والوں کا

چپ رہوں گا تو ستائے گا مجھے دل میرا کچھ کہوں گا تو مزاج آپ کا برہم ہوگا

پہلے تو اس نے وصل مجھے بے سبب کیا اب ہاتھ مل رہا ہے کہ یہ کیا غضب کیا

کام اپنا اپنا سب کی نگاہوں نے کر لیا [illegible] نے یہ کیا غضب کیا

آئے ہیں لے کے غیر کو وہ پوچھنے مزاج کیونکر کہوں کہ شکر ہے پروردگار کا

جہاں میں کوئی نہ معشوق تھا شباب ایسا زمانہ یاد ہے اس بےوفا کا خطاب ایسا

نہ بار بار سرِ بزم آئینہ دیکھو! میں جانتا ہوں کسی کا نہیں شباب ایسا

یہ کس نے چاہنے والوں پہ سرگرانی کی یہاں تک آتی ہے آواز لن ترانی کی

جو چھپنا ہے تو میری طرف سے پھیر کے منہ یہ کوئی کھیل نہیں موت ہے جدائی کی

انھوں نے دیکھے تسلی پہ کیا کیا اے ہجر — ہمارے دل کو نہ پہلے تھا اضطراب ایسا
قدم قدم پہ ترے بس رہے ہیں دل کتنے — ملا کسی کو نہ عالم میں ترے شباب ایسا
اب ایک نزع کی ہچکی سے کیا میں گھبراؤں — ہزار بار ہوا ہوگا اضطراب ایسا

اس قدر چپ چپ نہ دیکھا تھا کبھی — دیکھ کر تصویر کو پیار آ گیا
دے کوں کچھ خود ہی تسلی کے جواب — حال کہتے کہتے دم گھبرا گیا
بات کھولی عشق کی کیا اے کلیم — جس کی صورت دیکھ لی عشق آ گیا

عاشق کو ترے جی سے گزرنا نہیں آتا — سب آتا ہے کمبخت کو مرنا نہیں آتا

یہ نکات تھی ہے کہ ہیں دو داغ جگر میں — اک ہجر کی شب کا ہے تو اک وصل کی شب کا

اب یہ حسرت کہ لاش بھی نہ اٹھائیں — دل کو مرنے سے پہلے مرنا تھا
گئے اپنے لگایا انھیں کھٹی جوانی نے — مزاج اب آج سے کچھ اور ہے اس

ہے جن کو دورِ چرخ کے غم میں خبر کہ ہم — تڑپی جو موج ٹوٹ گیا دل حباب کا

دل سے رخصت ہو گیا خوف و خیالِ باز پرس — مسکرا کر حال دل کا پیش اور کہدیا
یاد تھا پوری طرح افسانۂ ہجر و وصال — کچھ گھٹا کر کہدیا اور کچھ بڑھا کر کہدیا

کوئی کہدے کہ جو آئے ہیں تو دم بھر ٹھہریں — ایسی کچھ دیر نہیں ہے مرے مر جانے میں
نشہ آنکھوں میں بل ابرو پہ ہے اور یہ ہنسی — ہے سلیقہ انھیں تصویر کے کھنچوانے میں

کسی دامن کی ہم بخشش کو یاد کرتے ہیں — ہم اپنے اشک کی امید پر برباد کرتے ہیں
بہت روئے ہیں قسمت کو جو آباد کرتے ہیں — جگر کے زخم پھٹ جاتے ہیں جب فریاد کرتے ہیں
جا و بیداد اتحادِ عناصر ہے یادگار — یہ اک سرا میں چار مسافر کہاں کے ہیں

یہ آرزو ہے کہ بڑھ جائے طاقتِ پرواز — چھڑک رہا ہوں لہو بازوئے کبوتر پر

مسکرانا بھی اور انکا سا — کھلتی کلیوں کو آ گیا کیونکر
عشق سے نہ پشیمان ہوں کلیم آپ سر بلند — ہوتا ہے یہی عاشق دلگیر کا انداز

داستاں وصل کی چھیڑوں کہ شبِ فرقت کی — لطفِ دو رنگ کے اور ایک ہے افسانۂ عشق
آنے کے دن کی خبر تھی دھڑکنے دی تھی — بیٹھے ہیں کبھی سنتے تھے جو افسانۂ عشق

ایسے یہ حشر سہے ہے لاکھوں ہی ہیں مرتے — یہاں پر ہم بھی نہیں راضی نقاب ڈال چکا

کھیں ہے نشۂ جوانی کا ہم کو غفلتِ عشق — نہ اختیار میں تم ہو نہ اختیار میں ہم

ہے مزاقِ عاشقی میں موت اک امرِ محال — تم پہ جو مرتے ہیں ان کے دم نکل سکتے نہیں
وصل کے اقرار سے کے حشر میں نادم ہیں وہ — اب یہ وعدے آج کے فردا پہ ٹل سکتے نہیں

اتنی حسرت ہے کہ اے کاش اجل بھی آ جا — ان پہ جو مرتے ہیں جینا انھیں منظور نہیں
وہ کیا خوب کہ لاش بھی سر کر لے گئے — جانتا ہوں کہ عزیزوں کا یہ دستور نہیں
ان کے کوچے میں کوئی دفن نہیں ہو سکتا — اب کہوں خاک کہ جینا مجھے منظور نہیں
پاس آتے ہیں وہ ہمراہ رقیب لے کر — اب اگر آج اجل آئے تو کچھ دور نہیں

دیکھ ہی لیتے ہیں ان کے دیکھنے والے انھیں — ان سے تو خود بھی سرِ محفل چھپا جاتا نہیں

سنبھالا ہے خودی کو تو سنبھلے ہیں — نکلے ہیں کبھی ہم نے تو ان کے نکالے ہیں

ثابت نہ کچھ ہوگا مگر ان کی ہے یہ ہی — اب کھینچے تصویر وہ شرمائے ہوئے ہیں
اب چاہنے والوں کے کلیجوں کا خدا ہے — آئی ہے جوانی تو وہ اترائے ہوئے ہیں
عشاق کی ضد سے وہ نگہ رکھتے ہیں نیچی — بیدرد یہ سمجھے ہیں کہ شرمائے ہوئے ہیں
ہو جائے گا تو خود دیکھ لو آنکھوں سے جنازہ — ہم در پہ بری طرح سے آج آئے ہوئے ہیں

دامن کی وہ ہو دیتے ہیں بار بار — مطلب ہے اپنے ہم کو بھی عشق آ جانے ہیں
رات کو دریا میں موجیں کس طرح بیچین ہیں — اک کنارے چاند ہے اور اک کنارے آپ ہیں
سونا ہو قتل ان کی نزاکت دیکھ کر — کھنچتی نہیں ہے ہاتھ سے تلوار کیا کریں
دیکھیں تو جان جائے نہ دیکھیں تو جان جائے — آخر کسی کے طالبِ دیدار کیا کریں

شکوے جو کچھ کیے ہیں چتون یہ کہہ رہی ہے — یا جس بنا رہے ہیں کچھ ڈھلتے جوڑتے ہیں

شمع نے رو کے یہ پروانے کی میت پر کہا : آرزو اب کوئی جلنے کے سوا دل میں نہیں

پکھ خون گرم پھر کسی گوشہ میں رہ گیا — رو دیتی ترا غم ہے دل اپنا جاری

دل کو کیا ہوا ہے تو جلتا ہے رات کو — دل میں جو سوز ہے وہ شمع میں نہیں
اب کیا یہ چاہتے ہو کہ عشق سے کوئی اٹھا — سوسی یہ کیا سمائی ہوئی ہے دماغ میں
ویران پھر ہوا ہے کوئی مکان دل — پھر اک چمک سی ہے بجھتے کے دیئے میں

شام کو آئے تو آت ات کی صدا تھی لب پہ — صبح کو نکلے تو دل تھام کے گھر سے نکلے

کسی پہ نکلے کہیں سے غضب کی شام شباب — وہ پھول کیا جو کھلے تھے چمن کی جگہ سے
یہ بچپنے کی بات ہیں گر نہیں تو اور ہے کیا — کہو تو چھوڑے یہ گر دل کہ تم جوان
درازی شب فرقت کا ذکر کیوں پوچھو — کبھی عادت نہ پڑی کہ تم جوان کے
یہ کیا سبب ہے کہ تصویر کے بھی چہرے پہ — ہنسی کے آگئی جس وقت وہ جوان ہوئے

ہر ایک نقش نے گریہ کی حد دات رہی — اب آدر یاد نہیں کہ قدر ملال ہوئے
یہیں تو سرمہ دنبالہ وہ دے وار — یہ وہ تیر ہے کہ جسے دیکھ کر ملال ہوئے
جس کی باتوں سے ستاتا ہے وصل جاتی ہی مجھے — ہوش کھیا ایسے کو آئے گر تو دیوانہ لیے ہے

موت اور عشق میں کوئی فرق کیا پہنتا ہے — دیکھ کر دو دن کیا صورت گر یہ پہچان گئے

گمان غلط ہے کہ یہ خود وہ ہوا ان سمجھے — تمہارے جس کے ٹکڑے ہو گئے ہو گئے
ان کو تو سہل ہے وہ میرے گھر جائینگے — ہم جو اس ساتھ نہیں گئے تو کدھر گیا ہے
کیا کہیں کیا نہ ہیں تیری ادائیں کر — اب اگر ہو سکتا آ گئی تو ہر ربانہ ہے
روز ہم ہجر میں مرتے ہیں مصیبت ہے تو یہی — اب یقین کر کو نہ آئیگا جو اب اس ہے
اک نقطہ حسرت رہ جاؤ یہ ہم کہتے ہیں — گر وہ کسی بیکا نہ ملے تم تو ادھر جا کر

بکھر کے زلف کو نہ جھا تو سے پہ آئینگے — اس رنگ کی ہیں ملائی نہ اٹھے گی ہرے
بجلی گر گئی آج کسی بدنصیب پہ — ہم نے نتیجہ تمام لیا ... کر جا ہے

زمانہ اپنی آزادی کا شاید یاد کرتا ہے — گرفتار قفس کس درد سے فریاد کرتا ہے
کلیجہ کھلتی کلیوں کا بھی شق ہوتا ہے گلشن میں — یہ کون اس درد سے اے باغباں فریاد کرتا ہے

ابھی اٹھتے ہیں عبادت کو بھی وہ آئے ہوئے — جب سے دیکھا ہے کسی کا دم نکل جاتے ہوئے
ہے گماں لگ اٹھے ہیں گھبراتے ہوئے — آنکھ سے دیکھا نہ تھا کیا غش بھی آتے ہوئے
کس لئے بے سمجھے ہوئے تعریف کر دی چاند کی — لیجئے آئے نقاب رخ وہ سرکائے ہوئے
ان کی ایسی ہو جوانی تو نہیں رہتے ہیں ہوش — خود نقاب رخ کو دیکھا ہے سرک جاتے ہوئے

جانکنی کا وقت ہے کروٹ بدل لیجئے — آپ کی حسرت نہیں دم ہے نکلتے دیکھئے
مہربانی آپ کی پہلو لئے ہے ظلم کا — درد دل کا حال کہتا ہوں سنبھلتے دیکھئے

تھی حشر میں بھی چال قیامت حضور کی — سچ پوچھئے تو چھپ گئی آنکھ حور کی

ہے مصلحت وقت جو غصہ نہیں آتا — ہنستے ہیں کہ جس میں مرے رخ کا اثر جائے
ہاں گور غریباں میں وہی میری لحد ہے — بے قصد چلا پر وہ ستمگار ٹھہر جائے

وہاں آرزو کسی نے نکالی شباب کی — یاں آ گئی قضا دل خانہ خراب کی
ساقی کے رخ سے گھٹ گئی رنگت شراب کی — چہرے پہ کھینچ کے آ گئی سرخی شراب کی
بجلی تڑپ تڑپ گئی گرد و نہ بار بار — تصویر کھینچ سکی نہ تمہارے شباب کی
کیا مل گیا طلسم تصور کو توڑ کے — تصویر کھینچ رہی تھی تمہارے شباب کی

داغ دیتی ہے جوانی آپ کی — پاس ہے سب کے نشانی آپ کی
بچپنا تھا آپ کا ہر دل عزیز — دیکھنے آئی جوانی آپ کی !
مٹنے والا اب کوئی ملتا نہیں — دل سے کہتے ہیں کہانی آپ کی
ساتھ ہی اسکے ہوئے ہم بھی تمام — پر اثر کیا تھی کہانی آپ کی
دید کی امید بھی جاتی رہی — جب سے سن لی ترانی آپ کی

ریاض خیرآبادی

تعارف :- ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے ۱۹۳۴ء میں انتقال ہوا ریاست [illegible] سے وظیفہ ملتا تھا لکھنؤ کی ادبی چہل پہل میں شریک تھے اسیر اور امیر مینائی کے شاگرد تھے۔

کچھ شوخی رفتار میں بھی کم ہے قیامت
کچھ قد بھی نکلتا ہے بُتِ شوخ ادا کا

لاکھ پردوں میں کوئی لے نگہِ شوق سے ہے
دیکھ لیگا جو کوئی دیکھنے والا ہوگا

ذرا جو ہم نے انھیں آج مہرباں دیکھا
نہ ہم سے پوچھئے کیا رنگِ آسماں دیکھا

بہت ہی روئے گلے مل کے ایک ایک سے ہم
لٹا ہوا جو کوئی ہم نے کارواں دیکھا

وہ دل مرا ہو کہ دل کی ہو آہ کوئی ہو
بجھی سی آگ کا اٹھتے ہوئے دھواں دیکھا

ہنگامِ نزع گریہ بیاں بیکسی کا تھا
تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

جب حالِ دل کہا تو یہ سننا پڑا ہمیں
تم تو سنا رہے ہو فسانہ سنا ہوا

جھگڑے وہ گلرخوں کے ابھی کہاں تجھے
کیا ہو گیا گلاب کا تختہ کھلا ہوا

بہکنے میں کیوں یا خدا ہوتی ہے اکثر
مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں آتا

کوئی مست میکدہ آگیا ہے بیخودی میں کیا
نہ صدائے نغمہ دیر بھی نہ حرم سے شعلہ اذاں کا

رہ گیا پردہ ترے چاک گریباں کا
حشر میں کوئی بھی پرساں نہیں دیوانوں کا

آنکھ سے دیکھ لیا خونِ تمنا سو بار!
دیکھئے پھر بھی ٹپکتا ہے نظر سے کیا کیا

آپ آئے تو خیالِ دلِ ناشاد آیا
آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا!

کچھ بھی ہو ریاض آنکھ میں آتے نہیں آنسو
مجھ کو تو کسی بات کا اب غم نہیں

اک ذوقِ نالہ ضبط سے وہ بھی مٹا ہوا
میں کیا بتاؤں کیا دل اندوہگیں میں تھا

مزا دیتی ہیں گھڑیاں انتظارِ یار کی کیا کیا
کبھی مسرور ہو جانا کبھی رنجور ہو جانا

اب خدا جانے بہار آتی ہے اس میں کہ نہیں
میرے دم سے کبھی آباد تھا گلشن اپنا

باغباں کام ہی کیا ہے وہ اجڑے کہ رہے
جب ہمیں باغ سے نکلے تو نشیمن کیسا

آنا آب حشر تک چمکا ریاض!
داغ سے دامن کے سب میں دھو چکا

بہار آئی تھی گلشن میں وہ دن بھی یاد ہیں ہم کو
کسی کے ہاتھ میں مینا تھا کوئی گل بداماں تھا

قریب جب کہ جنگل نہ بستیوں نزدیک
یہ کون تھا مجھے صحرا میں جو پکار گیا

بتوں کو دیکھ کے اللہ یاد آتا ہے
وہ دن گئے، وہ محبت گئی، وہ دل گیا

اڑا کے پھول جیب میں آئے ہیں بہار میں کیا
لگی ہے آگ سی یہ آج لالہ زار میں کیا

مرے ہاتھ سے پینا انھیں اور بار ہوتا
مگر از بس بھی مچلتی جو گلے میں ہار ہوتا

مانا ہمیں کرتا تھا دمِ عشق کا بھرنا تھا
رنگ سے مرنا تھا پھر رنگ سے کر دیکھا

ایک چلو بھی نہیں کوثر و تسنیم ریاض
خاک اڑتی جو لبِ خشک مرا تر ہوتا

عالم جو یہ ہے کچھ آواز سی آجاتی ہے
چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا

بجا اے تھک کے گر پڑے گر کے اٹھ بیٹھے بھی
تجھے پر اثر لے دوری منزل نہیں ہوتا

کوئی جا کر ریاض کو سمجھائے
کچھ خفا ہیں وہ اپنی جان سے آج

رہنے کا ریاض بیٹھ ذرا نام لے لینا
چھپنا ابھی مر کے تجھے ہے مری جاں اور

ملایا خاک ہو کر حسرتوں کو اپنی مٹی میں
چھپایا کارواں کو ہم نے گردِ کارواں ہو کر

ہم بیٹھے جلسے کے شب میں سے کو کرتے تھے
ہم حرم میں آ رہے ہیں میخانے ویراں کر کے

پڑے دن اس دل کی بے نیازی یہاں تک
ہمیں ہم ہیں زمیں سے آسماں تک

لبوں چھپا ہوئے عتاب کا رنگ
کہ بدلنے لگا نقاب کا رنگ

رنگ کا اس کے پوچھنا کیا ہے
جس کا سایہ بھی دے گلاب کا رنگ

پایا جو تجھے تو کھو گئے ہم
بیدار ہوئے تو سو گئے ہم

اب دشت نوردِ عشق ہو ہو
اس راہ میں کانٹے بو گئے ہم

اس بزم میں وہ بت بھی ساتھ ہوگا
یہ سچ ہے ریاض تو گئے ہم

فتنہ سا ہے شراب گلہ تیز ہی نہیں
یہ رنگ ہے شباب کا تو رہا نہیں

کوئی ناخوش ریاض سے کیوں ہو
اس روش کا وہ آدمی ہی نہیں

بہت شگفتہ نہیں پھوٹتے ہی کلی دیکھی
کام کے جب سے وہ گرم نہیں تو کچھ نہیں

کرن سورج کی نکلی جام سے
یہ سمجھا وہ حجاب سے چادر زری

وہی ہم ہیں نہ چھوڑا یار تک ہم نے گریباں کا
وہی ہم ہیں کہ اب ٹکڑے لئے اور

ہنستیں جلانے میرے جاکے فلک پر جھک گئے
کچھ تو کم کچھ اور گئے سیارہ ہیں

رنگ دل کا داغ کب لاتا نہیں
اس چمن کا پھول مرجھاتا نہیں

جو بچھڑتے رہتے ہیں نقش قدم
تو کبھی آتا نہیں جاتا نہیں

سیر کو جلوہ گاہ طور کہاں
دیکھیے پاس جائیں دور کہاں

سر اٹھانے میں ساتھ دے میرا
گم ہوئی ہے صدائے صور کہاں

کوئی بھی داد مجنوں کی بیاباں میں سنتا
چمن کے نشہ سر اپنی کاٹ جاتے ہیں

داد حشر سے کیا شکوہ بیداد کریں
حال نہیں ابھی تو کچھ آپ فریاد کریں

حسرت ہوئی رسائی قیمت کو دو چلے
وہ سنگ در کہاں یہ ہماری جبیں کہاں

ساغر ہے آنکھ پڑ رہی ہے بزم غیر میں
کھل کھیلنے کو ہے نگہ سرمگیں کہاں

ٹوٹی ہے آنے کو یہ پیمانہ میں آج اس
اب دیکھیں ڈھونڈتے ہیں وہم ابھی کہاں

رام ہے دست یار میں یاد ہے لالہ زار میں
پھول آڑتے بہار میں گل کھلے ہیں

کس قدر گور غریباں کے ہوا افسردہ چراغ
جس قدر تیز گرہ اور بجھے جاتے ہیں

فرخاستہ سبزہ کو ہو ہی جاتی ہے لغزش
مستی ترے بہار جو دیکھ رہے ہیں

دیکھا نہیں ہم نے ابھی دنیا کا بدلنا
بدلی ہوئی دنیائی ہوا دیکھ رہے ہیں

لشتر طور ہے جو سورج ہے پیمانے میں
بجلیاں کوندتی ہیں آج کیا محفل نہیں

الگ ہے خدا سے کچھ ساخت ان کی
یہ بت اور سانچے میں ڈھالے ہوئے ہیں

دل تو ہے کیونکہ کہوں پہلو میں میرے نہیں
ہے وہی محفل مگر اب گرم محفل نہیں

نوبت رائے نظر

تعارف:- لکھنؤ کے کالستھ علم و فضل میں فخر لکھنؤ میں ان میں ایسے ایسے ادیب و شاعر پیدا ہوئے جن کا مثل مشکل سے ملے گا ان میں ایک منشی نوبت رائے نظر بھی تھے یہ کالستھوں کے پرانے خاندان سے تھے ان کے آباؤ اجداد سلاطین اودھ کے یہاں معزز عہدوں پہ فائز تھے۔

منشی نوبت رائے نظر ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے اردو فارسی اور انگریزی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے شاعری کا ابتدا سے شوق تھا آغا مظہر لکھنوی کے شاگرد تھے مشاعروں میں لکھنؤ کے اساتذہ سے ٹکر لیتے تھے بڑے بڑے شعرا ان کے کمال کے معترف تھے ایک رسالہ خدنگ نظر بھی نکالتے تھے ۱۹۲۳ء میں انتقال ہوا۔

گردش دھر بھی ایک گردش پیمانہ ہے
ذرہ ذرہ میں ترا جلوہ مستانہ ہے

اک طبیعت کی اداسی کا اثر اتنا ہے
ساری دنیا نگہ یاس میں ویرانہ ہے

حالت محفل عشرت ہے رقم سب اس میں
ایک رقعہ کے برابر پر پروانہ ہے

پر تو مہر کجا ذرہ ناچیز کجا
کیوں یہ دل حسرتی جلوہ جانانہ

ترے ملنے کی وہ تقریب جو ہے یاد اب تک
جس سے کہتا ہوں وہ کہتا ہوا افسانہ ہے

نظر اب چل کے کرنا چاہیے آباد مرقد کو
بہت ہے منتظر اپنی زمیں گور غریباں کی

موت سے کیا ساد کر کھا ہو اس نے اے نظر
مدتیں گذریں سبب کھلتا نہیں تاخیر کا

یاس و ناکامی سے ہے حسن قلب مضطر ہو گیا
اب ترا ملنا نہ ملنا سب برابر ہو گیا

وہ نگاہ سرمگیں ہو یا کسی کا انتظار
چھو کے جو مجھ سے ملا وہ ایک خنجر ہو گیا

اس نے بڑھ کر اور کیا ہے سادہ سی خو
آپ نے رسوا کیا اور مجھ کو ساد ہو گیا

خاک رہی کی جو حالت تھی تو آخر اے نظر
خاک میں ملنے کے قابل جسم لاغر ہو گیا

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی
اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی

حسرتیں دل میں گھٹ رہی ہیں ہنوز
راہ نکلا نہ کچھ نکلنے کی

دلِ سوزاں کو شمع کیا کہئے
اس کو حسرت کہاں ہے جلنے کی

ہم ہیں مجبور زندگی معذور
دم میں طاقت نہیں نکلنے کی

میں کہاں اور خیالِ دوست کہاں
ایک صورت ہے جی بہلنے کی

جل گئے ہم بھی صورتِ خرمن
انتہا یہ تھی ہاتھ ملنے کی

راحت کی جگہ گلشنِ امکاں نہیں دیکھا
کس گل کو سرا خانہ بداماں نہیں دیکھا

ایسا خنکی جوشِ جنوں وادیِ طلب ہے
چل نکلے ہیں گو ہم نے بیاباں نہیں دیکھا

میں بحر میں ڈوبی دلِ مایوس کی کشتی
انھیں کبھی جھکتے ہوئے طوفاں نہیں دیکھا

سنبھل جائے گی عشق پہ بھی دل کو ہو اک ناز
ڈھونڈھا ہے جسے درد کا درماں نہیں دیکھا

اک ہستیِ موہوم کی تعبیر عدم ہے
دنیا میں بجز خوابِ پریشاں نہیں دیکھا

جس رُخ سے نقاب اس نے سرِ بزم الٹ دی
پھر ہم نے کسی شمع کو سوزاں نہیں دیکھا

جتنی ہیں گھڑی سے تیرے چشتی پہ بلائیں
کھلتے ہوئے برسوں درِ زنداں نہیں دیکھا

ہر سال نظر فصلِ جنوں آتی ہے لیکن
مدت سے تجھے چاکِ گریباں نہیں دیکھا

مدت سے ڈھونڈتا ہوں ملا مگر نہیں ہے
وہ اک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے

دل تھا تو ہو رہا تھا احساسِ زندگی بھی
زندہ ہوں اب کدھر ہوں مجھ کو خبر نہیں ہے

آنکھیں بچھی ہیں بہت کچھ دم توڑتا ہے [illegible]
اس آہ میں بھی جھول ہے یا اثر نہیں ہے

تاریک ہو گئی ہو دنیا مہتاب نظر میں
پھر کوئی امتیازِ شام و سحر نہیں ہے

دنیا سے جا رہے ہو کیا لے کے اے [illegible]
زادِ سفر نہیں ہے رختِ سفر نہیں ہے

ہر قدم پر اک نالہ ہر نفس پہ اک آہ
زندگی کیا ایک شرحِ حسرت [illegible]

ہے کہ دنیا آتشِ سیال ہستی ہے نظر
لیکن اپنے جام میں آ رہی پانی [illegible]

زندگی کی کشمکش سے کہہ کے باقی کچھ نہ تھا
اس سے پہلے اے نظر وسعت کبھی ایسی نہ تھی

[illegible] احوال سے [illegible] از آ رہے
یہ محبت اک عداوت تھی نہ رہے [illegible]

اب بھی آ جاتا ہے مجھ کو زندگی میں خیال
تیز جاتا ہوں میں اپنی عمر کی لغزش سے

کچھ بھی ایسا نہیں واعظ سے [illegible]
زہر مل جاتا ہے لیکن تلخیِ گفتار سے

کثرتِ صحرا نوردی آ گئے بھی [illegible]
وہ چاک [illegible] جاتا تھا ایک بار سے

دل میں کتنا خون ہوتے بھر رہا تھا [illegible]
کم نہیں ہوتی [illegible] خونبار سے

اب نہیں معلوم کیا دھیان میں رنگِ بہار
اک زمانہ ہو گیا چھوٹے ہوئے گلزار سے

باغِ عالم میں رہے بے ہوش ہم سب نظر
سیرِ گلشن کی مگر دامنِ خار سے

دامن سے اب لپٹ کے رہے گا مرا غبار
اچھا کیا جو خاک میں تم نے ملا دیا

آتا نہیں خیال اب اپنا بھی اے جلیل
اک بے وفا کی یاد نے سب کچھ بھلا دیا

یار تک پہنچا دیا بے تابیٔ دل نے ہمیں
اک تڑپ میں منزلوں کا فاصلہ جاتا رہا

کہہ گیا شمع سے پروانہ کہ ممکن ہے یہ
میں جلوں اور کلیجہ رہے ٹھنڈا تیرا

روئے رنگیں پہ پسینے کا عجب عالم ہے
آب و آتش کو بہم دست و گریباں دیکھا

وہ شوق بھرا دل تھا حسرت سے تڑپ اٹھا
ثابت نہ ہوا مجھ پہ ناوک کا خطا کرنا

جاتے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گزارش ہے
جب یاد ہم آ جائیں ملنے کی دعا کرنا

بھلا نہ مانو اگر ذکر حور سن کے گیا
غرور تم نے کیا تھا قصور میں نے کیا

اب اس کو پردہ دری سمجھو یا اور کچھ
تمہارے حسن کا چرچا ضرور میں نے کیا

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کے
رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

منتظر موسم گل کے ہیں ترے دیوانے
ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

یہ جو سر نیچے کیے بیٹھے ہیں
جان کتنوں کی لیے بیٹھے ہیں

واعظ چھیڑ دو نہ رندوں کو بہت
یہ سمجھ لو کہ پیے بیٹھے ہیں

دست وحشت کو خبر کر دے کوئی
ہم گریباں لیے بیٹھے ہیں

آج سنتے ہیں وہ اپنا مدعا کہنے کو ہیں
کون جانے دل میں کیا ہے منہ سے کیا کہنے کو ہیں

ان بتوں ہی نے کیا ساری خدائی کو تباہ
برہمن کیا ہم بھی پیش خدا کہنے کو ہیں

ساری دنیا جانتی ہے جیسے حضرت ہیں جلیل
جان دیتے ہیں بتوں پر پارسا کہنے کو ہیں

روز آنکھ چرا کے جانے والے
ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں

مزے بیتابیوں کے آ رہے ہیں
وہ ہم کو ہم انھیں سمجھا رہے ہیں

نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسم نہ کلام
پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں

جلیل حسن جلیل

تعارف: ۱۸۶۶ء میں مانک پور اودھ میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی ادیب و محسن تھے، ان کا ذوق شعری پروان چڑھا۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ ان کے بعد نظام حیدرآباد کے استاد ہوئے۔ ـــــ میں انتقال ہوا۔

فغاں میں درد دعا میں اثر نہیں آتا
جو تم نہیں ہو تو کوئی نظر نہیں آتا

شراب عشق کی مستی عجیب مستی ہے
گیا جو ہوش تو پھر عمر بھر نہیں آتا

رنگ گلاب کی کلی کا!
نقشہ ہے کسی کی کم سنی کا

منہ پھیر کے یوں ہنسی جوانی
یاد آ گیا روٹھنا کسی کا

دیکھو نہ جلیل کر سکو گے
مٹ جائیگا نام عاشقی کا

کوئی حسین ہو ہمیں اک نگاہ کر لینا
جگر کو تھام کے بیٹھے سے آہ کر لینا

نیاز مند ہوں کافی ہے اتنا کرنے کو
سلام جا کے انھیں گاہ گاہ کر لینا

کوئی ستم زدہ تم کو دعا دے دل کا
اثر کرے نہ کرے تم کو آہ کر لینا

موسم گل میں عجب رنگ ہے میخانے کا
شیشہ جھکتا ہے کہ منہ چوم لے پیمانے کا

خوب انصاف تری انجمن ناز میں ہے!
شمع کا رنگ جمے خون ہو پروانے کا

میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی!
کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا

جب سے عشق کا پھندہ مری گردن میں پڑا
پھر پڑا رہے قفس میں کہ نشیمن میں رہا

دل آرام کی خاطر ہے دنیا میں خراب
اور آرام چھپا گوشۂ مدفن میں رہا

چاک دامانیٔ یوسف تو کوئی بات نہ تھی
ہائے وہ چاک زلیخا کے جو دامن میں رہا!

قیس و فرہاد کا پھرتے رہے بہروپ جلیل
یہی سودا تھا، یہی کھیل لڑکپن میں رہا!

نشے میں پا کے ہیں چلتا ہوا سمجھانے کو
ایک پری تھی کہ لگا لے گئی دیوانے کو

کوئی ایسی بھی ہے صورت ترے صدقے ساقی
رکھ لوں پیش لیں اٹھ کر ترے سنبھلنے کو

دم زینت انھیں کیا جانئے کیا یاد آیا
آئینہ توڑ دیا پھینک دیا شانے کو

ہے سبق یاد دو عالم کی فراموشی کا
ہوش اتنا تو ہے اب تک ترے دیوانے کو

اب آنکھ چراتا ہے ملاتے ہوئے ساغر
رندوں کی نظر لگ گئی ساقی کی نظر کو

وعدہ رہا نہ یاد تغافل شعار کو
اب کیا جواب دیں نگہ انتظار کو

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کر کے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

آتے آتے ان کو آئے گا خیال
جاتے جاتے بے خیالی جائے گی

ہے سبب اپنی جگر کاوی نہیں
عشق کی بنیاد ڈالی جائے گی

فصل گل آئی جنوں اچھلا جلیل
اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی

بوئے لیلیٰ جو صبا لائی ہے
دشت مجنوں میں بہار آئی ہے

باغ ہستی سے بہت دور تھے ہم
بو کسی گل کی نگا لائی ہے

داغ جو تم نے دیا ہے مجھ کو
وہ چراغ شب تنہائی ہے

دل چرانے کی ادا خاص ہوا کرتی ہے!
دیکھ لیتے ہیں وہ دزدیدہ نظر سے پہلے

یاد ہے پردہ اٹھانے کو ابھی کیا کہئے!
ہوئے دامن تو جدا دیدۂ تر سے پہلے

شام غربت کا فسانہ نہ ابھی چھیڑو جلیل
پوچھ لوں حال وطن باد سحر سے پہلے

کہہ گیا آج وہ بیدرد گلے مل کے جلیل
ہم نہ واقف تھے ترے درد جگر سے پہلے

اس شان سے وہ آج پئے امتحاں چلے
فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

جب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

اچھا ہے وہ جو مجھ کو پھیر لائے ہیں صیاد
آگاہ کر رہے ہیں محبت کی راہ سے

سیر چمن کو آپ گئے تھے یہ گل کھلا
پھولوں میں آگ لگ گئی برق نگاہ سے

لکھنؤ کی شاعری کا چوتھا دور

علی نقی صفی

تعارف:- علی نقی نام صفی تخلص ۱۸۶۲ء (۱۲۷۸ھ) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۰ء میں تقریباً ۹۰ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کی شاعری کی عمر ۷۰ سال ہے۔ حقیقت میں یہ دور سوم کے شاعر ہیں مگر ایک مدت تک بحیثیت شاعر کے نمودار نہیں ہوئے۔ دور چہارم کے شعراء کے ساتھ نمایاں ہوئے اس لئے ہم نے ان کو دور چہارم میں رکھا ہے۔

تو کبھی ساز میں نغمہ مرے انداز میں ہے
جب تو یہ درد بھرے تری آواز میں ہے

بزم ساقی میں ذرا ہوشیار بیٹھیں آج ہم
کل انہیں پہلو سے میرے شیشۂ دل رکھ گیا

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

بادل گرجا بجلی چمکی روئی شبنم پھول ہنسے
مرغ سحر کو ہجر کی شب کے افسانے منظور ہوئے

جام ہلکے ساتھ گردش میں جب مقدر آ گیا
آنکھ ساقی سے ملائی تھی کہ چکر آ گیا

گل کی آمد میں طرح کی بہار دیکھا کئے
کارواں عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں جلتا رہا ہم ناتواں دیکھا کئے

وہ اور کچھ نہ سہی لطف و انکسار تو ہے
کہ غیر کو ترے وعدے کا اعتبار تو ہے

رہا یاد وہیں کبھی یوں ہی تم نہ سکا ہے
یہاں ایک گرتے گرتے ترا بیمار دم نکلتا ہے

وہ عالم ہے کہ منہ پھیرے ہوئے عالم نکلتا ہے
شب فرقت غم چھپا ہو تو نگا دم نکلتا ہے

چوٹ کھائے ہوئے دل کو نہ خدارا چھیڑو
آئینہ ٹوٹ گیا ہے کہ مری تصویر کھینچ

پر تولتے ہی صفت گنہگار ہو گئے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے

راہ عمل میں نفس حریفانہ ساتھ ہے
رشتہ ابھی ذرا سی لگ دیوانہ ساتھ ہے

یارب بڑھی ہے مری میت اسی طرح بیٹھے رہیں وہ زلف پریشاں کئے ہوئے
پھری کا بھی یوں پھیلیا خشم کہ شام ہی سحر ہوگئی ہے
مگر نہ آتا تھا وہ نہ آئے ادھر کی دنیا اداس ہوگی

گلشن میں بہار آئے خزاں آئے بھر گیا ہے ایک کلی دل کی وہ مرجھائی ہوئی ہے
سخن واعظا شگفتہ بیاں کیا سنئے دل پریشاں بھی نہ ہوتا تو پریشانی کی
اُف ری ناسازی دل کوئی زمانہ تو ذرا صدقے اس کے بھی کچھ دل پہ ہوئی ادا ہے
بے خطا کر ہوا ہے حرف ناوک ظلم ایک رعشہ سا کماں تدرہ انداز میں ہے
بے گنہ سر کے ہے ہنسی سا فراق عدم کی بھی ہزار چاہیں کہ ہم سے سیتھیں لیجائے اسکا خمار
جو دیکھیں عالم آرا کہیں بے نقاب تا تو زمیں کا ذرہ ذرہ بھرا کافر رہتا
رہی نشۂ جوانی بے بلائے زندگانی جو شباب ہی نہ ہوتا کوئی کیوں خراب ہوتا
ہمیشہ سے جنوں ... کو وہ دن ملا دلکش انداز کسی شوخ کی انگڑائی کا

دل جو ٹوٹا تو اک آنسو سر مژگاں نکلا صبح محشر کا ستارہ شب ہجراں نکلا
گل خدا جانے کہ بہار کی حالت کیا تھی شب کو اس گھر سے جو نکلا وہ پریشاں نکلا
جب صبح شب وصل ہوا شام کا وعدہ پھر ہوش مجھے صبح سے تا شام نہ آیا
دل چھوٹ گئے ہم سے حسرت منزل میں گیا تنہا غریب وادی مشکل میں رہ گیا
سوئے رقیب کس نے کیا قصد نا تمام درد اٹھتے اٹھتے آج مرے دل میں رہ گیا
نقطۂ دل میں نہ تھی گنجائش نقش جمال مشق سے ذرے میں لیکن آفتاب آ ہی گیا

سنبھلے تو تھے کہ آ گیا موسم بہار کا اب کیا بھرے گا زخم دل بیقرار کا
خوشگوار رنگ نہایت نظر فریب پھل تلخ ہے مگر چمن روزگار کا
جوش و خروش کشمکش لذت و الم یہ فلسفہ ہے زندگی مستعار کا
کمبخت بڑھ گئے روز قیامت سے اک گھڑی دیکھا فریب تم نے شب انتظار کا

زندہ بچا کہ راہ طلب میں فنا ہوا اک دل تھا وہ غریب خدا جانے کیا ہوا
بے پردہ حسن ذات کا ہونا محال تھا آئینۂ صفات میں صورت نما ہوا
دنیا کے ساتھ ساتھ ہیں تیار اقتدار جو آج ہو رہا ہے وہی بار ہا ہوا
زندانی حیات کو یہ بھی خبر نہیں بیچارہ کب اسیر ہوا کب رہا ہوا

دل سے دل تنگ نزع میں کچھ نا پیغام تھا آمد و رفت نفس کا ورنہ پھر کیا کام تھا
کچھ نہ تھا خواب پریشاں تھا خیال خام تھا زندگی سمجھے تھے جس کو موت کا پیغام تھا

اس حمایت پہ جو دوزخ میں جاتے ہیں در فردوس کو جھکنے سے ترا گھر سمجھا
قامت یار ہو یا فتنۂ محشر ہو صفی اپنی دانست میں دونوں کو برابر سمجھا

سنتا ہوں ذکر تنگی کنج مزار کا کیونکر نبھے گا ساتھ دل بے قرار کا

مرے چھپانے سے کب سوز دل نہاں ہوگا جہاں جلے گی کوئی شے وہیں دھواں ہوگا

یہ بتا دو کہ وہ روٹھیں تو منائیں کیونکر جن کی عادت ہے خوشامد سے خفا ہو جانا

اچھا ہوا کہ حشر کا ہنگام ہو گیا دھڑکوں سے روز روز کے آرام ہو گیا
دل اول شباب ہی سے مر کے رہ گیا بے نور یہ چراغ سر شام ہو گیا
دل ٹوٹنے میں تھوڑی سی تکلیف تو ہوئی لیکن تمام عمر کو آرام ہو گیا

گرانباری عصیاں کی مرا سر اٹھ نہیں سکتا زمیں کہتی ہے مجھ سے اب یہ لنگر اٹھ نہیں سکتا
دل بیمار کچھ تیری نازک مزاجی کی بتوں کا ناز بھی اللہ اکبر اٹھ نہیں سکتا

نہ کیا غنچے نے کس طرح قبائے گل حیرت انگیز ہے داس کا گریباں کرنا
دل کو لائے تھے صفی کر جلوہ گاہ ناز میں پھر انہیں معلوم اسے لا کر وہاں کیا کر دیا

رفتہ رفتہ روح شاید کھنچ رہی ہے سوئے دوست دے رہا ہے میرے ماتھے کا پسینہ لذت دود

جگہ پیدا دلوں میں کی بتوں نے بے وفا ہو کر خدا کو بھی ہوئی یہ بات حاصل کب خدا ہو کر
یہ چشم فتنہ گر کے تھی نظر دل سے آشنا ہو کر رہے کیونکر نگاہ شوق پابند حیا ہو کر

ہنس پڑے قاتل الٰہی شکوۂ بیداد پر
فیصلہ محشر میں ہو جائے ابھی روداد پر

وہ جفائیں سادگی سے دیتا جنھیں بھولا ہو
آ گئیں سب یاد ظالم کو مری فریاد پر

دم آخر کسی کا ہچکیاں لینا یہ کہتا ہے
کچھ ابھی دل میں شاید رہ گئیں ارمان باقی

سوار کشتی طوفاں زدہ کے قلب سے پوچھ
خدا ہی یاد آتا ہے بلا میں مبتلا ہو کر

قفس میں گو دل بیتاب کو بہت ہے دکھ
مگر زباں سے نکل ہی گیا کہ ہائے بہار

صلاحیں تصفیے دیا تو نہیں غافل بغیچے دوباں کو
چلو زنجیر سے رندا کی تاب آ گئی بیاباں کو

آہ وہ رات جو بسر نہ ہوئی
ہم تڑپتے رہے سحر نہ ہوئی

کیوں شب انتظار کیا ہو گا
اتفاقاً اگر سحر نہ ہوئی

زندگی مجھ شکستہ پا کی اسی دام کی
یوں تو میری خیر نے نکلنے کی ہر کے گام کی

محشر میں جا کے آخر کیا داد خواہ کر لے
کہتا اسی کی آخر جس کو گواہ کر لے

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا !

جو پیدا ہی نہ میں ہوتا تو وہ جاں ہوتا تو کیا ہوتا
ہوا تھا خلق اگر دل شادماں ہوتا تو کیا ہوتا

نہیں جب طاقت پرواز ہی دل خستہ بلبل میں
قفس چھٹ کر گیا اب آشیاں ہوتا تو کیا ہوتا

میں کچھ کہتا نہیں اس پر تو ناصح کا یہ عالم ہے
خدا جانے جو میرا راز داں ہوتا تو کیا ہوتا

وہی کیا مجھ کو سلاتے خاک میں آخر جو ملنا تھا
ہوا تھا بے نشاں تو بے نشاں ہوتا تو کیا ہوتا

جب اس نامہرباں پہ مصحفی یوں جان جاتی ہے
خدا جانے جو وہ بت مہرباں ہوتا تو کیا ہوتا

جا کے جیتا تو مزار عدو پہ چراغاں کرنا
ایک تو کی بھی تربت پہ بھی احسان کرنا

دیکھ لوں دور سے تصویر شباب رفتہ
رخ ادھر بھی اے عمر گریزاں کرنا

جیسے ہی ہم نے لگائی لب پہ اک مہر سکوت
خود چراغ زندگی خاموش گویا کر دیا

یوں کیا انساں کو زندان خلاف میں اسیر
ہر طرف سامان دلچسپی مہیا کر دیا

مرزا محمد ہادی عزیز

۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۵ء کو انتقال کیا قصیدہ اور مرثیہ دونوں خوب کہتے تھے اپنے فن پر نازاں تھے۔

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

صاد سرخی سے کیا کس نے سر فرد جمال
اپنے عالم میں ترے دیدۂ مخمور نہیں

انھیں جب قدر ہوگی اپنے حسن روز افزوں کی
اگر وہ سلسلہ سی میری تصویر دیکھیں گے

لذت درد رہی بعد فنا بھی دل میں
حصہ عمر گئے عشق کو کافی نہ ہوا !

دل نہ ہوتا جب بھی تیرا عشق ہوتا روح کو
اس گرہ نے اور اس رشتہ کو محکم کر دیا

اشک گلرنگ بہا دیدۂ تر سے اکثر
بارہا فاش ہوا راز گلستاں ہم سے

کچھ اس میں مصلحت ذوق زندگی بھی تھی
عزیز وعدے کا اس کے جو اعتبار کیا

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا

اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے جلوۂ طور
کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا

عالم عشق کی فطرت میں خلل آتا ہے
ہاں یوں حضرت واعظ کا گر انساں ہونا

سرخ ڈورے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ
چاہیے تھا نہیں پیوست رگ جاں ہونا

حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گزرے ہیں
میرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا

ہجوم شوق کا بس مختصر یہ قصہ ہے
کہ میں جو چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا

حسرت اے دل کر گئی لذت درد
غیر کرتا ہوا افسانہ یاد آیا !!

سکون امن کی فضا کا سبب ہوا آخر
کسی نے دل کو کچھ اس طرح بیقرار کیا

دل کو جہاں سکون ہوا جسم سرد تھا
وہ مدت حیات تھی جب تک کہ درد تھا

گلہ کس سے جب اس کو اضطراب دل پسند آیا
خدا ہی کو ازل سے شیوۂ بسمل پسند آیا

آگے خدا کو علم ہے کیا جانیں کیا ہوا
بس ان کے رخ پہ یاد ہے اٹھنا نقاب کا

کیا بتاؤں ابتدائے عشق کی مجبوریاں   لاکھ سمجھایا دل خانہ خراب آہی گیا

لکھ دیا سب قصۂ بربادیٔ عمر عزیز   کیا کلیجہ تھا ہمارے کاتب تقدیر کا

کیا آپ نے بھی ہجر کے بیمار کو دیکھا   سینے میں دعا مانگتے اغیار کو دیکھا
اب زندگی و موت تذبذب میں پڑی ہے   کیوں نزع کے وقت آپ نے بیمار کو دیکھا
اب پھینکئے یہ خون بھری تیغ پھینکئے   کیا سوچتے ہیں آپ جو ہونا تھا ہو گیا
عشق کی مجبوریاں کیونکر کہیں کس سے کہیں   مختصر یہ ہے کہ جو ہم کو نہ کرنا تھا کیا
ذرے ذرے میں تموج دونوں عالم مضطر   وہ بھی کیا تھا وقت جب عاشق کا دل بیٹھا تھا
دل سے باتیں کرنے والے کچھ خبر بھی ہے تجھے   تیرے ہر انداز کو چھپ چھپ کر کوئی دیکھا کیا
میں حشر کی حقیقت اتنی سمجھ رہا ہوں   دونوں جہاں ہوں گے ان کا تماشا ہوگا
سینہ میں ایک جہنم آنکھوں میں ایک طوفاں   کیا جانتے تھے ہم کو جینا عذاب ہوگا
ہستی ذرہ دلمیں دنیا لئے ہوئے ہے   یہ بھی کوئی ہمیں سا خانہ خراب ہوگا
مجھ سے قاتل کی ندامت تو دیکھی نہ گئی   جی میں آتا ہے بتادوں روز محشر کا ہوا
میں اور اپنی زیست سے مایوس ہوگیا   جب رو دیا مجھے کوئی غمخوار دیکھ کر

وعدہ کیا تھا پھر بھی نہ آئے مزار پر   ہم نے تو جان دی تھی اسی اعتبار پر
اٹھنے کو تیرے در سے اٹھا تو مگر نہ پوچھ   جو کچھ گذر گئی دل بے اختیار پر

کہا محاسب رحمت نے لے کے فرد حساب   یہ مشغلہ ہے شب ماہتاب کے قابل
شراب عشق سے چھلکا جو دل کہا میں نے   یہ جام تھا کسی مست شباب کے قابل
فضائے وسعت دنیا ہے تنگ آنکھوں میں   جگہ نہیں دل خانہ خراب کے قابل

آئے ہیں اس ادا سے سر جلوہ زار میں   بجلی چمک رہی ہے دل بیقرار میں
ہر چند ضبط باعث اخفائے راز ہو   یہ بات اب نہیں ہے مرے اختیار میں
پھر حسن و عشق میں تھا بھلا امتیاز کیا   ہوتا اگر یہ دل ہی مرے اختیار میں

ناصح تری نصیحت بے جا بجا سہی   کیونکر دکھاؤں تجھ کو کلیجہ نکال کے
وادیٔ عشق میں بہلائیں کہاں دل اپنا   ہر طرف رونے کی آواز چلی آتی ہے

ہم کسی فکر میں وہ اپنی کہے جاتے ہیں   سچ ہے ناصح کو بھی کیا درد سری آئی ہے

سچ تو یہ ہے کہ جوانی میں کسے ہوش رہا   میں نے اپنا وہ زمانہ ہی کہاں دیکھا ہے
ان کو سوتے ہوئے دیکھا تھا دم صبح کبھی   کیا بتاؤں جو ان آنکھوں نے سماں دیکھا ہے

جس کے مرنے کی ہو خوشی تم کو   ایسی میت پہ کون روتا ہے
کوئی عالم میں سو نہیں سکتا   بے خبر یوں بھی کوئی سوتا ہے
بجلی چمک رہی تھی یہ تھا شہید امتحاں   پردہ سرک رہا تھا کہ بیہوش ہوگیا
کیا دیکھتا ہوں کون یہ بیٹھا ہے میرے پاس   میں بے ہوش میں ہوں کہ مدہوش ہوگیا
ابر میں اور بجلیوں کی لہر میں ہٹ کوئی   بال بکھراتا ہوا انگڑائیاں لیتا ہوا
دنیا کو وہ ملال دل ناشاد سے ہوا   یہ طول اس خلاصۂ ایجاد سے ہوا
ہے یہ حقیقت عدم و عالم وجود   وہ خامشی سے یہ مری فریاد سے ہوا
رحمت نے بڑھ کے سرد جہنم کو کر دیا   کیا قصور یہ دل ناشاد سے ہوا
نا واقف رسوم محبت ہے کوئی چیز   انسان عزیز شیوہ فریاد سے ہوا
لب تک اس کا نام آجاتا ہے اب بے اختیار   بات کرنا بھی اسی ڈر سے بہت کم کر دیا
ذرہ ذرہ خاک کا میری کہے گا داستاں   آپ سمجھے ختم میں نے قصۂ غم کر دیا
آپ کہتے تھے بنائیں گے خدائی ہم الگ   لیجئے ہم دل نے وہ ساماں بھی فراہم کر دیا
دل کے اجزا میں نہیں ملتا کوئی جزو نشاط   اس صحیفہ سے کسی نے اک ورق کم کر دیا
کر دیا انکار ازل میں سب سے ہر دل نے   وہ مری قسمت میں لکھا کاتب تقدیر نے
موت سے پہلے لکھا تھا میں نے ان کو خط   کر دیا ہنگامہ اس حسرت بھری تحریر نے
دونوں ہاتھ اس نے ملا کر اس طرح انگڑائی لی   مار ڈالا کھینچ کے وہ مری یاد علا کی شمشیر نے

مجھ کو کافر ہی سمجھتے یہ خدا کے بندے   فاش اگر پردہ اسرارِ محبت کرتا
تیرا اندازہ رحمت جو بیاں کر دیتا   کوئی دنیا میں نہ پھر تیری عبادت کرتا

جتنی مصیبتیں تھیں وہ لکھ دی گئے یہاں   بس ختم سعی کاتبِ تقدیر ہو گئی
دل کو جلا کے دولتِ جاوید پا گیا   اتنی سی بات مایۂ اکسیر ہو گئی
اے سعی نامراد بتا کیا جوابِ دل   تقدیر پوچھتی ہے کہ تدبیر ہو گئی
ہاتھوں سے میرے دامنِ رحمت چھڑا لو   ہاں ہاں یہ جانتا ہوں کہ تقصیر ہو گئی

تیرا پرتو جو نہیں جلوہ فروز   ذرہ ذرہ میں چمک کیسی ہے

ہے طلسم تصور تو اب قدم اٹھیں   کہ ذرہ ذرہ پہ تصویرِ یار راہ میں ہے

اگر کوئی حالتِ بیمارِ فرقت ہو گئی ہوتی   اگر دم بھر نہ آتے تم قیامت ہو گئی ہوتی
سرِ محفل تکو سرگرمِ تعلیمِ محبت ہے   یہاں ہوتے تو ناصح کو نصیحت ہو گئی ہوتی

مانا کہ کسی سے نہ کروں گا میں کوئی بات   چھپتی ہے کہیں چاہنے والے کی نظر بھی

یہی کہہ کہہ کے میں نے منزلوں کی ہمت افزائی   کہ اب آتا ہے اب دل اب یہ جانا مانا تا

وہ دل ایسا کون دلبر کہ جسے قرار آئے   یہ جوانی اف جوانی کہ خدا کو پیار آئے

مرنا اور مر کے دیکھوں رنگ میں نئی طبیعت کا   یہی تدبیر اب باقی ہے قسمت آزمانے کی

بزم میں یہ ادا ہمیں سمجھے !   سب کو دیکھا ادھر نظر نہ ہوئی
ہم اسی زندگی پہ مرتے ہیں   جو یہاں چین سے بسر نہ ہوئی
دل نے دنیا نئی بنا ڈالی !   اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی
ہجر کی رات کاٹنے والے   کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

ہوتا نہیں ہے کوئی زمانہ میں کیا جدا   اللہ کوئی حد ہے تمہارے غرور کی بھی

دیارِ عشق میں اللہ رے سیکھے دل کی ہمدردی   ہر اک افسردہ دل کے ساتھ تھوڑی سی

دم توڑتا نہیں کوئی بیمار اس طرح   شاید شریک موت کسی کی ادا بھی

کس قدر ہے نالۂ درد لخراش   سننے والوں سے سنا جاتا نہیں
بجلی تھا ایک سامنے آ کر نکل گئی   کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی

شوقِ دل بڑھ گیا ہے حد سے سوا   فاصلہ گھٹ گیا ہے منزل کا
چھپتے رہیں کیسے ایسی مثالوں کو دیکھئے   پردہ اٹھا کے چاہنے والوں کو دیکھئے
اب بھی ہیں ایسے لوگ کہ جن سے ملے سبق   دل مردہ ہے تو زندہ مثالوں کو دیکھئے

بتا دل کیا کہ میرے دل میں کیا ہے   سوا تیرے تری محفل میں کیا ہے

نزع کا وقت ہے بیٹھا ہے سرہانے کوئی   وقت اب وہ ہے کہ مرنا ہمیں منظور نہیں
دل میں پیوست ہوئی بھی جو میرے روزِ ازل   ہے وہی شوخ نظر صاعقہ طور نہیں
صاد سرخی سے کیا کس نے سرِ فردِ جمال   اپنے عالم میں ترے دیدۂ مخمور نہیں

امید وارِ وصل کو ان کا جوابِ صاف   ایک تیر تھا جو توڑ کے پہلو نکل گیا

یاد ہے پہلے پہل بجلی گرانا یاد ہے   آپ کی جب مہربانی تھی دلِ ناشاد پہ

چمن کی سیر میں مقصود دلبستگی اپنی   خبر کیا تھی کہ ہر غنچہ کو ہم دلگیر دیکھیں گے
یہ مانا کاتبِ اعمال لکھ لیں گے مرقعے   مگر کچھ حالِ دل ناقابلِ تحریر دیکھیں گے
زمیں شق ہو فلک ٹوٹے پہاڑ آپس میں ٹکرائیں   مگر ہم آج زورِ نالۂ شبگیر دیکھیں گے

ذرے ذرے کو بنا دیجئے کسی دن مشرق   مہر افروز تجلی ترے رخساروں کی !
آ کہ سامانِ تجلی کی کمی پوری ہو !   بزم آراستہ ہے چھٹکے ہوئے تاروں کی

سازِ دل کو عشق کی مضراب ہی کافی نہیں   آپ کی آواز اس پردہ سے آنا چاہئے

میرے دل میں کوئی ہمراز اور ہے   سن رہا ہوں ایک آواز اور ہے

شامِ فراق ذکرِ جوانی میں کٹ گئی   کیا رات تھی کہ ایک کہانی میں کٹ گئی

دیدار کا لطف لے دلِ بیتاب دیکھتا   ہر جلوہ مستانہ جہاں چیں بجبیں تھا
تھی آپ کے آنے کی تمنا مرے دل میں   مفہوم قیامت کا مگر ذہن نشیں تھا

مرزا ذاکر حسین ثاقب

تعارف:- ۱۸۶۹ء کو آگرے میں پیدا ہوئے ۱۸۹۸ء سے لکھنؤ میں مستقل سکونت رہی وہیں ان کے ذوق شعری کی تکمیل ہوئی اور وہیں سنہ میں انتقال ہوا۔

بڑھائے حوصلے دریا دلی نے ساقی کی ۔۔۔ ذرا سے جام میں سو بار آفتاب آیا
سنائیں کیا تمھیں نیرنگ عشق کا قصہ ۔۔۔ تمام عمر نہ آنکھیں کھلیں نہ خواب آیا

یہ خندۂ طرب نما مبارک اہل دہر کو ۔۔۔ بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا
نہ دم لے اے شریک غم تجھے قسم ہے عشق کی ۔۔۔ فلک کو چھوڑتا ہے کیوں اگر مجھے ڈبو چکا
رہے وہ دل میں مدتوں مگر سنبھل سکا نہ میں ۔۔۔ مزاج حسن و عشق کو بہت دنوں سمجھ چکا
یہ آشیانہ بستم چمن میں ہو تو خوب ہے ۔۔۔ یہ جی میں ہے کہ لے اڑوں قفس تو میرا ہو چکا

اللہ جس میں سدا ڈوبے ابھرا کیا حسن ۔۔۔ ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے خود آرائی کا
حسن کے ہاتھ بندھے تو وہ ذرا دیر سہی ۔۔۔ مجھ پہ احسان تری آئی ہوئی انگڑائی کا

جلوۂ حسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا ۔۔۔ میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا
ان کی بزم ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی ۔۔۔ نالہ کش برسوں کا اک تصویر بن کر رہ گیا

عشق میں سہل تھی فرہاد کی تقلید مگر ۔۔۔ یہ مری ہمت عالی کو گوارا نہ ہوا

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا! ۔۔۔ بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا
میں دنیا کو میخانہ سمجھا کہ اس میں ۔۔۔ کوئی ہنس رہا تھا کوئی رو رہا تھا
شب غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو ۔۔۔ جدھر دیکھتا تھا خدا ہی خدا تھا

مری داستان غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں ۔۔۔ کچھ انھیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا
کوئی بات ہے جو دل میں ترا تیر جم کے بیٹھا ۔۔۔ نہیں تو ذرا سی جنبش میں جگر کے پار ہوتا
وہ حکایتیں جوانی کی میں سن رہا ہوں دل سے ۔۔۔ جنھیں اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

تجھے اوروں کی خاطر چھوڑے جاتا ہوں میں اے عبرت ۔۔۔ مرے بعد آنے والوں کو مرا قصہ سنا دینا
مرا دل محرم اسرار حسن و عشق تھا ثاقب ۔۔۔ قرین مصلحت تھا مجھ کو دیوانہ بنا دینا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی ۔۔۔ میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا!

متاع عشق کیا ہو دل کے بعد کیا سودا ۔۔۔ کہ گم شدہ کا بھروسہ نہیں ملا نہ ملا

اس کے سننے کے لئے جمع ہوا ہے محشر ۔۔۔ رہ گیا تھا جو فسانہ مری رسوائی کا

ترا ہو کے راز کھولوں سنبھلوں تو عشق ناخوش ۔۔۔ جس حال کو میں سمجھا اچھا وہی برا تھا

سلسلہ ذکر جنوں کا آج تک باقی ہے کیوں ۔۔۔ ختم کب کا قصۂ جیب و گریباں ہو گیا
صبر عالم کے لئے کچھ چھوڑئے دست جنوں ۔۔۔ اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہو گیا

مجھ کو یقین وعدۂ فردا ضرور تھا ۔۔۔ مشکل یہ آ پڑی تھی کہ دل ناصبور تھا

جو آنکھ ہو تو دیکھیے نہ پوچھیے کہ کیا کیا ۔۔۔ چراغ بزم ہو گیا جلا کیا ہنسا کیا

کیا دیکھتا آثار سحر میں شب فرقت ۔۔۔ وہ جوش پہ آنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں ۔۔۔ ابر سیاہ جانب گلزار دیکھ کر!
کہتے ہیں دل لگی مری شام فراق کو ۔۔۔ اچھا یوں ہی سہی مگر اک بار دیکھ کر

تیرے ہوتے گل گلشن کو میں دیکھوں توبہ ۔۔۔ ابھی ایسی تو نہیں قوت تسخیر بہار
میں تو میں گل بھی ہیں جامہ دری میں مشغول ۔۔۔ سب کو دیوانہ کئے دیتی ہے تاثیر بہار

کعبہ کدھر ہے شکر کا سجدہ ادا کروں ۔۔۔ اللہ آپ آئے ہیں میرے مکان پر
میری طرح سے حال مرا ان کا خیر خواہ؟ ۔۔۔ عاشق ہے ان کی نیند مری داستان پر
آزار عشق سے کہیں گھبرا نہ جائے دل ۔۔۔ آنے لگی ہیں یاس کی باتیں زبان پر
قابو میں دل نہ ہو تو غزل کیا کہے کوئی ۔۔۔ فرمائشیں عذاب ہیں ثاقب کی جان پر

غنیمت ہے قفس فکر رہائی کیا کریں ہمدم ۔۔۔ نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں
خدا آباد رکھے ہم صفیران گلستاں کو ۔۔۔ جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہم کو یاد کرتے ہیں

عدوٗ صیاد و گلچیں کیوں ہوئے میرے نشیمن کے یہ تنکے بھی ہیں اس قابل جنھیں برباد کرتے ہیں
خود اُن کا حسن میری دادخواہی آن کرتا ہے وہ آئینہ لیے ہیں اور مجھ کو یاد کرتے ہیں

عشق میں دل گنوا کے حال یہ ہے کچھ نہیں کھویا ہوا سا رہتا ہوں
پرسش حال اُس نے کی تو مجھے یہی کہتے بنا کہ اچھا ہوں

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے
باغباں آگ دی جب آشیانے کو مرے جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے
آئینہ ہو جائے میرا عشق اُن کے حسن کا کیا مزا ہو درد اگر خود ہی دوا دینے لگے

کسی کا رنج دیکھ تو نہیں سکتا ہے کیسے نظر صیاد کی جھپکے تو کچھ کہدوں عنادل سے
چلا اے ہجوم ذرا ساز طرب کو چھیڑ دیکھیں بھی اگر دل بیٹھ جائیگا تو اٹھ جائینگے محفل سے
اُمید و ناامیدی کا بھرم ہوتا وہی جانے کہ جس نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہو ساحل سے
تڑپتے ہیں شب غم یوں کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا بتادے نامرادی کون سی باتیں کروں دل سے
غموں کے آسرے پر ہجر میں بھی زندگی تھی تب خلش بڑھتی جو یہ کانٹے نکلتے دامن دل سے

مراد و نا شب فرقت تماشا گاہ عالم ہے مگر ڈوبیں گے آخر کو یہ طوفاں [illegible]
کہیے چاند وہ چلا ہے داستاں کا رنگ محفل میں [illegible]

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے
ہجوم تمنا سے گھٹتے تھے دل میں جو میں روکتا بھی تو نالے نہ رکتے
لہو تھا تمنا کا آنسو نہیں تھے بہائے نہ جاتے تو ہرگز نہ بہتے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی ہمارا تھا کیا ٹھیک جلتا نہ رہتے
بتاتے ہیں آنسو کہ اب دل نہیں ہے جو پانی نہ ہوتا تو دریا نہ بہتے
زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
کوئی نقش اور کوئی دیوار سمجھا زمانہ ہوا ہم کو چپ رہتے رہتے

فضل الحسن حسرت موہانی

تعارف: ۱۸۶۸ء میں موہان میں پیدا ہوئے ۱۹۵۱ء میں انتقال ہوا۔

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا
اک نظر بھی تری کافی تھی پئے راحت جاں کچھ بھی دشوار نہ تھا مجھ کو شکیبا کرنا
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہے حسرت اُن سے مل کر بھی نہ اظہار تمنا کرنا

حسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

جان پر ہم نے کبھی الزام لگایا نہ کہیں یاس کو خوبیٔ تقدیر سے منسوب کیا
سخت محروم ہی کیے دل حسرت نے اگر بے وفائی سے ترے جور کو منسوب کیا

شکوۂ غم ترے حضور کیا ہم نے بے شک بڑا قصور کیا
درد دل کو تری تمنا نے خوب سرمایۂ سرور کیا
یہ بھی اک چھیڑ ہے کہ قدرت نے تم کو خود بیں ہمیں غیور کیا
آپ نے کیا کیا کہ حسرت سے نہ ملے حسن کا غرور کیا

حسن شوخی ہے اک ہمیں سے حیا اے فریب نگاہ یار یہ کیا!
اب وہ ملتے بھی ہیں تو یوں کہ کبھی ہم سے کچھ واسطہ نہ تھا گویا

رہے محو خواب ہوس اہل ظاہر گزر بھی گیا کارواں محبت
نہ سمجھا سوا حسن کے اور کوئی بیان تمنا زبان محبت
سر عجز حسرت بھی خم کیوں نہ ہوتا نرا باز ہے حکمراں محبت

بسکہ ترییب انجمن ہے جلوۂ جانانہ آج ہے سراپا آرزو ہر عاشق دیوانہ آج
یہ ہوا بے تابیوں پر نشہ کے بیکار اثر کہہ دیا سب اُن سے حال شوق گستاخانہ آج
ہے فروغ بزم یکتائی جو وہ شمع جمال آ گئی ہے دل میں بھی بیتابیٔ پروانہ آج

میں ہی اے حسرت نہیں محوِ جمالِ یار (رو گئے)
پڑ رہی ہیں نگاہیں اُس پہ مشتاقانہ آج

نہ چھیڑ اے ہمنشیں کیفیتِ صہبا کے افسانے
شراب بے خودی کے مجھ کو ساغر یاد آتے ہیں

نہیں آتی تو یاد اُنکی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اب تو اُٹھتا ہے یہی جی میں کہ اے محوِ جفا
کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں

شکوۂ جور، تقاضائے کرم، عرضِ جفا
تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں

حال کھل جائیگا بے تابیٔ دل کا حسرت
بار بار آپ انھیں شوق سے دیکھا نہ کریں

لطف کی اُن سے التجا نہ کریں!
ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں

مل رہے گا جو اُن سے ملنا ہے
لب کو شرمندۂ دعا نہ کریں

صبر مشکل ہے آرزو بیکار
کیا کریں عاشقی میں کیا نہ کریں

باقی نہیں اک تار بھی دامن میں جو حسرت
اب اہلِ جنوں فکرِ گریباں میں لگے ہیں

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اُمیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

عرضِ کرم پہ ترکِ جفا بھی نہ کیجئے
ایسا نہ ہو کہ آپ ملا بھی نہ کیجئے

اُس بے وفا سے مصلحتِ شوق ہے یہی
اپنی ستم کشی کا گلا بھی نہ کیجئے

منظور ہے جو ترکِ محبت ہی آپ کو
ہم پہ ہجومِ ناز و ادا بھی نہ کیجئے

حسرت یہ کیا ستم ہے کہ اک بت کے عشق میں
تو چاہتا ہے یادِ خدا بھی نہ کیجئے

نہ ہے نصیب جو ہو میرے حال کو بھی نصیب
وہ ابتری جو تری زلفِ پُرشکن میں ہے

ادب کا ہے یہ تقاضا کہ تیرے شوق کی بات
سنے نہ کوئی، مرے دل میں یا دہن میں رہے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے

ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے انھیں
کہتے بنا نہ کچھ وہ قسم کھا کے رہ گئے

جامہ زیبی نہ پوچھئے اُن کی
جو بگڑنے میں بھی سنور جائے

شب وہی شب ہے دن وہی دن ہے
جو تری یاد میں گزر جائے

گریۂ شام سے تو کچھ نہ ہوا
اُن تک اب نالۂ سحر جائے

شعر در اصل ہے وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائے

یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

حسن سے اپنے وہ غافل تھے میں اپنے عشق سے
اب کہاں سے لاؤں وہ ناواقفیت کے مزے

صحبتیں لاکھوں ہی بیماریٔ غم پر نثار
جس میں اٹھتے بارہا اُنکی عیادت کے مزے

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

مٹ رہی ہیں دل سے یادیں روزگارِ عشرت کی
اب نظر کاہے کو آئینگی یہ تصویریں کہیں

التفاتِ یار تھا اک خوابِ آغازِ وفا
سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ہے حسرت خام کاری کی دلیل
گریۂ مشتاق میں ہوتی ہیں تاثیریں کہیں

پہلے انھیں ہوئیں گرویدہ پھر آنکھوں کی طرح
چاہنے دل بھی لگا آپ کو دیکھا دیکھی

کہیں وہ آ کے مٹا دیں نہ انتظار کا لطف
کہیں قبول نہ ہو جائے التجا میری

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا ہے
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

چل بھی دیئے وہ چھین کے صبر و قرارِ دل
ہم سوچتے ہی رہ گئے یہ ماجرا ہے کیا

شرحِ بے مہریٔ احباب کہوں کیا حسرت
رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا

ملتے ہیں اس ادا سے کہ گویا خفا نہیں
کیا آپ کی نگاہ سے میں آشنا نہیں

شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کم اور بھی
تکلیفِ اضطراب کی شدت ہے آجکل

عہدِ یک عمرِ فراغت سے بھی خوشتر گزرا
وہ جو اک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا

انور حسین آرزو

آرزو جوش طبیعت کو ہے آزادی پسند، ہم نہ غالب کے مقلد ہیں نہ پیرو میر کے

تعارف :- ۱۲۸۹ھ میں پیدا ہوئے ۔۔۔ میں کراچی میں انتقال ہوا۔ جلال کے شاگرد تھے ۔ شاعری میں تو پایہ بلند تھا ہی زبان کے متعلق بھی انھوں نے ایسا کچھ لکھا ہے جو دوسرا نہ لکھ سکا کلام کا نمونہ یہ ہے۔

تابع شوق بھی ہیں ہم ان کے بھی ہیں اجارہ
سوچ کے خط میں کچھ لکھا آپ ہی خود مٹا دیا

اتنا بھی بار گلشن خاطر نہ ہو کوئی
ٹوٹی وہ شاخ جس پہ مرا آشیاں بنا

وحشت ہم اپنی بعد فنا چھوڑ جائیں گے
اب تم پھرو کیے چاک گریباں کیے ہوئے

جوش جنوں میں ان سے وحشی کا کھنچنا
بندا ہے ہاتھ سے در زنداں لگے ہوئے

مجھے بس چھوڑ میرے حال پہ اے شرم رسوائی
وہ دامن چاک کر بیٹھا ہوں جس پہ سنبھل بیٹھا

زبان آرزو اور ماجرائے عشق کیا کہنا
فقط بے قدر ہے اس سے کہ جھگڑا ہی برا ہے

کچھ بات کہی ہم نے نہ کچھ اس نے سنی ہے
چتون ہے کہ تلوار لیے سر پہ کھڑی ہے

رہنے دو بس ہم اپنی گرہ میں چھپائے دل لٹ گیا
اب ہاتھ ملے سے ہو کیا ہے جب ہاتھ سے ناوک گیا

جس نے یہ حالت بنائی وہ بھی آج اے آرزو
چہرہ بیمار سے چادر ہٹا کر رو دیا

کہنے کی بات ہی نہیں آہ کہیں رک گیا کہیں
لب پہ ہے کس لیے سکوت بیٹھے ہیں جھکائے کیوں

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ ادھر سے ہوئی
شمع کا شعلہ جب لہرایا اڑ کے چلا پروانہ بھی

چونک اٹھی ہے اک دنیا چیخ اٹھا ہے اک عالم
گھبرا کے اکیلے میں جب اس کو پکارا ہے

اور اسے بن تیور لو یہ لاتا ہے بجا کہہ کے مسکرانا
شکایت اس طرح سن رہے ہیں کہ جیسے ان کو بھی

کچھ کہتے کہتے اشارے میں شرما کے کسی کا رہ جانا
وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ کہنا نہ تھا جو سب کچھ کہہ جانا

موج لے ڈوبی عمر کی کشتی
آج پایا نشان ساحل کا

عادی بنا کے لذت آزار نے مجھے
غم کی خلش کو دل کی تمنا بنا دیا

جو سینے میں دل ہو تو بار محبت
اٹھے یا نہ اٹھے اٹھانا پڑے گا

وحشت انگیزی میں یکرنگی گریباں گیر تھی
جتنے دیوانے تھے سب کا ایک ہی انداز تھا

ہم کو اتنا بھی رہائی کی خوشی میں نہیں ہوش
ٹوٹی زنجیر کہ خود پاؤں ہمارے ٹوٹے

بدلی کی چھاؤں سی ادھر آئی ادھر گئی
جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا

بڑے مزے کے تھے الزام گرچہ جھوٹے تھے
پھر آج ہاں کوئی ٹکڑا اسی فسانے کا

جیسی جس کی طینت ہوگی ویسا سب کو بتائے گا
داغی آئینہ جب دیکھو دھبا منہ پر آئیگا

رسوائی مزید کا امکان نہیں رہا
ان دھجیوں کا نام گریباں نہیں رہا

شرح بربادی دل مجھ سے نہ پوچھ
ہے ترا حسن سراپا موجود

ہے نگاہ باغباں میں آج بجلی کی چمک
ہم صفیرو اپنے اپنے آشیاں کو ہوشیار

آسنگ تھی یہ جوانی کی یا کوئی آندھی
ملا کے خاک میں ہم کو گئی بہار کہاں

ان کی بے جا بھی سنو آپ بجا بھی کہو
آخر انسان ہوں میں بھی کوئی دیوار نہیں

کئی چاک ان کے ہاتھوں کے کچھ آنسو اپنی آنکھوں کے
دیا ہے جو مقدر نے لیے بیٹھا ہوں دامن میں

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

پردہ کی جنبشوں میں بھی لہریں تھیں حسن کی
جو دیکھنا تھا اہل نظر دیکھتے رہے

لپٹی ہوئی دستار کو بھی سر سے اڑی ہے
وہ گرد کہ جو اپنی ہی ٹھوکر سے اڑی ہے

افشائے راز کمان وفا امتحان صبر
آج ایک خامشی نے بڑے حق ادا کیے

اس انجمن میں کہ وسعت ہے جس کی نامحدود
نہیں پناہ کی جا ایک آشیاں کے لیے

تھا ہمیں ذکر وفا پہ آہ کرنا کیا ضرور
سادگی دیکھو کہ دل کا راز خود افشا کیا

ہر سانس ایک شعلہ ہے ہر شعلہ ایک برق
کیا تو نے مجھ کو اے طپش دل بنا دیا

اس شان عاجزی کے فدا جس نے آرزو
ہر ناز ہر غرور کے قابل بنا دیا

اشکوں سے راز کھلتا کیا خون آرزو کا
آنکھوں تک آتے آتے رنگ اڑ گیا لہو کا

چھڑی چھیڑنے کو منہ سے ہی گلے پر — مجھی سے یہ کہنا کہ جا اور ہٹالا
بھری آتے ہی کس نے چپکے سے سسکی — بدلنے لگا کہ وہ میں مرنے والا
ہر اک بات ہے آرزو کیا انوکھی — کہے جائے کہے جائے کرا بول بالا

نہ سوچا نہ سمجھا نہ دیکھا نہ بھالا — جیو تم کہ چاہا جسے مار ڈالا
اب ایسے نہ بنتے ہم کو چھیڑو تو رو دیں — بہا دیگا کوئی کلیجے کا چھالا
یہ آنکھ اپنی ساون ہے وہ آنکھ بھادوں — گیا ٹپ ہے آنسو کی پانی کا چھالا
جو کہتا وہ سنتے جو سنتے وہ کہتے — مرے بانکپن نے مجھے مار ڈالا
نہیں اور نہ بولیں وہیں اور نہ ہلیں — ذرا سی جھجک نے بڑا بوجھ ڈالا
نہ جھوٹے اس کو جانو کہ مرنا ہے ہم کو — بدل لی جو کروٹ لیا ہے سنبھالا
ملا دوں ذرا آنسوؤں کی لڑی سے — ادھر لا ادھر لا یہ موتی کا مالا
اس اندھیر نگری میں بستی نہ ڈھونڈو — جو کچھ ہے سو اپنی سمجھ کا اجالا
جسے آرزو کوئی تاکے نہ چھپنے — تجھے راج گدی ہے وہ مرگ چھالا

باتوں میں الجھا لینا اور سوجھ بوجھ نہ دکھلانا — ان سہمکنڈوں سے جاتا ہے دیکھے ہی پہچانا
ہونٹوں پہ ہنسی جب ہے آنکھوں میں کیوں آنسو — بہلانے تو بیٹھے ہو آتا نہیں بہلانا
اور بدلی ہوئی چتون بھولا ہے نہ بھولے گا — ہنستے ہوئے وہ آنا روتے ہوئے وہ جانا
کام اپنا چھری اپنی ہاتھ اپنا گلا اپنا — آنکھوں کا پھیرا لینا اور میرا سمجھ جانا
ان تیوروں میں ایسی ہیں کس کو ندی تیکھی؟ — ٹھکرا کے یہ دھمکانا دھمکا کے یہ ٹھکرانا
سر کیوں نہ پٹک دیں پھر سے آتی ہے ہنسی ان کو — اک چوٹ تو کھا بیٹھا آتا نہیں سمجھانا
بیڑا ہو پار کیا بھلا بانو خدا اس کا آسرا — کھول کے تاؤ سے چلے دھارا پہ لا کے چھوڑا

اے آرزو اتنا بھی کہتے نہیں بن پڑتا
آئے ہو تو تھم جاؤ میں جاؤں تو پھر آنا

آرزو صاحب کی خالص اردو

اس ان آنکھوں کا ہی کہنے کو ذرا سا پانی — کتنے ہی ڈوب گئے پھر بھی ہے اتنا پانی
دل سے لوکا جو اٹھا آنکھ سے ٹپکا پانی — آگ سے آج نکلتے ہوئے دیکھا پانی
کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی — جھوم کے آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی
اس ہی اس جتن میں ہوا وصل ذرا سی بھی نہیں — مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی

تڑپا جو لگی چوٹ تمہارے جاتے جاتے کی — چنچل تھی کہ بجلی کا جنم اس نے لیا تھا
وہ آرزو ابتک تو کلیجہ پہ دھرا ہے — چرکا جو بھاتی ہوئی چتون نے دیا تھا

دیکھنے کو جو ان آنکھوں کے ترس جائیگا — جی ذرا کی بھول ہو کھلا کے پھنس جائیگا
لگ سر کیا ہوا پھندا ہے حیا کا لنگا — وہ جو پیچ بیٹھے ہیں اور بھی کس جائیگا
جل سکے میں راکھ بھی ہو جائے تو کوئی نہ پوچھے — راکھ بھی آگ ہی ہے ہاتھ جھلس جائیگا
آزمانے سے تو دینے کی نہیں جی کی امنگ — پانی مرتا جو گڑھا ہوگا وہ دھنس جائیگا
سیکڑوں ڈوب گئے بوند چھلک کر نہ گری — باہر آنکھوں کے نہ ان آنکھوں کا رس جائیگا
دیکھ کر تجھ کو بناوٹ سے نہ لو ٹھنڈی سانس — بادل امڈا ہوا آیا ہے برس جائیگا
آرزو آنکھ نہیں اس کے سمانے کی جگہ — دیکھنا دھیان میں آتے ہی وہ بس جائیگا

بناوٹ کو چاہت کے سانچے میں ڈھالا — بڑی چوٹ کھائی ارے مار ڈالا
کیا کیا ہوا کیا نئی بات بگڑی — جب آنسو کو روکا اٹھا ایک چھالا
انھیں کیا پڑی ہے جو تلوار دھوئیں — لہو لال تھا اور دھبا ہے کالا
اسی کے نہ ملنے سے جی پر بنی ہے — یہ کاہے کو سمجھے مرا بھولا بھالا
لگاوٹ کی باتیں بناوٹ کی گھاتیں — اندھیرے نے پھیلا انسا دکھا کر اجالا
جو دو دو تو ہنس دے جو چپ ہو تو چھیڑے — پڑا ہوگا کاہے کو ایسے سے پالا
الہنے جو دیتے ہیں پہلے کہاں تھے — کسی نے نہ گرتے ہوئے کو سنبھالا

برج نرائن چکبست

تعارف :۔ کشمیری چکبست برہمن تھے اور چکبست ہی تخلص تھا لکھنؤ کے قدیمی باشندے تھے ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۴ء میں چوالیس برس کے سن میں انتقال ہوا۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا — اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اتر جانا

ابد کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا — دین کیا ہے کسی کامل کی پرستش کرنا

اگر درد محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا — نہ مرنے کا الم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

درد الفت آدمی کے واسطے اکسیر ہے — خاک کے پتلے اسی جوہر سے انساں بن گئے

کمال بزدلی ہے پست ہونا اپنی نظروں میں — اگر تھوڑی سی ہمت ہو تو پھر کیا ہو نہیں سکتا

ابھرنے ہی نہیں دیتی ہمیں بے مائگی دل کی — نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا

محبت بھی ہے کوئل کے درد انگیز نالوں سے — چمن میں جا کے میں پھولوں کا سینہ چاک کرتا

نئی تہذیب کے صدمے ز سر نازنے زیادہ لگو — رہے ہیں منطق کے پڑھنے میں جو سمجھے بے حیائی کے

ہوس جینے کی ہے یوں عمر کے بیکار کٹنے میں — جو ہم سے زندگی کا حق ادا ہو نہیں سکتا

اہل ہمت منزل مقصود تک بھی آ گئے — بندۂ تقدیر قسمت سے گلا کرتے رہے

وہ سودا زندگی کا ہے کہ غم انساں سہہ نہیں سکتا — نہیں تو ہے بہت آساں اس جینے سے جانا

جہاں میں ہوش کے یوں قائم ہوا اپنی بے ثباتی پر — کہ جیسے عکس گل رہتا ہے آب جوئے گلشن پر

کشش ہے امید و یاس کی یہ زندگی — اپنی ایسی ہستی سے گو اچھا تھا عدم میرا

چلتی ہے اس چمن میں ہوا انقلاب کی — شبنم کو آئے دامن گل میں قرار کیا

رنگ گل جہاں میں بوئے خاک چمن میں تھی — تازہ کرے گی ان کو ہوائے بہار کیا

بلائے جان ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے — دل حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

اذان دیتے ہیں بتخانہ میں جا کر شان مومن — حرم میں نعرۂ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بیکار ہے — رنگ ہندو دیکھ کر طرز مسلماں دیکھ کر

دل میں اس طرح سے ارماں آزادی کے — جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

میرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بیوفائی سے — وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

دوست مرنے پہ مرے داد وفا دیتے ہیں — ہائے کس وقت محبت کا صلہ دیتے ہیں

دشمنوں سے بھی مجھے ترک وفا مشکل ہے — دوست بن کر مجھے محبت و عناد دیتے ہیں

جس نے دل پیدا کیا اس سے شکایت ہے مجھے — دل سے جو پیدا ہوئی وہ آرزو بیدار ہے

ہائے اور وا عقلوں کے تو ہیں مجھے فرق اگر — کھینچ گئے ہم جس کو پاس انساں وہ کھینچ کر

خود پرستی مٹ گئی قدر محبت بڑھ گئی — ماتم احباب ہے تعلیم روحانی مجھے

ہائے اس دنیا کی پابندی عجب زنجیر ہے — خود بنتا ہے جیسے انساں یہ وہ زنجیر ہے

دیکھا سرور بادۂ ہستی کا خاتمہ — اب دیکھیں رنگ لائے اجل کا خمار کیا

رنج و راحت کا سبب دنیا میں کچھ پایا نہیں — حشر میں ہم صاف کہہ دیں گے خدا کے سامنے

مزا شباب میں ہے عمر سے خوں تمنا کا — لہو میں پھر پیر روانی ہے نہ رہتے ہے

احوال کا طلسم ہے نیرنگ زندگی — تقدیر کیا ہے گردش لیل و نہار کیا

دفتر حسن پہ مہر ید قدرت سمجھو — پھول کا خاک کے تودے سے نمایاں ہونا

خوش جمال نیا پیرہن ہستی پہنتی ہے — فقط تمہید آنے کی ہے دنیا سے گزر جانا

اپنا ہی دم ہوا ہے گلو گیر وقت نزع — غیروں کا زندگی میں ہو پھر اعتبار کیا

جس کی قفس میں آنکھ کھلی ہو مری طرح — اس کے لیے چمن کی خزاں کیا بہار کیا

جنت پہ خاک بادہ پرستوں کا حق گیا — نقشے نظر میں صحبت پیر مغاں کے ہیں

اپنا مقام شاخ بریدہ ہے باغ میں — گل ہیں مگر ستائے ہوئے باغباں کے ہیں

اک سلسلہ ہوس کا ہے انساں کی زندگی — اس ایک مشت خاک کو غم دو جہاں کے ہیں

لکھنؤ کی شاعری کا آخری دور

تعارف:۔ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنؤ کے معزز اطباء کے خاندان سے ہیں شرافت تہذیب کا معیار اور حسن اخلاق کا پتلا تھے عزیز کے شاگرد اور خود لکھنؤ کے بڑے اساتذہ میں تھے۔

جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی
کچھ انہیں سے دل دیوانہ بہلتے دیکھا

کیا حسرت دیدار ہے ہر بار یہ سمجھا
گویا کبھی دیدار میسر ہوا تھا

پوچھا اثر سے میں نے جو دل کا معاملہ
اک آہ سرد کھینچ کے خاموش ہو گیا

جو سانس ہے رکی ہوئی جو آنکھ ہے لڑی ہوئی
چھیڑا ہے آج کس نے افسانہ بیخودی کا

وہ گزرا ادھر سے جو بیگانہ وار
چراغ لحد جھلملانے لگا

اپنی وفا نہ انکی جفاؤں کا ہوش تھا
کیا دن تھے جبکہ دل میں محبت کا جوش تھا

لے لیا دل مڑ کے نہ دیکھا ادھر
جاؤ تمہارا ہی بھلا ہو گیا

صیاد نے چھوڑا دہن فسانہ گلشن
جب قصہ اسیر دل نے کیا ترک قفس کا

کوئی موسم ہو سماں ہو کہ نفیر ہو کوئی
ہم کو جب سمجھ لیا وقت فرامش ہوا

تم نے پوچھا اس طرح حال دل خانہ خراب
یاد اب کچھ بھی نہیں اب تک جو کہنے کو تھا

کبھی نصیب مائل پرسش ہوا جب بت
جو میرا مدعا تھا مجھی پہ عیاں نہ تھا

یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی
بہار سے جوش جنوں کا دیوانہ

ہوا میں کچھ دھواں اٹھ کے غبار سا پھیل جاتا ہے
قفس میں یاد جب آتا ہے میرا آشیانہ تو

میں اب سمجھے کہ دل کو سنبھالو یا کہ ٹوٹ جائے
نظر آتا ہے کوسوں سے کسی کا آستاں مجھ کو

ہم نے رو رو کے بات کاٹی ہے
آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

فریاد کا شکوہ کوئی نہیں بجلی کا سہارا کوئی نہیں
کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائے گا

ہمیں نے کہا کچھ انہیں لے کے قسم ہنستے ہیں
آپ ہی کچھ زیر لب کہہ کے خفا ہو گیا

چمن سے ہم شاخ گل کے آشیاں کو بیٹھے ہیں پھر بھی کچھ بھی
غضب ہے طائر آزاد کا بے بال و پر ہونا

کبھی رشک ہے تجھے نہ دیا کہ بیوفا ہے
وہ کسی سے وعدہ کرتا مجھے اعتبار ہوتا

اب یہ سودا ہے کہ حال ہوش میں آنے نہ پائے
کہہ دیا ان مدبھری آنکھوں نے دیوانے کو کیا

چہرے کا رنگ دیکھیے آئینے میں اثر
کہنے چلے ہیں درد دل اپنا وفا سے آپ

بھولے نہ دل سے کوئی پوچھتا
میں تجھے دل سے بھلاؤں کس طرح

آہ کس سے کہیں کہ ہم کیا تھے
سب یہی دیکھتے ہیں کیا ہیں آج

حیف مجھیں فرصت ہی نہیں ہے ورنہ کیا کیا تمنا تھی
حال ہمارا کچھ سن لیتے، کچھ حال اپنا سنتے ہم

ورنہ کبھی کی شے ہے آخر دل کو اثر سمجھانا تھا
ڈر ہے کسی تجھے اکبار دیکھ کے کاش فنا ہو جاتے

ابھی ملے کسی لطف سے پوچھا اگر کیسے ہو
بیخودی کا ہو برا کہہ دیا مجھے یاد نہیں

محبت اور اظہار محبت
یہی وہ بات ہے دیوانے نہ کہیں

وہ آئے وہ اٹھا اٹھ کے گئے کہ خفا ہو
میں ایسا یہ سمجھتا ہوں قریب بیٹھے ہیں

کبھی تھا پاس محبت اب یہ حسرت ہے
کسی کو رازداں کر لیں کسی کو غمخوار کر لیں

تجھے ہیں حال اثر انہیں سمجھا جاتا
کوئی حیلہ ہے تجھ یاد ستم ہو کہ نہ ہو

نظر سے گزشتہ دامن تماشا ہے
معاذ اللہ کوئی کیا کیے ایسے بیتابی کو

دل وہی دل ہے کہ جس کی زندگی ہو اضطراب
غم وہی غم ہے کہ تم سے بھی مسیحا نہ ہوا

اسیر صورت کوئی نہ دیدہ تر ہو جائے
دل یہ جو گرے گر اس کی خبر ہو جائے

آستاں تو کہاں در ہیں قسمت میں
اور اک سجدہ سر پا گر رہ جائے

کچھ کلام ہی سہی رشک سے مر رہا ہوں میں
کیوں کہوں بات بات پہ دیکھو بھلا نام ہے

پھر تمہیں فرصت نہ ہوگی آپ میں نہ ہوں
یہ بتاتے جاؤ میرے حق میں کیا منظور ہے

دیکھو نہ آنکھ بھر کے کسی کی طرف کبھی
تم کو خبر نہیں جو تمہاری نظر میں ہے

جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں
یا گجے پھول ترے بستر کے

تم ابھی کچھ تھے ابھی ہو کچھ اور
دیکھ لینے دو ذرا جی بھر کے

ہنگامۂ ہستی کی بس اتنی حقیقت ہے
اک موج اٹھی ہوا تھم کر پھر مل گئی دریا سے

بسمل گر نیاز میں وہ بھی گناہ ہے
اک جنبش لب شوخ تمنا کہیں جسے

سخن ناآشنا رکھا کسی کی بزم میں مجھ کو
کبھی تہذیب مجلس نے کبھی ترتیب محفل نے

وہ میں نہیں رہا ہوں وہ دل نہیں رہا ہے
کیوں چھیڑ کے مجھ کو روتا ہے اختیار آئے

شکوے تھے صرف لذت گفتار کیلئے
مت جاؤ روٹھ کے نہیں بیکار کیلئے

آتا ہے ایک رنگ تو جاتا ہے ایک رنگ
وہ آئے تھے وہ پرسش بیمار کیلئے

وہ بیوفا ہیں کہ ہم بیوفا خدا جانے
خیال ختم ہے اور ان کی آمد آمد ہے

ایک سجدہ بھی زیادہ عشق میں جائز نہیں
ورنہ آلودہ نہیں بندگی ہو جائیگی

اس قدر بے اعتباری پر ہے اتنا اعتماد
ہو نہ یہ تیرے وعدے میں عجب تاثیر ہے

اک روز دل میں تیری محبت تھی جاگزیں
اب تو ہی تو ہے تیری محبت نہیں رہی

میں کیا سناؤں درد محبت کا ماجرا
حد ہو گئی کہ ہم سے شکایت نہیں رہی

وہ بدگماں ہیں میری خموشی سے اور بھی
مرتا ہوں حرف شوق مکرر لیے ہوئے

اچھا ہوا عشق کھا کے گرے حضرت ہوش
اب ہوش میں رہنے کا تو الزام نہیں ہے

ہوش رہتا ہے بس اتنا دم تحریک جنوں
جیب چھپنے لیے جاتا ہے گریباں کوئی

خاکستر پروانہ میں بھی آگ دبی ہے
اے باد صبا دیکھ کے دامن کو ہوا دے

کچھ ہوش میں آنے کی مرے شکل نہیں ہے
یہ میں بھی سمجھتا ہوں مجھے ہوش نہیں ہے

آیا تھا کچھ خیال کہ دنیا بدل گئی
کیا سترح ہے شیائی دنیا کرے کوئی

یہ حال ہے کہ کچھ نہیں آتا نظر مجھے
اے شوق دید اب نہ پھرا در بدر مجھے

قاصد پیام ان کا نہ کچھ دیر بھی سنا
رہنے دے محو لذت ذوق خبر مجھے

کلبِ احمد ماتی جائسی

مولانا کلب جعفر صاحب کے فرزند اکبر خان بہادر کلب عباس صاحب کے برادر حقیقی جائس میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں زیادہ قیام رہا۔ اپنے زمانے کے صاحب نظر شاعر تھے۔ زمانہ نے ان کی صلاحیتوں سے انصاف نہیں کیا۔ ۱۸۹۷ء ولادت اور ۱۹۶۲ء میں وفات ہوئی۔

چھٹے مایوس کسی کو نہ پکارے کوئی
خوش رہے جی کے امیدوں کے سہارے کوئی

مل تو جاتی ہے مرے نالۂ خاموش کی داد
دل تک آواز تو آجاتی ہے بارے کوئی

التفات نگہ دوست میسر نہ ہوا
زندگی یوں بھی تو بے کیف گزارے کوئی

متصل یاد کبھی حسن میں ہو عرض نیاز
سمجھے اس ناز مسلسل کے اشارے کوئی

آج ہے قہر کا طوفان لب ساحل آئی
شاید آ لگے گی ناؤ کنارے کوئی

ہر ادا آپ کی تھی پیام کرم
یہ قصور نظر نہ سمجھے ہم!

موت تھی نامرادی پیہم
جی رہا ہوں بہ اعتقاد کرم

کون محفوظ ہے تشبیہ سے
نہ یہ عالم نہ دوسرا عالم

بے تکا نے ہوئے ہزار احسان
دیکھنا شان احتیاط کرم

رنج و راحت سب اعتباری ہیں
ہم جہاں خوش ہیں تم وہاں پر غم

دل ہے تفصیل کے لیے بے تاب
تو نے کیسی نگاہ کی مبہم

در پہ شانی میں سر گراتا کیوں
بیم یاس ہے امید کرم

امیدیں جو حد امکاں سے آگے دل میں پلتی ہیں
چھلکتی ہیں تو پیمانے کو ہونے کو چلتی ہیں

محبت ہو کہ حسن اک سوز یکساں کارفرما ہے
نہیں موقوف پروانوں پہ شمعیں بھی تو جلتی ہیں

رفاقت اور شے ہے دوستی یا دشمنی کیسی
جہاں جاتا ہوں میں ناکامیاں بھی ساتھ چلتی ہیں

نگاہ منتظر آخر نگاہ واپسیں ٹھہری
محبت میں تمنائیں بھی کیا شکلیں بدلتی ہیں

وہ تربت پر آئی ناکامی پیہم سے
مرادیں خندہ زن ہیں دل پہ گویا تیر کی

دنیا میں کشمکش کی کوئی انتہا بھی ہے
جز مقدرات بھی قیدِ وفا بھی ہے

کیسا ہراس شورشِ طوفاں سے ناخدا
تو ہی نہیں محافظِ کشتی خدا بھی ہے

چھوڑا رہِ طلب میں جو امید نے تو کیا
میرا رفیق اک دلِ بے مدعا بھی ہے

ساقی، ادھر نگاہ تو کر جام دے نہ دے
اس تیری بزمِ عیش میں اک بے نوا بھی ہے

کچھ تو ازل سے روح و محبت میں ربط تھا
کچھ کارسازیِ دلِ درد آشنا بھی ہے

کیا شانِ کردگار ہے ضدیں ہیں جمع ہیں
عشق ایک دردِ زیست بھی ہے اور دوا بھی ہے

تسکین یاس میں ہے مگر یاس ہی کہاں
مانی ابھی تو حشر کا اک آسرا بھی ہے

دعوائے عاشقی بجا ہے لیکن گلہ بھی ہے
حالانکہ شرطِ عشق و محبت وفا بھی ہے

تقدیر نارسا بھی دلِ مبتلا بھی ہے
شکرِ خدا لب گلہ ناآشنا بھی ہے

آسانیاں کہاں رہِ پرخارِ عشق میں
رہرو کا یار دوش اگر مدعا بھی ہے

پاؤں کا دادِ غم یہ فقط آس ہی نہیں
دل کو یقینِ وعدۂ صبر آزما بھی ہے

اک میرا آشیاں نہیں باغ ہے وہی
گل بھی ہیں بلبلِ گل بھی لوٹ بھی صبا بھی ہے

تفریح کیلئے کہوں کیا داستانِ غم
کچھ تم کو دردِ دل کا ذرا اعتنا بھی ہے

جاتے ہو بے یقین منزل ہوں گا مگر
یعنی کہ مدعا بھی نہیں ہے دعا بھی ہے

دشوار ہو کہ سہل یہی ایک راہ ہے
دنیا میں زندگی کے سوا راستا بھی ہے

قادرِ امتحاں ترا آتی یہ وہم کیوں
بزمِ وفا میں کوئی تجھے پوچھتا بھی ہے

مے سے توبہ حرام ہے اب تک
دستِ ساقی میں جام ہے اب تک

موت کیا ختم کرتی قصۂ غم
داستاں ناتمام ہے اب تک

کس کا اک حرف تھا وہ صبحِ ازل
وہی زورِ کلام ہے اب تک

واعظا چپ بھی رہ کہ دل میں مرے
کچھ ترا احترام ہے اب تک

چل بسا محتسب کی روش پہ عشق
شورِ محشر حرام ہے اب تک

جلوہ یوں ہی رہے گا نامحدود!
جس طرح ناتمام ہے اب تک

ابھی کافر نہ کہیئے مانی کو!
قصدِ بیت الحرام ہے اب تک

جنوں مجھے تو کوئی دادِ ہوش کی نہ ملی
وہ بے خودی بھی گئی اور آگہی نہ ملی

کجا وہ خلوتِ راز انتہائے راہِ نیاز
سرے سے ہم کو تو راہِ نیاز ہی نہ ملی

تو کیا ہوا جو کٹی زیست وقفِ غم رہ کر
جو ان کا زخم ہے وہ فسردگی نہ ملی

ہزار سادہ ہو تلنے ہیں بے وفائی کے
وفا کے رنگ میں تصویرِ آدمی نہ ملی

سوائے عظمتِ آفاق کیا ہے اس کیلئے
جسے تمہاری تمنا سے روشنی نہ ملی

کچھ اپنے بس میں نہیں ہے قیدِ وجود سے چھٹنا
نہیں تو سعی سے راہِ فرار بھی نہ ملی

رہِ حیات میں کافی سمجھ رفاقتِ غم
خوشی کا ذکر ہی کیا ہے ملی ملی نہ ملی

کبھی ادا نہ ہوئے ہم سے آستاں کے حقوق
جبیں ملی بھی تو شایانِ بندگی نہ ملی

بدامانِ حقیقی یہ خم ہے سر مانی
جہاں میں اور کہیں جائے امن ہی نہ ملی

حاصل نہیں یہاں وہ جنہیں ہے ان دنوں
ہر آرزو ماسوا سے دل دنیا ہے ان دنوں

منزل کے پاس عشق چلا آیا ہے ان دنوں
دل میں بھی عزمِ ترکِ تمنا ہے ان دنوں

تکلیفِ ضبطِ راز گئی ساتھ ہوش کے
الفت جنوں کی شکل میں رسوا ہے ان دنوں

دیوانہ ہوں خزاں میں بھی آ دیکھ او لیلیٰ
یعنی ترا جنوں بھی تمنا ہے ان دنوں

یہ غم ہے جس جہاں میں دیں عشق بھی تو دیکھ
دامِ فریب پر نظر آیا ہے ان دنوں

امید اب تو ہے کہ بھر آئیگا زخمِ دل
توفیقِ شکر صرف مداوا ہے ان دنوں

مانی جو وقت بیت گیا اس کو بھول جا
یہ بھی تو وقت ہے جو گزرتا ہے ان دنوں

محویت یہ ہو کہ پھر ہوش میں آ ہی نہ سکوں
سر ترے در پہ جھکا دوں تو اٹھا ہی نہ سکوں

غم کو اندازِ تبسم میں دکھا ہی نہ سکوں
یہ تو شکوہ نہیں لب تک جسے لا ہی نہ سکوں

سجدے کرتے ہیں مجھے ورنہ ترا نقشِ قدم
نقشِ تقدیر نہیں ہے کہ مٹا ہی نہ سکوں

لکھنؤ کی غزل کا ایک اور طرز

(سلام)

لکھنؤ میں غزل کی ایک قسم سلام بھی ہے میر انیس نے اپنے نواسے رشید صاحب سے کہا تھا کہ ہماری غزل ہمارا سلام ہے۔

محمد جعفر صاحب امید نے غزل میں جو اصلاح تجویز کی تھی یعنی رندی و شاہد پرستی کے مضامین واعظ و ناصح کی تضحیک، حضرت خضر کی عمر، حضرت عیسیٰ کا معجزہ، حضرت یوسف کے حسن کی تشبیہ سے اجتناب، معشوق کو حالت اطلاق میں رکھنا اسی کو حالی نے اپنے نام سے مقدمہ شعر و شاعری میں اصلاح غزل کے عنوان سے پیش کیا تھا مگر وہ دونوں اس رنگ میں اچھے شعر نہ کہہ سکے اور یہ اصلاح مردود و متروک ہو گئی مرثیہ گویوں نے اسے معراج کمال تک پہنچایا انھوں نے سلام کو غزل بنا لیا۔ ابتدا میں سلام کی وضع یہ تھی کہ مطلع بطرز سلامی سلام یا السلام سے شروع ہوتا اور مقطع تک فضائل و مصائب کی فضا قائم رہتی تھی مرثیہ کی ترقی کے ساتھ سلام کو بھی ترقی ہوئی مطلع میں سلامی یا سلام شاذ و نادر رہ گیا اور غزل کے مضامین سوائے رندی و اوباشی کے داخل کر دیے دو ایک شعر واقعہ کربلا کے متعلق ضرور ہوتے تھے اس کی وجہ بتلا رہا ہے کہ ہر شاعر غزل سے اپنی شاعری کی ابتدا کرتا ہے۔

جو شاعر غزل اور مرثیہ دونوں کہتے رہے انھیں چھوڑ کے جن شعراء نے غزل ترک کر دی انہوں نے اپنی غزلوں کو سلام بنا لیا۔ غزل کے سنجیدہ شعر سلام میں آ گئے جس طرح امید اور حالی چاہتے تھے مثال میں میر انیس کو دیکھیے ان کی غزل ہے۔ ع

اشارے کیا نگہ ناز دلربا کے چلے
جب ان کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے

پکار کہتی تھی حسرت سے نعش عاشق کی
صنم کہاں ہمیں تم خاک میں ملا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے

مثال ماہی بے آب موج تڑپا کی
حباب پھوٹ کے روئے جو وہ نہا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

رہی غرور سے نفرت سیاہ کاروں کو
قلم کی طرح چلے جب تو سر جھکا کے چلے

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا
انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

انیس نے اس غزل کو یوں سلام بنایا۔

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے

مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے

خیال آ گیا دنیا کی بے ثباتی کا
چلے جہاں سے جو اصغر تو مسکرا کے چلے

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

خرام اسپ شہ دیں دیکھئے تو ہم تشبیہ
کہاں ہے کبک دری چال جو بنا کے چلے

ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا
انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے

حسین کہتے تھے وا حسرتا علی اکبر
بہار باغ جوانی ہمیں دکھا کے چلے

ملک پکارے کہ الٹا زمیں کا طبقہ
حسین فوج پہ جب آستیں چڑھا کے چلے

اس میں تین عشقیہ شعر حذف کر کے بقیہ تین شعر بڑھائے ہیں۔

اس غزل کو سلام بنانے کے لئے انیس نے بقیہ اشعار زیادہ لکھے ہیں لیکن

بعض میں ایک آدھ شعر عشقیہ بھی ہے جیسے ؎

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں — وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں
کبھی برا نہیں جانا کسی کو اپنے سوا — ہر ایک ذرہ کو ہم آفتاب سمجھے ہیں
کرم مجھ کو عطا کم وہ فقر دنیا میں — کہ فخر سلطنت آپ سمجھے ہیں
بگولے کھاتے ہیں [illegible] زمیں تا فلک کو وہ — اسی ابرو کو جو موتی کی آب سمجھے ہیں
ابوترابیہ کے در کا ہے ذرہ ذرہ سجدے — ہم آسماں پہ جسے آفتاب سمجھے ہیں
یہ اشک تاک ہے کہتے ہیں جسے اہل طرب — یہ عرق گل ہے جسے ہم گلاب سمجھے ہیں
شباب کھو کے بھی غفلت وہی ہے پیری میں — سحر کی نیند کو بھی شب کا خواب سمجھے ہیں
جھکائیں سر کو نہ کیونکر عراق کے فصحا — سوال شاہ کو سب لاجواب سمجھے ہیں
خدا کی راہ میں ایذا دے جن کو راحت — زمین گرم کو وہ فرش خواب سمجھے ہیں

انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو
اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں

اس سلام میں تین شعر تو ایسے بھی ہیں جیسے غزلوں میں بھی ہوتے ہیں صرف آٹھواں شعر ایسا ہے جو غزل کا ہی ہے۔

ان کے سلام میں بہت سے شعر ایسے ہیں جن میں غزل کا رنگ پوری طرح موجود ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل کا شعر ہے جیسے ؎

بلبلیں دم بھر جدا ہوتی نہیں — کس گل تر کے گلے کا ہار ہوں
کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر — کہ ٹوٹتے ہیں یہ شیشے صدا نہیں دیتے
خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم — انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو
پڑھیں گے وہ نہ [illegible] کم سخنوں کو — خیال صنعت صانع ہی پائمالیوں کو

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں — ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا
نہ جانے برق کی چمک تھی کہ شرر کی لپک — ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا
کور ہوتیں اس کا جلوہ دیکھ کر — شکر ہے آنکھوں کا پردہ رہ گیا
کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دیدے — فقیر ہوں پہ نہیں عادت سوال مجھے
قناعت نے گھر آبرو دی دے [illegible] — ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا جیب لگتے
ہمیں تو دیتا ہے رازق بغیر منت خلق — وہی سوال کریں جو خدا نہیں رکھتے
نہ پھیلائیو ہاتھ ہرگز انیس — فقیری میں بھی بول تو نگر رہے
کنج عزلت میں مثال آسیا ہوں گوشہ گیر — رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لئے
قطع امید ایک دولت ہے اگر کوئی سمجھے نہیں — اور کچھ ساماں کرے گا خدا میرے لئے
در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے — سر جہاں رکھتے ہیں واں ہم قدم رکھتے نہیں
جو مقدر ہے وہ ملتا ہے تری سرکار سے — ہم ہیں عالم کچھ خیال بیش و کم رکھتے نہیں
لحد میں سوئے ہیں چھوڑا ہے شہ نشینوں کو — قضا کہاں سے کہاں لے گئی مکینوں کو
زمانہ ایک طرح پر کبھی نہیں رہتا — اسی کو اہل جہاں انقلاب کہتے ہیں
فقیروں کی کیا موت کیا زندگی — جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے
نشست و شو سے گو ہوا اجلا ازل — جامۂ اصلی میں دھبا رہ گیا
اسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا — اسی کی شان نظر آ گئی جدھر دیکھا
ہر نفس آئینۂ دل سے یہ آتی ہے صدا — خاک ہو جاؤ تو حاصل ہو جلا سینے کو
بھیجے جنت میں یا دوزخ میں الٰہی تو — تو ہے عادل جو مناسب ہو سزا میرے لئے
فقیر دوست جو ہے مجھ کو سرفراز کرے — کچھ اور فرش بجز بوریا نہیں رکھتے
انیس مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو — اسی زمین کو ہم فرش خواب سمجھے ہیں
خاک ساری نے دکھائیں رفعتوں پہ رفعتیں — اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

رات اندھیری ہے سفر اعمال اپنے ناروا
قبر میں بھی چین سے انسان سو سکتا نہیں

کار ذاتی سے میں عاجز ہو گیا اور جہاں
گرد اپنے منہ کی پانی آپ ہو سکتا نہیں

سوؤ گے کب تک بس اب اٹھو انیس
دن بہت غفلت میں سو کر کھو دیا

جو سمجھتے ہیں مال دنیا ہے خالی ان کے ہاتھ
اہل دولت جو ہیں وہ دستِ کرم رکھتے نہیں

دیکھنا کل ٹھوکریں کھاتے پھریں گے انکے سر
آج نخوت سے زمیں پر جو قدم رکھتے نہیں

تشنہ جاں تک رہے کہ ہم پیاسے ہیں جان دے چکے
عاقبت جن کے ہوا میں کو پاؤں رکھتے نہیں

عالم فانی میں کیا تم کو ملا
اور کچھ اپنی عمر سے کھو گئے

عالم پیری میں یہ غفلت انیس
رات بھر جاگے سحر کو سو گئے

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری سے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

غلط ہے لفظ یہ بندش میں سست یہ مضمون
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو

غریب ہم آئے کہاں کہاں کھو کے
تمام عمر ہوئی جب تو اپنا گھر دیکھا

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیس
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

کچھ انیس ہی پر موقوف نہیں تمام مرثیہ گویوں کے سلام ایسے ہی ہیں اگر مرزا دبیر کے سلام غزل کی طرح چھپنے لگ جائیں تو ایک دفتر ہو جائے گا۔ اس لئے ہم صرف انیس کا کلام پیش کرتے ہیں یہ ایک بہت اعلیٰ اور سنجیدہ غزل کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

رباعی

رباعی کی مخصوص بحریں ہیں اور مضامین بھی بہت حد تک محدود ہیں لکھنؤ میں مرثیہ گویوں نے اسے بام عروج تک پہنچایا اور اس کا بھی اتنا ذخیرہ ہے جو غزلوں سے کم نہیں ہے چند رباعیاں سنئے۔

یارب خلّاقِ مہر و ماہی تو ہے
بخشندۂ تاج و تختِ شاہی تو ہے
بے منت و بے سوال و بے استحقاق
دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی تو ہے

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

گر لاکھ برس جیے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے
غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

وہ موج حوادث کا تھپیڑا نہ رہا
کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی تک انیس
جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

سایہ سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں
جو دام سے بچ گیا ہے وہ دانہ ہوں
دیکھا نہیں جس کو اس کا عاشق ہوں انیس
جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تو
قربت رگِ جاں سے اور اس پہ یہ بعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

قصیدہ

دورِ اوّل کے شعراء یعنی ناسخ و آتش نے کوئی قصیدہ نہیں کہا۔

دورِ دوم میں ناسخ کے شاگرد فقیر محمد خاں گویا نے پانچ چھ قصیدے کہے ہیں مگر انھیں قصیدہ کہنا مشکل ہے۔

آتش کے شاگردوں میں نواب سید محمد خاں رند نے ایک بلند پایہ قصیدہ لکھا ہے جس کی تشبیب یہ ہے:۔

حسن بہروپیے پہ کچھ عارضِ گل ہی منحصر — رنگ سے خارستاں سبزہ ہو جیسے حضور
فیض سے بادِ بہاری کے کریگا اسرار — آہ بلبل کے تحیر سے گل تا تیر ظہور
قوت نامیہ کے نشوونما کے باعث — دانۂ اشک بھی سر سبز اگر ہو گیا دور
پشت طاؤس بنا ہے یہ اب کے مو — دامن بادِ صبا سبزہ رنگ سے معمور
جو بھی جوشِ نضارت کا زمانے میں رہا — کیا عجب زخم کا بھی سبز اگر ہو انگور
لعل سے رنگ زمرد کا گیا ہے پیدا — سبز زنگار کے مانند ہوا ہے کافور

دورِ سوم میں منشی اسمٰعیل حسین منیر نے ایسے قصیدے بھی کہے ہیں۔
جن کا مثل نہیں خاص طور پہ ایک قصیدہ تو ایسا ہے جیسا سودا، ذوق، غالب اور مومن بھی نہ کہہ سکے اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ مولوی فضلِ حق خیرآبادی اور منیر دونوں کو عبور دریائے شور کا حکم ہوا وہاں دونوں ایک ساتھ رہتے تھے

ایک دن مولانا نے منیر سے کہا کہ مصطلحاتِ نجوم اور کتابیات فرس کیوں نظم نہیں کیے جاتے یا تو اردو اسکی متحمل نہیں یا تم میں کوئی اس پر قادر نہیں سودا نے قصیدے کہے مگر وہ بھی اس راستہ پہ نہ چل سکے۔

منیر نے پہلے تو کچھ دشواریاں بیان کیں مگر مولانا اپنی بات پر اڑے رہے آخر منظور کیا اس کے بعد ایک قصیدہ امام حسن علیہ السلام کی مدح میں کہا جس کی تشبیب میں یہ ...

قصیدہ امام حسنؑ کی مدح میں

اتنک زلیخا ہوئے بحر صفت جوش زن — غرق ہوا نیل میں یوسفِ گل پیرہن
آل مہ و زہرہ تازہ حنا بند گئی — ابرو زوال زری نیل کمیت تہمتن
چاہِ سیہ میں گرا یوسفِ زریں قبا — دیو سیہ ہو گیا شاہد پروین پرن
بال بشہ نیمروز بسکہ ہوا کم بہا — زنگیوں کے بالوں سے بدلی ہنری کرن
خیمہ زر بافت میں لیلیٰ مشکیں لباس — زینت قالین سیر شمع مرصع لگن
پنجہ کفِ الخضیب شانۂ گیسوئے شب — سرمہ چشم نجوم مشک غزال ختن
خندہ دنداں نما زنگی شب نے کیا — تختِ سلیماں ہوا تکیہ گرا ہرمن
گنبدِ فیروزہ میں چھوٹ گئے تابوت — دخترِ کاں نسیم بھرنے لگیں خندہ زن
لالہ داغ پلنگ تھی شفق آسماں — دیکھا وہ رج رقیب کیک ہوا سینہ زن
خسروِ اقلیم چین قصرِ ششم میں مکین — ہندو بالانشین صرفِ بت و برہمن
ترکِ کماندار نے تیر کیا زیب قوس — زینتِ دستِ سماک نیزۂ خاور شکن
دیدۂ زمرد نگار منظرِ اختر شمار — کرنے لگا آشکار صورتِ صد ...
صوفی ازرق لباس لیتی لنگ میں نئے — اوڑھے البلاس پوش شاہد بابلِ ذہن
نظم نظامی ہوئی خمسہ حسرت زدہ — فکرِ بلالی بنے اختر بدبختِ سخن
تیر شہاب و شعاع خوب چلے دیر تک — ناوک ارجن ہوا مرکز کا فنر کرن
خوشہ کے ہر دانہ نے پائی یہ نشوونما — بڑھ کے ہوئے نخلِ طور مثل خیار ہن
تا جگر تیر سرخ ناوک دندان فیل — سر جدہ بیاض آگئی تا مجلی ...
آئینہ خاوری چشمۂ بے آب تھا — حلقۂ سیمیں ہوا شمع سر انجمن
جلوہ گر بام سبز طائر سیماب گوں — زاغ سیہ کا شکار مرغ سحر ...
خضر زمرد لباس صاحبِ ست اقلیم — زیبِ مصلائے سبز ولیِ بابل وطن

دور سوم میں امیر مینائی نے دو قصیدے کہے انہیں نظم کہنا زیادہ صحیح ہے ہاں مولانا علی حیدر نظم طباطبائی اور مرزا رسوا نے بہت زوردار قصائد کہے مرزا رسوا کا کوئی قصیدہ ہمارے پاس نہیں نظم طباطبائی کے ایک قصیدے کی تشبیب ملاحظہ ہو ؎

کیا اشارے کر رہی ہے دیدۂ چشم روزگار — کیا اشارے سے بتا رہا ہے الجھی لیل و نہار
پردۂ ظلمت سے نکلا روئے سلمائے سحر — ناز گردوں کی کھینچی لیلیٰ شب نے مہار
ہے شفق یا دادِ دیدۂ فیروزہ گوں میں لالہ زار — ہے سحر یا سبزہ زار آسماں میں انتشار
چاہ سے نکلے ہیں یوسف یا نکلا ہے تار صبح کا — یا کھلا گوش زلیخا میں ہے دُرِّ شاہوار
آفتاب آیا نظر زیر گریبانِ افق — ہو گئی غائب شب یلدا ہوا صبح آشکار
آتش افروزی جو کی مشرق میں صبح سحر نے — ہو گیا مغرب میں پنہاں ساقی دار
شعبدہ گر نے یہ کی افسوں گری — مہرہ مشرق میں اگل کر
یہ سحر ہے یا کہ ہے رنگِ رخ عذرائے چرخ — یہ شفق ہے یا کہ ہے خون رگ ابر بہار
ہو گیا فیض سحر سے چہرۂ گردوں جگر — بن گئی لطف ہوا سے کہکشاں بوٹوں کا ہار
حور کا دست نگاریں ہے کہ ہے کف — آرسی ہے یا نظر آیا ہے یہ رنگ عذار
خوشۂ گندم ہے یہ یا سندل کف عذرا صبح — گوندھنے کی ہاتھ میں لی ہے زلف
جس کا جلوہ دکھاتی ہے یہ صبح جانفزا — جس کے گھونگھٹ سے سفیدہ صبح کا ہے آشکار
الشمس اس کے زیر پا ہیں شعلیں نور کی — نکلی ہے چادر سے آب زر کی یہ عذار
چشمۂ خورشید میں غوطہ لگا کیا ہے یہ پھیر — گنبد نیلوفری پہ کوئی دم لے کر قرار
آنکھ ابھی جو تماشا تھی کہ کچھ کر گئی — جلوۂ انجم ہو گا یا رقص شرار
صبح ہوتے خیمۂ زنگار گوں آیا نظر — تھا طلسم سیمیائی گنبد گوہر نگار
ہو گیا لشکر یہ غالب ایک ترک نیزہ دار

پھینکتا ہے بام گردوں پر کمند اپنی کرن!
کرتا ہے تیر شعاعی طائر نظرہ شکار

اس دور کے شعرا میں آرزو صاحب کا قصیدہ مجھے نہیں ملا۔ ایک صاحب نے عزیز و محشر کے قصائد کا مجموعہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر کئی تقاضوں کے بعد بھی ان کا وعدہ پورا نہ ہوا بقول مولانا صفی ؎

وعدے میں حاتم ہیں جب دینا پڑے قارون ہیں

ایک صاحب کا میں شکر گزار ہوں کہ انہوں نے زحمت اٹھا کے اور جیب سے خرچ کر کے عزیز و محشر کے ایک ایک قصیدہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی عنایت فرمائی یہ انتخاب اُن کا ہے اگر مجھے وہ دیوان دیدیتے تو میں عزیز کا وہ قصیدہ پیش کرتا جس کے مطلع کا دوسرا مصرع یہ ہے ؎

لہو کچھ بڑھ گیا جب فصد دیوانوں نے کھلوائی

اور محشر صاحب کا وہ قصیدہ پیش کرتا جس میں جنگ خیبر نظم ہے اور براعت استہلال میں مطلع یہ ہے ؎

رہا بیدار کس کی گرمی محفل سے یہ شب بھر — نہ چشم رمد آلود نکلا خسرو خاور

یہ ان کا شاہکار ہے اور اردو میں اس کا جواب نہیں مجبوراً اپنے کرم فرما کا انتخاب پیش کرتا ہوں۔

دور آخر کے شعراء میں مرزا جعفر علی خاں اثر نے بھی بڑے زوردار قصیدے کہے ہیں مگر مجھے دستیاب نہیں ہوئے۔ انشاء اللہ آئندہ اڈیشن میں یہ تمام خامیاں دور ہو جائیں گی۔

٭ ٭ ٭

مولانا صفی کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ میرے پاس ہے جو پیش کرتا ہوں۔

قصیدہ مدح امیر المومنین علی ابن ابی طالب

جلوہ گر حسن ہیں شکر ہے کردگار کا
پھر رہی ہے چشم شوق میں [illegible] کسی ندی کی
شوخی نگاہ ناز سے مستی عشق [illegible]
شمیم زلف آدھر ہی کمند [illegible]
جوش جنوں کی منزلیں [illegible] لے کے سر قدم
منظر کو دیکھ کر [illegible] گھونٹ لہو پیے
اہل نظر کی آنکھ سے خون جگر [illegible]
خاک نشین راہ عشق [illegible] تو لطف تھے
چھالے ابھی [illegible] دامن لگی ہے پھر چلے
دیر سے تا بہ میکدہ [illegible] کہاں ہیں [illegible]
صحن حرم میں [illegible] بقصد
سو حبیب کبریا دیکھ رہا ہے کوئی [illegible]
چوس رہا ہے دیکھنا کون زبان رسول کی
بنت اسد کا لاڈلا ختم رسل کی گود میں
یہ جو ہنس کے آج باندھا ہے [illegible]
کھلتے ہی [illegible] مراد [illegible]
گلشن ہاشمی کا پھول آس کے [illegible]
جس کا چھوؤں کو جس طرح چومتے ہیں مصطفےٰ
[illegible] عصائے موسوی [illegible] اژدہا
بازو دل پہ پھر ابھر [illegible]

ہم جو [illegible] سرک گیا پردہ حریم یار کا
دور چلا رگوں میں خون پھر دل بیقرار کا
دل پہ فریب چل گیا نرگس پر خمار کا
کس سے کہوں کہ ابھی نہیں [illegible]
[illegible] لیا [illegible] کا
سلوہ جنون عشق [illegible] ابتہار کا
نقش مراد دیکھ کر گشتہ انتظار کا
ایک [illegible] بندھا ہوا [illegible] فلک غبار کا
چل کے [illegible] گئے [illegible] ہزار کا
نوبت لئے پھر ہیں شوق [illegible] کا
پھر لے لگا نگاہ میں میکدہ چشم یار کا
آنکھوں میں خط کھنچا ہوا [illegible] کا
ذائقے لے رہا ہے کون [illegible] کا
پھینک رہا ہے ہاتھ پاؤں [illegible]
فتح کرے گا کل یہی معرکہ گیر و دار کا
پھول ہے کس چمن کا یہ [illegible] کا
جانتا ہے جو [illegible] کا
[illegible] ایک دن [illegible] ذوالفقار کا
پہلے ہی امتحان [illegible] قوت شیر خوار کا
ہمت شکنی کا ولولہ حوصلہ کارزار کا

[illegible] وجود [illegible] ہی [illegible]
دنگلیوں کی [illegible] ایک نور [illegible]
شیر خدا کے سامنے لائے گی گھر کا [illegible]
سحر کرم وہ ہاتھ ہیں جس کی سخا کے جوش کو
شان بتان آزری مائل [illegible]
گھر میں خدا کے [illegible] کی ہے خدائی [illegible]
دیکھو یہی قدم ہیں وہ جو سر دوش مصطفےٰ
جلوہ [illegible] کا آئینہ جا بجا نظر
شجرہ طیبہ ہے ایک جس کی [illegible] ڈالیاں
مصلحۃً رسول جب [illegible] گئے [illegible]
بحث نصیریوں سے کیا [illegible]
ماہ رجب کی تیرھویں یوم ولادت امیر
ساقی ناز مست ہاں دور چلے [illegible]
مست پھر رہے ہیں [illegible]
دام نظر وہ جا بجا [illegible] میں [illegible]
[illegible] جو گوش ہیں سنتے ہیں [illegible]
دیکھئے سبزہ [illegible] دیکھ کے [illegible] ہیں مست
دیکھئے آگ [illegible] آتش و آب [illegible]
بادہ کشان انجمن جوش طرب سے نعرہ زن
[illegible] شیر حق مست لا الہ [illegible]
دشمن [illegible] دوائی بہار

ناخنوں میں چھپا ہوا زخم کشود کار کا
در کو اکھیڑ لیں اگر در نہ کھلے حصار کا
خیبریوں کو دو خبر حفظ کریں شکار کا
روک سکا نہ سلسلہ ناقۂ صد قطار کا
دیگا انھیں یہی سبق ایک دن [illegible] کا
بت شکن آ گیا تو راستہ لو فرار کا
نقش جما سکیں گے تم کبھی سکہ اعتبار کا
سیر فلک کریگا جب چاند حرا کے غار کا
دل کی طرح ملا ہوا سلسلہ برگ و بار کا
دیگا یہی تو امتحاں ہمت استوار کا
ذات علی ہے آئینہ قدرت کردگار کا
کوثریوں میں دور ہے بادۂ خوشگوار کا
مطرب جاں نواز آ پردہ چھیڑ بہار کا
سبزے کا فرش سا بچھا خیمہ زرنگار کا
بیچ میں اک جڑا ہوا آئینہ جوئبار کا
قصہ زبان موج پہ [illegible] کا
آگ لگی ہوئی ہے ایک نخل نہیں چنار کا
لوٹ سکے جو باغباں [illegible] کا
لوٹتے پھرتے ہیں [illegible]
جو ملا ہر ایک سر دے [illegible]
اب جو ملے عصائے تیغ دستہ بے [illegible] کا

طرزِ عمل بدل لئے نقش نئے نئے مجھے
رنگ کچھ اور ہو گیا صفحۂ روزگار کا

ذرّوں کو جلوۂ مہر کا شہرت عام نے دیا
تنگ نظر ہے گرد وسیع دائرہ اشتہار کا

دیکھ چکے ہیں جو صفی معجزۂ پیمبری
انکی نگہ میں کیا جچے شعبدہ ذو انتظار کا

کور سوادِ امتیاز ایسے بھی ہیں جا بجا کہیں
کرتے ہیں جو مقابلہ جلوۂ نوردِ نار کا

دوست کسے بنائیے محرم راز کون ہے
کس کو سماں دکھائیے سینۂ داغدار کا

آئی خزاں بہار میں سست رنگ سے چمن گیا
سر سبدِ چمن تھا جو گل مری شاخسار کا

اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ کھنچ گیا سخنوری
سہل نہیں سنوارنا طرۂ تابدار کا

خاک میں گو ملا دیا جوشِ سکوت نے مجھے
پھر بھی چراغ راہ ہے نقش مرے مزار کا

خمکدۂ غدیر کا بادہ کش قدیم ہوں
دوش بدوش طور ہے پایہ مرے وقار کا

خانۂ کلفشاں نہیں تیشۂ کوہکن ہے یہ
پست و بلند شعر ہے سلسلہ کوہسار کا

ہو سہی ہے لعلیوں کی بھی عرش تو چھو لئے صفی
ہوگا بلند اور ابھی کیا علم افتخار کا

بچھڑ گئے دابستان فخر طل بہت دیکھئے
سازِ سخن کی جان ہے زمزمہ جھنکار کا

دست دعا اٹھا ہے چشم کرم ہے منتظر
نقش اثر بٹھائیے سکۂ اعتبار کا

جب تک الٰہی ابر میں جلوۂ فردوس ہے بھی
ابر ہے میر کارواں قافلۂ بہار کا

مخلص سبز کار کا مزرع دل ہرا بھرا
خرمن آرزو تباہ خصم سیاہ کار کا

محشر لکھنوی

سید محمد امیر المومنین علی

نہ پوچھ اے ہمنفس ہنس ہنس کے اس کی لذت فانی
بنا رکھا ہو جس کو دل کی بیتابی نے فریادی

متالِ کارزارِ غم سنتے ہیں ہم اچھا ہی ہوتا ہے
مگر تاچند آخر مجمع حسرت کی بربادی

خدا جانے کہ ہو کب شاد مقصود گرفتارہ
خدا معلوم کب ہم کو ہو قید غم سے آزادی

دکھاتا تو ہم ہیں اور جوش تمنا دل کا خون حسرت سے
ابھی یہ آسمانِ پیر سے ہے زورِ جلادی

قدم جب وقت والا ہو عدم کی سمت لشتا ہے
دکھا دی ہے قسمت نے وہ دور سے بجز فولادی

کہا شکستہ جو شبیرِ نا صبور کی گردش کا تھا
کہا شکستہ جنوں غم پہ سرکوبی و فریادی

قدم گھر سے نکلنا چاہئے ہے ورنہ منزل
سوادِ شہر ہو گیا ویرانہ انسانوں کی آبادی

صدا ہے الرحیل اپنے ...
ہمارے کان کو بانگِ جرس ہے نغمۂ شادی

خروش دلربا میں ربخ غربت ...
... قطعی سے پھر کر کیا ہو آزادی

ملال انگیز ہے صبح وطن اہل محبت کو
مزہ ہے غنچہ اجا جو آئے شام بربادی

نقاب ... اٹھائے جبکہ مہر آسمان بیٹھا
گرے ہیں ... ترپکے قید نا بادی

چلوں خونابۂ قلب و جگر سے ...
گروں گا شوق سے پھر منزلِ افسر پر وادی

شکستہ میری ٹھوکر سے ہو سنگِ رہ ناکامی
ہٹا دوں ہو اگر سدِ سکندر کو وہ بربادی

کروں اپنی سی کوشش پھر تو جذبِ دل ہے اور منزل
وہ منزل قید غم سے جس جگہ ہوتی ہے آزادی

وہ منزل نقشِ اول جو نگارستانِ عالم ہے
سراسر جس سے ہے رونق صنعتِ قدرت کی استادی

وہ منزل خلد کہئے جس کو یا عرشِ بریں کہئے
دلِ غمگیں کی خاطر وقف جس کی خوشی شادی

وہ منزل جس جگہ دامان امید آکے پھیلتا ہے
مرادیں دل کی خاطر خواہ بیٹھے لیکے فریادی

وہ منزل مرکز امن و اماں جو دورِ عالم میں
جہاں تیغ ستمگر دور آسماں کا زورِ جلادی

وہ منزل جو زمیں سے آسماں تک نور تا سر
جہاں انساں کے بدلے فرشتوں کی ہے آبادی

وہ منزل مدتوں سے آج تک جس کے تصور میں — بتانِ کعبہ پتھر بن گئے لوٹ کے گیا آدی

تعالی اللہ وہ منزل جس کو ارضِ نجف کہیے — اسیرانِ گنہ کو جس جگہ حاصل ہو آزادی

وہ منزل آستانہ جس کو بابِ علم کا کہیے — کہ جن کا گردنِ جبریل پر ہے حقِ استادی

وہ بابِ علم یعنی شوہرِ بنتِ رسول اللہ — کیا تجویز جس کو خود خدا نے بہرِ دامادی

وہ دامادِ قوی بازو نصیرِ احمدِ مرسل — رکی زورِ ملائک سے نہ جس کی تیغِ فولادی

وہ فولادی حسام برق زا جس کی ضیا باری — ہے اہلِ ضلالت پر گئی تھی رہبرِ ہادی

وہ ہادی کفر کے ظلمات سے جس نے ہزاروں کو — نکالا اور عطا کی مجلسِ دوزخ سے آزادی

وہ آزادی کہ جس سے اب ہیں انکو جنت میں — تصدق انکی ہر اک آرزو پر عشرت و شادی

بنایا کل جن و انس و ملک کا ایک ہادی — نہ ہے تو رد خوشا صنعت گرِ عالم کی استادی

وجودِ ذاتِ حضرت سے ہوا آباد سر تا سر — طلسماتِ جہاں تھا ورنہ اک تصویرِ بربادی

اٹھا دے آپ کا الطاف اگر رسمِ کرم دنیا — ہنوز لطفِ حسینانِ جہاں سے کارِ صیادی

شجاعت آپکی جب یاد آتی ہے غلاموں کو — تو پھرتی ہے نگہ میں خیبر و خندق کی بربادی

دمِ اظہارِ قوت بھی مراعاتِ کرم رکھی — دلِ دشمن نہ توڑا توڑ ڈالا بابِ فولادی

دکھائیں آپ گر کچھ شانہ نورِ امامت کا — تو اکھڑے قلعۂ ارض و سما کی خشتِ بنیادی

مرادِ مہ جو کوئی روک لے پھر بابِ جنت پر — درِ مشکلکشا پر ہو اگر شداد فریادی

یہ پہلی آپکے قدموں کی برکت تھی زمانے میں — کہ اجڑا گھر بتوں کا اور ہوئی کعبے کی آبادی

نجف کی خاک میں مل جائیں تو حاصل ہو جمعی — بگولوں کو اسی دشت میں ہے شوقِ بربادی

جواں دی شحنۂ عدلِ شہِ والا کا ایما ہو — نہ لے مریخ پھر صبحِ ابد تک نامِ جلادی

یداللہی دکھائی آپنے یوں جنگِ خیبر میں — کہ توڑا کفر کے رشتے کیصورت بابِ فولادی

ہوا جب آپ سے عقد شور اٹھا ملائک میں — مبارکباد یا حیدر رسول اللہ کی دامادی

نکالیں داد ستمہائے ظالم سے جو مولا دلِ شکستہ کو — ہلا دے گنبدِ دورِ فلک کو نعرۂ شادی

محیطِ الفتِ مشکلکشا میں غرق ہوتی ہے — ملی یونس کو بطنِ حوت سے زنداں سے آزادی

پکاری شانِ اسلام انکی پیدائش پہ کعبے میں — اسی بچے کے ہاتھوں سے بتوں کی خانہ بربادی

عدالت اس کو کہتے ہیں یہ ہے لطفِ یداللہی — کہ کاٹیں دستِ سارق اور نہ ہو ایذا سے فریادی

طریقِ راستی کردیں جو تعلیم آپ ارشاد سے — فلک سا دشمنِ عالم بھلا دے اپنی کج بیادی

کیا جب تک گیا ارد آپنے اسلام پھیلا کر — وگرنہ پہلے دنیا بھر میں تھی تقلیدِ شدادی

شریکِ کاروانِ لطفِ حضرت ہو گیا آکر — جرس وقتِ سفر بیتاب بن کر ہو نہ فریادی

قدم فرسا کہاں تک وادیِ مدحت میں اے اختر — نہیں زیبا ہے پائے ادب کو اتنی آزادی

بامیدِ دعا سینے میں زباں کے نار کی صورت — مجھے لے شوق دکھلا دو سخن کا طرزِ استادی

مبارک ہو کہ اٹھے پردہ ہائے نامرادی بھی — حذر لو لو کشف کا نام لیکر آپ ہو فریادی

خداوندا مرے شوقِ ولی کی پیچ بیت آگہی — زیارت سے نجف کی پھر مجھے ہو عید و شادی

ہوا میں اڑ کے دل کی خاک پھر چل پھر کر جا — زمیں پھر پھر کہانی دے مجھے جنت کی آبادی

پڑھوں پھر میں قصیدہ مدحِ بابِ علم میں ایسے — صدائیں غیب سے آئیں کہ ہے یہ شانِ استادی

عزیز لکھنوی

سجدۂ نور

ضبط کی جو کوششیں تھیں سب وہ رخصت ہو گئیں — اب نگاہیں مظہرِ نفسِ محبت ہو گئیں !
پھر رہیں شوقِ تماشائی دلِ وارفتہ ہے — پھر نگاہیں سلسلہ جنبانِ وحشت ہو گئیں
اِک نگہ نے پردہ ہائے دل پہ قبضہ کر لیا — مدتوں تک داخلِ جو چیزیں تھیں امانت ہو گئیں
بے اثر جن کو سمجھتے تھے تم اپنی بزم میں — جو بہ بزدل کی وہی باتیں کرامت ہو گئیں
بے حقیقت جانتے تھے ہم جو سامانِ جنوں — پھر فراہم ہو کے یہ شکلیں قیامت ہو گئیں
خوئی گریہ [illegible] ہو گئی مجھ سے جدا وہ — عادتیں جب بڑھ کے [illegible] طبیعت ہو گئیں
جا کے بزمِ حسن میں کچھ لے کے حاصل کر دیئیں — وہ نگاہیں جو سبق آموزِ حیرت ہو گئیں
دیدۂ انجم تماشائی کیوں اب کھلی ہیں — ساری تو ندیں [illegible] نذرِ محبت ہو گئیں
وہ نگاہیں [illegible] جو تھیں کاروبارِ التفات — دل کی [illegible] ایسی [illegible] ہو گئیں
دل جو باتیں ہوتی تھیں تخلیہ میں بیٹھ کر — اب وہ شرحِ دفترِ رازِ محبت ہو گئیں
گوشے میں دل کے نکلی تھیں جو آوازیں عزیز — وہ صدائیں نغمۂ سازِ حقیقت ہو گئیں
میرے دل کا اک شگاف اور کعبہ کی دیوار کا — دونوں دروازے [illegible] باب شہرِ حکمت ہو گئیں
روئے وجہ اللہ میں مخفی جو تھیں درازل — اب وہ تنویریں فروغِ بزمِ صورت ہو گئیں
فاطمہؑ بنتِ اسد کو درد وہ عالم ہوا — آ کے حوریں خلد سے سرگرمِ خدمت ہو گئیں
شمعِ بینائی کی لو جب سے زیادہ بڑھ گئی — رخ کی تنویریں چراغِ بزمِ قدرت ہو گئیں
جس نے دیکھا آنکھ بھر کر نورِ عین اللہ کو — دونوں آنکھیں ساغرِ صہبائے وحدت ہو گئیں
دیکھ کر رخسارِ وجہ اللہ غش آیا مجھے — رخ کی تنویریں دلیلِ ردِ رویت ہو گئیں
جو لکیریں ان کی پیشانی اقدس پر تھیں — اب وہی فرمانِ تبلیغِ رسالت ہو گئیں

خسروِ اسلام نے جب گود میں اپنی لیا — سب ادائیں چہرہ کی جاں بخش سنت ہو گئیں
مسجدِ اسلام ہے اب مسقط الراس علیؑ — جتنی راہیں کعبہ کی تھیں سب وہ جنت ہو گئیں
پھر علی اٹھو نہیں کیوں نہو معبود وہ — رفتہ رفتہ جن کی باتیں تک عبادت ہو گئیں
جتنی بیداری کی تکلیفیں اٹھائیں آپ نے — اب سب ہجرت وہی سب باعثِ راحت ہو گئیں
ابتدائی عمر سے لیں جتنی سانسیں آپ نے — وہ ذخیرہ ہو کے سب نفسِ رسالت ہو گئیں
وہ غذائیں جو لعابِ مصطفےٰ سے پائی تھیں — ہو کے سب جزوِ بدن جزوِ طبیعت ہو گئیں
نفس کا اپنے امین اللہ نے ان کو کیا — فاطمہؑ تو حاملِ بارِ امانت ہو گئیں
شیر ہے بنتِ اسد کا کیوں نہو شیرِ خدا — جتنی بوندیں حلق سے اتریں شجاعت ہو گئیں
مختصر تاریخِ حالِ مصحفِ ناطق ہے یہ — جتنی باتیں آپ سے [illegible] جو ودیعت ہو گئیں
ہے ابھی سے رعشہ بر اندام مہرِ نیمروز — رنگ [illegible] تھیں [illegible] ہو گئیں
کعبے کی یہ نیتیں اسلام کی یہ — اے علیؑ سب تیرے قدموں کی بدولت ہو گئیں

نظم

میر دوست علی خلیل

کوئی ساٹھ برس سے ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے نظم اُردو ادب میں داخل ہوئی ہے اس کی کوئی خاص ہیئت نہیں ہے نہ کوئی مخصوص موضوع ہے۔ مثنوی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس سب میں کہی جاتی ہے اور موضوع کے لحاظ سے ہر طرح کے خیالات و مناظر پیش کیے جاتے ہیں مگر حقیقت میں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اُردو شاعری کے ساتھ اس کا وجود پایا جاتا ہے، قطب قلی شاہ کے دیوان میں بھی اس طرح کی نظمیں موجود ہیں اور ولی کے یہاں بھی، شمالی ہند میں میر و سودا، نظیر اکبرآبادی سب نے نظمیں کہی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اسے ایک مستقل صنف نہیں سمجھتے تھے ہیئت کا لحاظ کرتے تھے مثلاً اگر مثنوی کی طرح کے اشعار میں برسات کی کیفیت نظم کی ہے تو وہ اسے مثنوی کہتے تھے اور اس کا عنوان قائم کرتے تھے "مثنوی در موسم برشکال" اگر مسدس میں ہے تو مسدس در موسم برشکال۔ اب مثنوی یا مسدس کو حذف کر کے صرف موضوع لکھ دینا کافی سمجھا جاتا ہے۔ بہار، برسات۔ جاڑا اور گرمی وغیرہ چاہے وہ ہیئت کے لحاظ سے کسی صنف میں ہو اتنے تغیر سے ایک نئی صنف بن گئی۔

لکھنؤ میں ناسخ و آتش کے زمانے سے (جب سے لکھنؤ شاعری کا دور شروع ہوا) ایسی ایسی نظمیں کہی گئیں جن کا مثل اُردو میں نہیں ہے۔

دور اول کے شعرا میں میر دوست علی خلیل کی ایک غیر مطبوعہ نظم ایک ہم قلمی بیاض سے پیش کرتے ہیں، جس کا موضوع افیم ہے اس کا عنوان خلیل نے طلسم ہوشربا رکھا ہے اس لیے ہم بھی یہی سرخی رکھی ہے۔ پیش کریں گے۔

طلسم ہوشربا

مردمِ چشم حسینانِ جہاں ہے افیون   غیرتِ خالِ رخِ حورِ جناں ہے افیون
طفل بھی مرتے ہیں جس پر وہ جواں ہے افیون   طرفہ معجون عجب روحِ رواں ہے افیون

اس قدر عاشق شیدا ہیں جہاں میں اسکے
یہ وہ لیلیٰ ہے کہ مجنوں ہیں زن و مرد اسکے

اس پری زاد کے القاب کہوں کیا میں بیاں   حاکمِ مملکتِ ہند و حبش کی سلطاں
مستی کوہ سر در آتشِ موسیٰ کا دھواں   مرہمِ زخمِ دلِ عاشقِ بیتاب و تواں

بیشتر بادۂ سرجوش بھی کہتے ہیں اسے
لوگ معشوق سیہ پوش بھی کہتے ہیں اسے

کوئی ساون کی گھٹا کہتا ہے کوئی ظلمات   کوئی لیلیٰ اسے کہتا ہے کوئی وصل کی رات
اس کی تلخی میں بھرا ہے مزۂ قند و نبات   اسی معجون کی تاثیر میں ہے موت و حیات

دل میں ہے کافر و دیندار کے الفت اسکی
سنگِ اسود سے سوا کرتے ہیں عزت اسکی

لیلۃ القدر اسے کہتا ہے کوئی انساں   کوئی کہتا ہے اسے سجدۂ عابد کا نشاں
مشک کہتا ہے کوئی کوئی دوائے خفقاں   کوئی گلدستۂ سوسن کوئی مجلس حزاں

ہے عجب ہوش ربا خلق میں نیرنگ اس کا
سنگِ موسیٰ ہے بدن لال ہے پر رنگ اس کا

یہ وہ ہے قوتِ دل راحتِ جاں نورِ نظر   دیدۂ عاشقِ بیتاب میں ہے اس کا گھر
نہیں چھپتا نہیں چھپتا ہے کبھی اس کا اثر   دیکھ لو دیکھ لو پردہ جو نہ ہو آنکھوں پر

آنکھوں میں اس کی عجب جلوہ گری رہتی ہے
انھیں دو شیشوں میں یہ ایک پری رہتی ہے

ہے تجلی اس کی رسائی کی کمند افکار   واں پہنچتی ہے جہاں وہم کا بھی ہو نہ گزر
برق کی طرح نہیں ایک جگہ اس کو قرار   خلوت خاص کی پابند نہیں یہ خیار

کون سا عضو ہے جس میں نہیں گھر کرتی ہے
روح کی طرح سے رگ رگ میں گزر کرتی ہے

ہاتھ لگ جانے سے ہوتے ہیں جو شاد اس کے مرید   جانتے ہیں اسے شاید وہ ضیائے شب عید
یا سمجھتے ہیں اسے قفل در دل کی کلید   آنکھیں کھل جاتی ہیں تو ہے یہ اس شوخ کی دید

جان کر آب حیات اس کو بشر پیتے ہیں
جو نہیں مرتے ہیں اس پہ وہ عبث جیتے ہیں

اس کی گولی سے پرستاں سے حسیناں آئیں   اس کے غمزے سے تجلی دلبر کم سن کی ادا
ہوش اڑاتی ہے ارسطو کے جو ہو چھلا ذرا   ... پڑھا نہیں گیا
- - - - - -

ایک دم قید سے اس کی جو نہیں چھوٹتے ہیں
بے خودی کے وہی دنیا میں مزے لوٹتے ہیں

کیا پری زاد ہے کیا حور ہے یہ ہوش ربا   دل زاہد میں ہے ایماں کی طرح اس کی جا
کچھ اکیلے نہیں دیندار ہی ہیں اس پہ فدا   اس شب قدر کے کافر بھی ہیں مشتاق لقا

یہ حسیں وہ ہے کہ ہے غافل و ہشیار کی جاں
اس پہ جاتی ہے ہر اک کافر و دیندار کی جاں

اس چھلاوے کے نرالے ہیں جہاں میں انداز   کہیں جادو ہے کہیں سحر کہیں شعبدہ باز
اسی سلطان کے ہیں حسن کے محمود و ایاز   بے خبر رہتے ہیں اس شوخ کے سب محرم راز

نہیں کھلتا ہے کہ بند آنکھوں سے کیا تکتے ہیں
دیدۂ دل سے مگر شان خدا دیکھتے ہیں

جام دل اس کی محبت سے اگر ہو معمور   دائم الخمر رہے بادۂ گلگوں سے نفور

پاک طینت ہے یہ دنیا میں نہ آلودۂ زور   اس کے مشتاق سے ہوتا ہی نہیں فسق و فجور

اس سے کرتے نہیں پرہیز کسی مذہب میں
صورت آب رواں پاک ہے ہر مشرب میں

سانولے رنگ کا جلوہ ہے عجب پر سحر یا   دم پہ پڑھتا ہے شب و روز یہ چشمو نکا
سحر ہے ناز و ادا قہر بلا ہے غمزہ   بد مزاجی بھی ہے اس شوخ کی خوبی ہو گا

شہرہ ہے خوب تہ گنبد افلاک اس کا !
دل سے بھاتا ہے کریموں کو بھی مسالک اس کا

اس کی صورت یہ جو آتا ہے ہر ایک مخفی پی   تیرگی اس کی ہے شاید کہ سواد سطر یار
تجلی اس سے ہے چمن میں خط سوسن کی بہار   دو رماں اس کا ہے شام شب گیسوئے نگار

دل میں جا دیتے ہیں عشاق جگر ریش اسے
کا نکا جانتے ہیں کافر بد کیش اسے

یہ وہ محبوب ہے اس کا ہو اگر کوئی جلال   آدمی زاد میں پیدا ہو فرشتے کے خصال
نہ ہوس کھانے کی رہتی ہے نہ پانی کا خیال   اپنی ہستی کو مٹا دیتے ہیں جو پائے وصال

اس سے صحبت جو تہ گنبد افلاک رہے
جرم عصیاں سے فرشتوں کی طرح پاک رہے

فلسفۂ عشق و محبت سے ہے اس کی تاثیر   نوشدارو ہے کسی کو تو کسی کو شمشیر
ہے کہیں ابر غضب اور کہیں ابر مطیر   سپر تیغ الم قوس اجل کا ہے تیر

نہیں کھلتے ہیں کسی شخص پہ نیرنگ اس کے
گردش چرخ سے ملتے ہیں بہت ڈھنگ اس کے

یہ وہ ہے پیر طریقت کہ جو ہو اس کا مرید   ماسوی اللہ سے اک دم میں وہ ہو جائے بعید
بسکہ رکھتی ہے اسے نفس کشی کی تاکید   کیا عجب ہے جو بنا لیتے ہیں اسے اہل سعید

ستم پیشہ اجل قاطع لذات ہے یہ
واہ کیا صاحب اعجاز و کرامات ہے یہ

نشۂ عشق سے اس شوخ کے جو ہو سرشار
عابد ماہ کے مانند ہیں شب بیدار
اول شام سے تا صبح یہ ہو ان کا شعار
خواب راحت کو نہ آنکھوں میں جگہ دیں زنہار
چشم انجم کی طرح شب کو نہیں سوتے ہیں
اس کے عشاق بھی شاہان خدا ہوتے ہیں

یہ عجب مرشد کامل ہے عجب ہے رہبر
سرکشی کا نہیں کوچے میں کبھی اس کے گزر
اس کے پیرو جو ہیں آفاق میں وہ شام و سحر
سجدۂ حق میں جھکائے ہوئے رکھتے ہیں سر
اپنے دورے میں نہیں سرکشی اس کو بھاتی
جام کے ساتھ صراحی نہیں آنے پاتی

پاک بازی میں یہ پہنچاتی ہے عشاق کا حال
خود سے بھی نہ کسی پاک کا ہو دل میں خیال
قافیے لاکھ پری رو کے کرے غنج و دلال
کھول کر آنکھ بھی دیکھیں نہ کبھی اس کا جمال
خوبرو ناز و ادا سامنے دن رات کریں
خواب میں بھی رغبت کی نہ یہ بات کریں

اس بلا سے کبھی دل کو لگائے نہ بشر
اس کے سایہ کے تصور سے بھی رہے دل میں حذر
اس کا دشمن کے بھی گھر میں نہ الٰہی ہو گزر
زہر دیتی ہے یہ جس شخص پہ کرتی ہے اثر
مار رکھتی ہے محبت میں یہ ناگن کی طرح
دوستوں کا یہ لہو پیتی ہے دشمن کی طرح

اس کی چاہت کی پڑے گردن دل پیچ کمند
ایک مشرب ہو ہم بے خرد و دانش مند
اس کا جلوہ ہے غضب آنکھوں کو کر دیتا ہے بند
ہوش اڑا لیتی ہے یہ نکہت گیسوئے دوچند
کالے پانی کے مقید بھی رہا ہوتے ہیں
قید میں اس کے گرفتار فنا ہوتے ہیں

قہر ہے سحر ہے جادو ہے محبت اس کی
گور جھنکواتی ہے انساں کو فرقت اس کی
ملک الموت زمانے میں ہے چاہت اس کی
داغ لانے کو لگا دیتی ہے محبت اس کی
ایسے محبوب بد انجام سے اللہ بچائے!
اس ستم گار دل آزار سے اللہ بچائے

بد مزاجی کا کرے کیا کوئی اس کے بیاں
زاہد خشک سے بھی ہے سب ہی سب سوا
اس سے پالا کہیں پڑ جائے تو دیکھے رہیا
خاک پانی میں ملا دے جو بنے اس کی ہوا
اثر اس کا جو عیاں گردش افلاک سے ہے
سرد آب منقل کرۂ خاک سے ہے

گرم جوشی جو کرے خواب میں بھی گر سپنا
پیتے اس لب عاشق سے چشم عینا
وعدۂ وصل جو مل جائے تو عاشق ہو چلا
جاں اکیلی بھی نہ چھوڑے جو بڑھے پیاس عذاب
اثر اپنا جو دکھاتی ہے خوش اندازوں کو
پھول گنبد سے کا بنا دیتی ہے گل فاموں کو

اے جمیل اس کی جفا کی شکایت ہے بیجا
کیسے ناداں ہو کیا کہتے ہو سوچو تو ذرا
کوئی معشوق ہے دشمن جو نہیں عاشق کا
چمن حسن میں کھلتی ہی نہیں بوئے وفا
پھول ظاہر میں بھی ہیں باطن میں مگر خار ہیں سب
جتنے معشوق ہیں دنیا میں دل آزار ہیں سب

اسی دور کے شعراء میں قاضی محمد صادق اختر کی نظم ہے سے

قاضی محمد صادق خان اختر

کل رہن کے شیخ مجتہد عصر ساقیا
دکھلا کے سبز باغ ثواب و عقاب کا
کہنے لگا ز راہ تحیر مجھے بہ تنفر
معلوم ہوگا حشر میں ہے بنا شراب کا

میں نے کہا کہ میں بھی ہوں یہ خوب جانتا
پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
لیکن نہ کہیے کہ مجھے مورد عتاب کا

تقوی ہمارے آگے ہو جب آپ کا درست
اور ہو یقین آپ کے اس اجتناب کا

مے اور کنج باغ ہو ساقی ہو ماہوش
کوئی وہاں مخل نہ ہو باعث حجاب کا

گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ
بے ریش جیسے جلوہ ہو مہر خضاب کا

کھینچے ہنسی ہنسی میں وہ منہ کو ملا کے منہ
دے ذائقہ زبان کو دہن کے لعاب کا

منت سے یہ کہے کہ ہمارا لہو پیجئے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا

اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا

اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

دور دوم کے شعراء میں مولوی علی میاں کامل نے کئی نظمیں کہیں جن میں مرزا دوست کی گت بہت مقبول ہوئی۔

مزار دوست

شب کو جا نکلا تھا میں کامل مزار دوست پر
اسی جہت سے مثل ابر آنکھیں مری خونبار ہیں

قبر پر الحمد پڑھ کے دوست سے میں نے کہا
ہم گریباں چاک ماتم میں ترے اے یار ہیں

ڈھونڈھتی ہیں تجھ کو آنکھیں جا بجا شام و سحر
شاہد اس دعوے کے رخ پر آنسوؤں کے تار ہیں

شاد ہے کچھ تو بھی زیر خاک اے نازک بدن
شمع روشن ہے گلوں کے قبر پہ انبار ہیں

کیا ہوا نے کے بعد اے راہی ملک عدم
لوگ کیسے ہیں وہاں کے اور کیا اطوار ہیں

منزلیں نزدیک ہیں یا دور ہیں کیا حال ہے
راہ میں کچھ بستیاں ہیں شہر ہیں بازار ہیں

جس محل میں جا کے تو اترا ہے اے رنگیں ادا
کس طرح کا قصر ہے کیسے در و دیوار ہیں

چھت ہے منقش ہے کہ سادی فرش رنگیں یا سفید
تخت کیسے ہیں منبت یا مرصع کار ہیں

سبز جلتے ہیں کنول یا سرخ روشن ہیں گلاس
باغ ہے سبزہ ہے کچھ اشجار ہیں اثمار ہیں

پھول ہیں کس رنگ کے بنتے ہیں کس انداز کے
مرغ زریں بال ہیں یا عنبریں منقار ہیں

اہل صحبت کون ہیں کیسا گفتگو کا ہے طریق
خوش بیاں خوش طبع یا کج فہم و بدگفتار ہیں

لوگ ہمسایہ ہیں کیا کس قسم کے کس وضع کے
کچھ مروت آنکھ میں ہے خلق کے آثار ہیں

دعوتیں بھیجیں فقط یا آپ بھی آئے کبھی
اپنے اپنے شغل میں بیٹھے ہیں یا بیکار ہیں

بات کرنے کی صدا اصلاً نہیں آتی کبھی
کس طرح کے لوگ ہیں سوتے ہیں یا بیدار ہیں

ملک کیسا ہے ہوائیں سرد چلتی ہیں کہ گرم
نہریں جاری ہیں چمن میں باغ ہیں گلزار ہیں

قافلے چلتے ہیں لٹنے کا تو اندیشہ نہیں
گرد کم اٹھتی ہے راہیں صاف ہیں ہموار ہیں

کچھ حسین ان میں بھی ہیں کچھ بھی نظر آئے کبھی
ان کے قد کیسے ہیں کیسے گیسوئے خمدار ہیں

شکلیں گوری گوری ہیں یا سانولی ہیں صورتیں
ابروئے خم کعبہ کی محراب یا تلوار ہیں

کچھ غرور کی ہیں ادائیں یا بناوٹ کے ہیں ناز
ہیکلیں سینوں پہ یا طوق کمر زنار ہیں

قبر سے آئی ندا اے دوست خاموش رہ
ہم اکیلے ہیں نہ یاں احباب نے اغیار ہیں

باغ کیسا پھول کیسے عقل ہے تیری کہاں
کنج تنہائی ہے اور افعی گلے کا ہار ہیں

وہ ہمارا پیکر نازک جو تجھ کو یاد ہو
آج خاک قبر سے اس پر ستوں کے بار ہیں

دو فرشتے آئے ہیں مدفن میں با شکل مہیب
آہ اور ان کے ہاتھوں میں ہیں گرز آتش بار بھی

شق ہوا ان کا کلیجہ وہ صدائیں قہر کی
چوٹ سے چور ہے سینہ و پہلو میں کیسا ہائے

ٹھہر سے ہم کو بٹھایا ہے اٹھا کر قبر میں
رعب سے ان کے ہمارا دست و پا بیکار ہیں

گالیاں دیتے ہیں لاکھ ہم لیکن نہیں کھلتی زباں
جسم میں رعشہ ہے تیر غم جگر کے پار ہیں

اب زیادہ بات کر سکتے نہیں لے گھر کو جا
دل میں آزردہ نہ ہونا کیا کریں لاچار ہیں

دور سوم کے شعراء میں مولانا علی حیدر نظم طباطبائی نے بڑی کامیاب نظمیں کہی ہیں اور وہ بہت مشہور ہیں انگریزی نظم کا ترجمہ کیا

انہوں نے کیا ہے اور مثنویوں میں نظمیں بھی بہت کہی ہیں جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں اس لئے ہم اس کو ترک کرتے ہیں۔

دور چہارم کے شعراء میں سب ہی نے نظمیں کہی ہیں پہلے چکبست کی نظم سنئے۔

سیر دیرہ دون

نہیں بہار کا پہلے سے ہی ہوا تھا شگون — عجیب خطہ دلکش ہے سیر دیرہ دون
نگاہ شوق نے کیا کہئے کیا سماں دیکھا — نئی زمیں نیا رنگ آسماں دیکھا
سنا جو کرتے تھے وہ باغ پر فضا ہے یہی — اگر بہشت میں جنت تو راستہ ہے یہی
ازل میں تھی جو فضا اس کا یادگار ہے یہ — نشیب کوہ میں گہوارۂ بہار ہے یہ
کیا نہیں ہے غارت بشر کی صنعت نے — یہ سبزہ زار سجایا ہے دست قدرت نے
سپرد ابر ہے انتظام پانی کا — ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا
تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی — جدھر نگاہ اٹھے اس طرف ہری ہریالی
لباس پہنے ہیں کل خشت و سنگ نے سبزہ کا — بجائے خاک کے اڑتا رنگ سبزہ کا
اثر خزاں کا ہو کیا تازگی کے مسکن پر — پہاڑ اس کو چھپائے ہیں اپنے دامن پر
گھنے درخت ہری جھاڑیاں زمیں شاداب — لطیف و سرد ہوا پاک صاف چشمہ آب
کمی کبھی نہیں شادابیوں کے ساماں میں — ٹھہر گئی ہے بہار آ کے اس گلستاں میں
طلسم حسن کا ہے بیچ میں یہ گلدستہ — کھڑے ہیں کوہ و سحر پہلوؤں میں صف بستہ
یہاں جو آکے مسافر قیام کرتے ہیں — یہ سنتری انہیں پہلے سلام کرتے ہیں
جو دور جائیے بستی سے اور ہی ہے سماں — یہ سوچتا ہے پہاڑوں کو دیکھ کر انساں
بشر پہ رعب یہ قدرت کا چھا گیا کیسا — یہ بل زمیں کی تیوری پہ آگیا کیسا!

بلندیوں سے جو ہو مائل نشیب نظر — فریب دیتا ہے ندی کا پیچ و خم اکثر
نگہ کو دودھ سے پانی جو ہے نظر آتا! — سفید ناگ چلا آ رہا ہے بل کھاتا
قریب بیٹھا ہے آخر یہ دور کا عالم — نگاہ دیکھتی ہے پھر سرور کا عالم
فضائے کوہ میں ایسی ہو سہانی ہے — بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے
بس ایک عالم ہو چار سمت طاری ہے — نہ شور و شر ہے نہ دنیا کی آہ و زاری ہے
اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمہ دلگیر — شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر
یہ راگ وہ ہے جو مضراب کا اثر نہیں — یہ صرف کان کے پردوں میں گوشہ گیر نہیں
وہی سنے گا اسے دل گداز ہے جس کا — ہو دل میں سوز تو رگ رگ میں ساز ہے اس کا
یہ راگ مجھ میں سمایا سرور میں ہو کر — ہوس تھی روح کو مل جائے اس میں سے ہو کر
حریم خاص میں قدرت کی باریابی تھی — نگاہ شوق میں اک شان بے حجابی تھی
نشست سنگ پہ تھی سایہ شجر کے تلے — رواں تھا چشمہ آب خنک نظر کے تلے
شریک حال تھی وضع قدیم قدرت کی — عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی
شراب حسن حقیقی سے تھا ہر اک سرشار — شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ مشت غبار
درخت و کوہ ہیں کیا ذات پاک انساں کیا — ظہور کیا نہیں ہوا کیا ہے ابر و باراں کیا
یہ دل کے ٹکڑے ہیں قدرت کے نغمے ہیں — سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں
انھیں سے نغمہ قدرت ہے روح و مستی ہیں — سب ایک ساز کے پردے میں زیر ہستی ہیں
جدا کسی سے بھی ہستی کا اپنی راز نہیں — کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں
ہے جسم خاک نہاں اس کا جسم پانی ہے — جو روح ہم میں ہے ان میں وہی روانی ہے
اسی خیال میں طبع لطیف تھی سرشار — کچھ ایسی بے خبری تھی کہ ہوش تھا اس پہ نثار
دل اپنے رنگ میں بیتاب تھا اس ارماں سے — کہ اس فضا میں ہو آزاد روح زنداں سے

اجل جو آئے تو اس کوہسار کے نیچے
بنے مزار کسی آبشار کے نیچے

مولانا صفی

دریائے گنگا کے کنارے شیعہ کانفرنس کا اجلاس

صبح بنارس

ہے لبِ دریائے گنگ اک بہار آئی ہوئی   کو بکو انوار کی ہر سو چھاؤنی چھائی ہوئی
ہر طبیعت جب کہ منظر سے ہے گھبرائی ہوئی   لب پہ اک موجِ تبسم آتے ہی شرمائی ہوئی

ڈوب کر کیونکر نکلتے ہیں ستارے دیکھ لو
یہ تماشا آؤ گنگا کے کنارے دیکھ لو

روئے گنگا جبر شئی وش کا جو سماں تعبیر ہے   خط قوسی میں سر جدول تھا تحریر ہے
پل ہلال عید گنگا صاف جوئے شیر ہے   یا ستوں کے ابر سے پیوستہ کی تصویر ہے

آسماں تھا فتنہ باری میں جو مشہور جہاں
سرزمینِ حسن نے کھینچی ہے غمزہ کی کماں

ہے حصار عاشقی کی پشتیاں اس پل کی نیو   سینہ تانے یا ہے محراب آ کے کوئی دیو
پیکر کاشی پہ ہے کیا خوشنما زرین جنیو   ہے کہیں سر بر لب گنگا کہیں

سنہری سا نڈر اندین گھاٹ پر کی چوکیاں
آفت جاں دشمن جاں دین میں سب الا

ہے ہلال خط میں آبادی بنارس کی تمام   گھاٹ مندر سب لب دریا کس انتظام
ناؤ پہ چڑھ کر انہیں دیکھو جو نامی ہیں مقام   ماہرولوں کا ملے گا ہر جگہ پہ اژدہام

صدقے اپنی گل زمیں پہ ہو گلستاں کی بہار
آگ پانی میں لگاتی ہے چراغاں کی بہار

چشم بد دور اب بنارس کیا ہی بانکا شہر ہے   ہر ادا بیہوش حسینوں کی یہاں کی قہر ہے
عزت کشمیر ہے یہ انتخاب دہر ہے   ہر گلی کوچے میں جاری حسن کی اک نہر ہے

صاف ہیں شفاف ہیں کیسے یہاں کے بتکدے
رہتے ہیں ہر دم دلہن کی طرح پھولوں سے لدے

وہ دھندلکا صبح کا وہ رنگ گنگا پاٹ کا   وہ کنگورے نمایاں جابجا پانی کی کاٹ
وہ پریزادوں کے جھمگھٹ ہیں سے راج گھاٹ   دل بہل جائے جواں کی طبیعت ہو اچاٹ

اتریں پانی میں ہر دم صبح کا معمول ہے
ہر حسیں نازک بدن گویا کنول کا پھول ہے

دیکھ لو آب رواں میں حسن دلکش کی بہار   صاف سینوں سے جوانی کی ہیں امنگیں آشکار
جال پھیلائے ہوئے پانی پہ زلف تابدار   بال کا باندھا چلا آتا ہے حسین خود شکار

جھوم کے اٹھی جہاں گنگھور متوالی گھٹا!
دیکھنا برسائے گی موتی سی یہ کالی گھٹا

جس کا شیوہ ہے اسی پردہ میں ٹھنڈی گرمیاں   کوندتی ہیں ابر کے اندر ہی اندر بجلیاں
ضو فشاں سورج ہے لیکن ہٹ گیا بولی جہاں   خود کہے گی طاقت نظارہ ہے کیا امتحاں

جامہ زیبی سے دو بالا شان محبوبی ہوئی
سارا پا قوس قزح کے رنگ میں ڈوبی ہوئی

زعفرانی ہے کسی ماتھے پہ ٹیکا صندلی   دل سی نازک تر لئے ہاتھوں میں اک گنگا جلی
لب بہ لب موج تبسم جیسے کھلتی ہو کلی   دل جہاں پھسلا تو بہ سے نکلا یا علی

جب لڑیں باہم نگاہیں کافر و دیندار کی
کان میں آئی صدا یا قوس استغفار کی

ہے غدیر خم کے متوالوں کا گنگا پر جماؤ   محتسب کا زور جن پر ہے نہ قاضی کا دباؤ
دھن یہی کوثر سے کاٹو نہر گنگا میں گراؤ   حشر تک اے نہ ہوش اتنی سوا اتنی پلاؤ

جھوم کے نکلو بنارس میں جدھر بھی سیر کو
چھیڑ کر کلمہ پڑھاؤ ان بتاں دل کو

لکھنؤ کی ایک برسات

گھر کی رہنے والیوں کو زندگانی تھی عذاب
گھر سے جب نکلیں ردائیں اوڑھ کر مثلِ حباب
سر پہ بارش گود میں بچے کمر تک جوئے آب
پاؤں بالائے زمیں و ورد زباں یا بوتراب!

کس قدر پانی کہاں ہے کچھ پتا چلتا نہیں
قسمتوں کا پھیر دیکھو راستہ ملتا نہیں

مولانا صفی نے ایک قومی ترانہ بھی کہا ہے جو بڑا زوردار ہے اس کے بعض اشعار دوسروں کے نام سے مشہور ہیں اس لئے ہم اس نظم کو پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اسلامی ترانہ

زندہ ہیں اگر زندہ دنیا کو ہلا دیں گے
مشرق کا سرا اٹھ کر مغرب سے ملا دیں گے
دھارے میں زمانے کے بجلی کا خزانہ ہیں
بہتے ہوئے پانی میں ہم آگ لگا دیں گے
ہم سینۂ ہستی میں انگارہ میں انگارہ
شعلے بھڑک اٹھیں گے جو ہم اسے ہوا دیں گے
ہم کون ہیں ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں لیکن
وقت آنے دو وقت آنے پھر تم کو بتا دیں گے
دنیا کے سمندر میں ہم جزر بھی ہیں مد بھی
دیکھو جو ہمیں دو کا طوفان اٹھا دیں گے
ایران ہو یا ٹرکی دونوں کو مٹا دیکھیں
کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے
اس دین کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے
گونجیں گی پہاڑوں میں تکبیر کی آوازیں
یہ صور جہاں پھونکا مردوں کو جلا دیں گے
آئے جو نہ اسلامی جوش دلمیں نہ تو ہوگا
یہ نظم صفی پڑھ کر ہم اس کو سنا دیں گے

برسات کی شام!

شوق قدوائی

دن ہے کم دیکھو سرِ مغرب ہے وہ ابر سیاہ !
بن گیا خورشید ہلکے رنگ کے سونے کا طشت
وہ شفق کی سرخ رنگت اور فلک کا مرغزار
کوہ کے دامن میں یا لالے کا تختہ ہے عیاں
جلوہ گر ہے قوسِ قزح پر سورج کے پرتو سے دھنگ
یا کسی کے واسطے کھولے ہے آغوش آسماں
دستکاری اپنی کی معمارِ قدرت نے عیاں

کھل گئی دنیا میں آنے کیلئے کرنوں کی راہ
دھوپ کچھ کچھ پھیلی ہے ہو گئے اشجار زرد
ساونی پھولی ہوئی گویا دکھاتی ہے بہار
یا جسے کہتے ہیں قوسِ قزح اک کوہ ہے آتش فشاں
یا اُڑا ہے وہ کھلی محراب ایوانِ فلک
یا لئے ہے دوش پر ترکِ فلک اپنی کماں
سات رنگوں سے رنگا ہے طاقِ قصرِ آسماں

فوارہ

اے فوارے عجب دلچسپ ہے تیرا سماں
رات دن سانچے میں وہ موتی پہ موتی ڈھالنا
گوہر افشانی تری اور ہلکی ہلکی وہ پھوار
وہ اکڑ کر دیکھنا اپنی جوانی کی بہار
مضطرب موج ہوا ہے تو بہت بیتاب ہے
تو چمن کی روح ہے اور ہے فضا میں تیرا دور
نذر آتے ہیں ترے دامن میں پر پھیلے ہوئے
تیرے دستِ گوہر افشاں کی یہ حالت دیکھ کر
گوندھنا موج ہوا پہ موتیوں کے ہار کا

یہ تری طبعِ رواں اور یہ ترا جوشِ نہاں
پھر شانِ باغِ رضواں پہ وہ ڈورے ڈالنا
وہ شبابِ بلبل و گل اور وہ تیرا نکھار
وہ ترا انگڑائیاں لینا چمن میں بار بار
تیری دھاریں جھومتی ہیں یا کہ نخلِ موم ہے
اک بہار شادمانی ہے ہوا میں تیرا دور
عاشقِ شوریدہ سر بیٹھے ہیں کھوئے ہوئے
جھولیاں گلشن نے پھیلا دیں سخاوت دیکھ کر
تیرے سر سہرا رہا ہے رونقِ گلزار کا

تیز ہو ہاں تیرے فوارے ذرا پھر تیز ہو　　　پھر جواہر خیز و گوہر بیز و گوہر ریز ہو
آتشِ گل کا جہاں کچھ بھی اشارا ہو گیا　　　اڑ گیا موجِ ہوا پر یوں کہ پارا ہو گیا
تیرا جو قطرہ گیا گردوں پہ تارا ہو گیا　　　جب گرا آ کر زمیں پر دل ہمارا ہو گیا
سب غبارِ خاطرِ ناشاد تجھ سے دھل گیا　　　تیرا منظر اک طلسمِ دلفریبی ہو گیا

مرزا جعفر علی خاں اثر کی ایک نظم کشمیر پر ہے جس کا یہ ایک شعر مجھے یاد ہے۔ پوری نظم مل نہ سکی اس لئے ایک ہی شعر پر اکتفا کیجئے ؎

اڑتا ہوا غول تتلیوں کا　　　یا قوسِ قزح سے رنگ برسا

آخر میں جوش صاحب کی نظم برکھا رُت ملاحظہ کیجئے دنیا کی کسی زبان میں اس کا جواب نہیں جن ملکوں میں بارش نہیں ہوتی ان سے تو اس کی توقع ہی بیکار ہے ہاں برصغیر برسات کی جولانگاہ خاص طور پر یوپی بہار بحر عرب اور خلیج بنگال دونوں اُمڈ اُمڈ کے برستے ہیں اور ساری زمین ہری ہو جاتی ہے وہیں برسات پر نظموں کی امید کی جا سکتی ہے اور وہی سرزمین علم و فضل اور شعر و سخن کی سرزمین ہے مگر تعجب ہے کہ ہندی اور سنسکرت میں بھی ایسی کوئی نظم نہیں معلوم ہوتی جس کو جوش صاحب کی نظم کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا۔

فارسی کے شعراء جو ہندوستان آئے انھوں نے برسات پر نظمیں کہی ہیں مگر جوش کا سا خروش کہاں اردو میں آزاد و حالی کی برکھا رت نے تو شاعری کا منھ چڑھایا ہے بعض بے عقل اور شعر ناشناس جوش صاحب کو الفاظ کا بازی گر کہتے ہیں جی تو یہی چاہتا ہے کہ پہلے اس پر بحث کی جائے کہ الفاظ بازی گر کے کیا معنی ہیں اور جوش کی شاعری پر یہ قول منطبق ہوتا ہے یا نہیں بہر حال اب جوش صاحب کی نظم سنئے افسوس کہ اس نظم پر جوش صاحب نے نظر ثانی کر کے کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ میں نے کئی دفعہ وہ نظم مانگی مگر وہ تو شاہی مزاج رکھتے ہیں۔ مختصر یہ وہ نظر ثانی شدہ نظم نہ بھیج سکے اس لئے وہ نظم پیش کرتا ہوں۔

آ ہا آ ہا برکھا آئی

بدلی آئی بدلی آئی !!　　　بدلی آئی بدلی چھائی
بدلی چھائی اور لہرائی　　　جھر جھر برسی گھڑ گھڑ گائی

آ ہا آ ہا برکھا آئی

میلے ریلے تال کنارے　　　بوڑھے بچے لت پت سارے
دھوم دھڑکا ندیا نالے　　　چڑھتے دریا بڑھتے دھارے

گرتی بوندیں چھٹتی کائی

بادل کالے نیلے دھانی　　　ساری دھرتی ہے جل تھل پانی
پانی پانی پانی پانی !　　　گلیاں کوچے کھیت اور گھاٹی

آ ہا آ ہا برکھا آئی

پانی آیا جھم جھم جھم جھم !　　　کالے جھنڈے نیلے پرچم
پریاں اتریں چھم چھم چھم چھم　　　چھم چھم بولی بالم بالم

پانی کا اک شاہ گدائی

اڑتے مڑتے بوجھل گالے　　　اودے اودے کالے کالے
ہا ہا کرتے ندی نالے　　　تڑ تڑ تڑ تڑ تڑ سب نالے

سن سن سن سن سن پروائی

پتے چھوٹے بن لہرائے　　　پربت بولے پنچھی گائے

مچلے بادل ناچے سائے   راتیں ڈوبیں دن گھبلائے

نالے بھر کے ندی گائی

کریں لچکیں شوخی دمکی   مدرا چھلکی بوتل جھنکی

طبلہ ٹھنکا چھاتی تمکی   ادھو ادھو بجلی چمکی

جیسے صندل کی انگڑائی

دل میں پھوٹی ٹے کی کوپل   ندی نالے سارے جل تھل

گھونگٹے جیسے جھل جھل   تان اڑاتی جنگل جنگل

کانٹے پھو نرتے کی پھوٹائی

پھر نے نکلی گھر سے چھوری   گال اچھوتے باہیں گوری

آنکھیں مٹکتیں چوسی چوری   آگے آگے الھڑ گوری

پیچھے پیچھے چپا تم دائی

بیٹھا کیوں ہے سر کھجلاتا !   اٹھ اور سر پہ لیکر چھاتا

تان اڑاتا بین بجاتا   ہنستا گاتا شور مچاتا

مدرا پیئے چل لے بھائی

سینہ ابھارے ندی ندی   بازو کھولے نیچی نیچی

دور تلک ہے پانی پانی   در در آئی جمنا دیوی

گھر گھر پہنچی گنگا مائی

پانی مرتا دیواروں میں   گھٹنوں گھٹنوں بازاروں میں

گھٹتا چکراتا غاروں میں   اور منہ کے اڑتے تاروں میں

لیا ڈگی پاتا پائی

جوبن ابھرا ہر جیون میں   ساون گونجا سب کے تن میں

رادھا ناچیں الھڑ پن میں !   مدرا چھلکی گوکل بن میں !!

شیام نے کیسی بین بجائی

طبلہ سارنگی اکتارا   نوبت بین نقارا !

ڈھولک ڈفلی جھانجھ مجیرا   کوئل دادر مور پپیہا

دائرہ پہ طبلے شہنائی

سن کر اپنے پی کی آون   بولی بدھی لادے ماں

مہندی پیسی ذن ذن ذن   چوڑیاں بولیں کھن کھن

انتی کا پی لو گھرائی

سر کی لہریں لے کے دھالے   گوری دھری لاج کے مالے

توڑا جیسے ٹوٹیں تالے   سارے گاما گا ماسارے

پائل جھنکی مستی چھائی

مدرا پی کر گانا گایا   من میں کالا بادل چھایا

ہلکا ہلکا مرجھایا   سایہ دیپک دیپک آیا

تا لو دھمکا دھن چکرائی

جلدی سکھیو لاؤ جھومر   ہلکی چھاگل بھاری چادر

دوڑو آیا پانی سر پہ   لے دیکھو وہ ڈولی تیکر

بیت نگر سے آیا نائی

چھلکیں من میں لے کی دھاریں   اڑی ترچھی آئیں پھواریں

ناچیں چھم چھم گوری ناریں   تار بکالے اتریں اتریں

دھرتی جھیلی رت بولائی

شر شر پانی ہوں ہوں جھکڑ   چھپر ٹپ ٹپ نالے دھڑ دھڑ

بدلی گھم گھم بجلی کڑ کڑ   جھم جھم جھم تڑ دڑ تڑ دڑ

دھرتی بولی رام دہائی

ہجو

مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ ناسخ نے ہجو کی جڑ کاٹ دی اور ان کے تمام مصنفین نے اپنی کتابوں میں یہی لکھا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔

مولانا آزاد سے یہ غلطی اس وجہ سے ہوئی کہ ان کی نظر میں ضاحک و سودا کی ہجویں تھیں جن میں بھڑوے اور دھی۔کے۔۔۔ ۔۔۔تک موجود ہے۔

اسی طرح کی مصحفی و انشا کی ہجویں ہیں لکھنؤ کی تہذیب اس کو برداشت نہیں کر سکتی وہاں کی ہجو میں شاعرانہ لطافت کے ساتھ تہذیب و شائستگی ہے۔

لکھنؤ میں ہجو میر ضمیر سے شروع ہوئی وہ توہین ربیع الاول عمر و سودا کی ہجو پڑھتے اور اس کا نام انھوں نے مرثیہ رکھا۔

افسوس ہے کہ وہ ہجویں مجھے نہیں ملیں۔

ناسخ و آتش کے زمانہ میں بھی ہجو کہی گئی امام بخش ناسخ نے اپنے نام کی مناسبت ایک غزل میں یہ مقطع کہا ؎

جو خاص ہیں وہ شریک گروہ عام نہیں!

شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں!!

آتش نے وہیں اس کا جواب کہا ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں!
ہمارے گنجفہ میں بازی غلام نہیں!

ناسخ کے شاگرد و خواجہ وزیر نے اس کے جواب میں کہا ؎

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

یہ ایک سلسلہ ہے جو اب تک چلا آرہا ہے ہمارے زمانہ میں خوب خوب ہجو بن گئیں ان کا لطف زیادہ ہو جاتا اگر ان اشخاص کے نام لکھدیئے جاتے جن کی ہجو کی گئی مگر یہ بات بہت سے افراد کو ناگوار ہوتی اس لیئے بغیر کسی کا نام بتائے ہوئے ہجو سنیئے اور خود ان اشخاص پر منطبق کیجئے یہ نظمیں شیعہ کانفرنس سے ارکان سے متعلق ہیں۔

مقبول حسین ظریف

دفتر قومی پریشاں ہو تو اسکی قدر کیا — ہے جو فاضل البین نتھی افراد قوم
اس جگہ ہر مداوا جمع ہیں قومی طبیب — جو فقط لیمو لگا کر ہیں کھجاتے داد قوم
قوم کا ہیرو بیا بھی ہے نمائش گاہ میں — باٹ اس کا ہے لتفریح دل ناشاد قوم
سر پہ دستار فضیلت و مائنس ڈاس کاٹ بو — نیچے جنٹلمین اوپر صورت زہاد قوم

دین کا دلال آدھا اہلِ دنیا کا ایجنٹ — مولوی بھی ماسٹر بھی واہ اے استادِ قوم

کعبہ کالج کی جانب توڑ کر اپنی نکیل — بلبلاتا آ رہا ہے اشترِ بغداد قوم

ایک قومی تیندوا بھی اس کو سمجھے ہیں بند — جس کا رمنہ ترائی مربع آباد قوم

قومی اک بھالو علی بابا جسے کہتے ہیں لوگ — وہ گرو چالیس قزاقوں کا اور استادِ قوم

قومی اک بندر بھی اس نندہ عجائب گھر میں ہے — جو کہ ناداں دوست ہے کرتا ہے گو امدادِ قوم

ہے اسی جلسہ میں قومی ایک خرگوش سفید — گھونس بن کر کھودتا رہتا ہے جو بنیادِ قوم

ابنائے وطن

سپوتو! مادرِ ہندوستان کے واہ کیا کہنا
نہ وضع خاندانی ہے نہ مذہب ہے نہ ملت ہے
سیہ چہرے پہ ہیٹ یا کہ گوبر پہ گلِ رمتا
فقط اغیار کی تقلید میں اب تو یہ صورت ہے
تمازت سے سیاہی اور چہرے کی نہ بڑھ جائے
کہیں کالے نہ کہلائیں فقط اس کی حفاظت ہے
یہاں تک رفتہ رفتہ بڑھ گیا ہے خبط فیشن کا
نہ ڈاڑھی کی بزرگی ہے نہ کچھ مونچھوں کی عظمت ہے
جو اک ٹیکا لگائے مونچھ کا ہیں ناک کے نیچے
مرید حضرتِ ہیوٹ ہیں فیشن سے عقیدت ہے

البعیر

ناقۂ لیلیٰ کے بچے اے بعیرِ ذی وقار — قوم تیرے استبداد کی دم پر نثار

تیرے چہرے سے نمایاں ہے شرارت کی شبیہ — خود بنائی جس کا شکوہ سرکشی جس کا شعار

تیری آنکھیں ہیں بھری عیاری سے گویا دو حباب — کان جن میں کلمۂ حق کی صدائیں ناگوار

جیسا ہے زیادہ تیرے تو سمجھ کی گرفت — پنجۂ سست قضا کے مثل وقت گیر و دار

تیری تقدیریں ہیں موذی ہے بڑھ کر ستمگر — ناک میں تیری کھلاتے کو شریعت کی مہار

گیا دوستی جھاڑتا ہے مظلوموں کو لاد کر — فطرتاً سرکش ہے تو لیکن بظاہر بردبار

اپنی گردن پیٹھ پر لادے ہوئے قومی حقوق — کتنے اطمینان سے چلتا ہے تو مستانہ وار

زینتِ گردن تری کل قوم کی لعنت کا طوق — اس سے ظاہر ہے کہ تو نے کھو دیا اب اعتبار

دیکھنے میں کس قدر سیدھا ہے تو اے زرد داد — کج روی سیکھا ہے تجھ سے اہلِ لیل و نہار

قوم کو باہم لڑا میں تیری ذات فرد — میرے قومی اونٹ اے جنگِ جمل کی یادگار

بیٹھ تیرا قوم کی گاڑھی کمائی کے لئے — وقف ہے کھا کر نہیں لیتا کبھی تو اک ڈکار

تو جو امروہہ کا کاٹا بے تکلف چر گیا — قہر معدہ میں چھپاتے ہے وہی انجام کار

بلبلاتا ہے شتر خانے میں بیٹھا کیا تھا — گرد تیرے جمع ہیں سو ساربانِ غمگسار

کوئی آیا ہے سہارنپور سے لیکر دوا — تیل ریڑی کا پلانے منہ کے اندر ڈال کے

اور کوئی خاکِ شفا تجھ کو چٹانے کے لئے — چپکے چپکے پڑھ رہا ہے کچھ دعائیں [illegible]

کوئی حاجی نیم کی ٹہنی ہلا کر دور سے — کہہ رہا ہے لے ابھی جا ذکر کر اے بد شعار

اور کوئی سنبھل سے آیا ہے گھبرایا ہوا — حال وزیر اپنا مدوا [illegible] کرنے نثار

کوئی کہتا ہے کہ اس کو بھر کر [illegible] — عید قرباں کو خبیث آباد میں بیجا کے یار